تاریخ دیوبند

دیوبند اور دارالعلوم کے حالات

سید محبوب رضوی

شائع کردہ: علمی مرکز دیوبند (یوپی)

طباعت وترجمہ کے جملہ حقوق بحقِ علمی مرکز دیوبند محفوظ ہیں!

طبع دوم ——— سنہ ۱۹۷۲ء / ۱۳۹۲ھ

تعداد طبع ——— ۱۰۰۰

مطبوعہ ——— آزاد پریس دیوبند

قیمت مجلد ———

ناشر

علمی مرکز دیوبند

(یو، پی)

ہے

دلِ

روشن

مثالِ

دیوبند (اکبرآلہ آبادی)

دیوبند کے تاریخی، عمرانی، تمدّنی، سیاسی اور معاشی حالات
قدامت، وجہ تسمیہ اور مسلمانوں کی آبادکاری کی تفصیلات

گزشتہ ایک صدی میں مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی کارنامہ
اسلامی علوم و فنون کی عظیم درس گاہ دارالعلوم دیوبند
کی علمی تاریخ، دینی رہ نمائی اور اکابر علمائے کرام کے حالات!

فہرست مضامین

تاریخ دیوبند اخبارات ورسائل کے آئینہ میں	۸
تعارف	۱۵
پیش لفظ	۱۷
مقدمہ	۱۹
قدامت	۳۰
وجہ تسمیہ	۳۷
محل وقوع	۴۳
آبادی کا طرز	۴۹
آب وہوا اور موسم	۵۰
پیداوار	۵۲
مردم شماری	۵۳
مسلمانوں کی آبادکاری	۵۴
قاضی دانیال قطری	۶۲
شیخ علاء الدین سہروردی	۶۶
شیخ شہاب الدین موسوم بشاہ ولایت	۶۹
شیخ معزالاسلام صدیقی	۷۰
قالو قلندر	۷۰
شیخ ابوالوفاء عثمانی	۷۱
حسن خاں	۸۶
شیخ جیا، صاحبِ خانقاہ	۸۹
مولانا فضل اللہ خطیب	۸۹
شیخ احمد دیبنی	۹۲
سید محمد ابراہیم	۹۴
شاہ رمزالدین	۱۱۷
سید غلام رسول	۱۱۸
مولانا محمد قاسم	۱۲۰
مولانا سید محمد انور شاہ	۱۳۵
مختلف بزرگ	۱۳۸
نظام حکومت	۱۴۵

میونسپلٹی	۱۶۴	پبلک لائبریری	۲۵۹
دیوبند پر قزاقانہ حملے۔	۱۶۵	ثمرۃ التربیت لائبریری	۲۵۹
		مدنی دارالمطالعہ	۲۶۳
غدر کے بعد سزائیں	۱۸۵	سجّاد لائبریری	۲۶۳
سید احمد شہید کے دیوبندی رفقاء	۱۸۷	دعوت الفکر لائبریری	۲۶۳
		تعلیمی ادارے	۲۶۴
سید احمد شہید	۱۸۸	تحصیلی اسکول	۲۶۹
ریشمی خطوط کی تحریک	۲۲۲	انٹر کالج	۲۷۰
دیوبند ایک ادیب کی نظر میں	۲۴۳	اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول	۲۷۱
شب برات کی لڑائی	۲۴۵	گورنمنٹ گرل ہائی اسکول	۲۷۱
معاشی حالت	۲۴۷	سنسکرت مہاودّیالیہ	۲۷۱
صنعت و حرفت اور تجارت	۲۴۸	مدرسہ اصغریہ	۲۷۲
اخبار و رسائل	۲۵۲	جامعۂ دینیات اردو	۲۷۳
کتب خانے	۲۵۳	تعلیم گاہ نسواں	۲۷۵
پریس	۲۵۷	مدرسۃ البنات	۲۷۷
لائبریریاں	۲۵۹	قدیم عمارتیں	۲۷۹
انوریہ لائبریری	۲۵۹	دیوان	۲۸۱

مالیوں کی سرائے	۲۸۲	مصارف کے حل کا ایک کامیاب تجربہ	۳۳۰
سرائے پیرزادگان	۲۸۳		
کوٹلہ	۲۸۴	دارالعلوم کا اعتمادِ خداوندی	۳۳۵
قلعہ	۲۸۴		
خانقاہ	۲۸۵	دارالعلوم کے ہندو معاونین	۳۴۸
دو قدیم مکان	۲۸۶		
دیوی کنڈ	۲۸۸	اہل دیوبند کی طلبار نوازی	۳۵۵
بیاس مصرّ کا مندر	۲۸۹		
تاریخی مساجد	۲۹۰	دارالعلوم کی مقبولیت اور ترقی	۳۶۰
مسجد چھتہ	۲۹۰		
مسجد قاضی	۲۹۱	مدرسہ سے دارالعلوم	۳۶۲
مسجد قلعہ	۲۹۱	فضلائے دارالعلوم کی تعداد	۳۶۹
آدینی مسجد	۲۹۴		
مسجد خانقاہ	۲۹۵	سوسالہ آمد وصرف	۳۷۳
مسجد سرائے پیرزادگان	۲۹۶	دارالعلوم کی عمارتیں	۳۷۴
مسجد عالم گیری	۲۹۷	نودرے کی تعمیر	۳۷۷
جامع مسجد	۲۹۷	مسجد دارالعلوم	۳۸۰
دارالعلوم دیوبند	۳۰۱	دارالحدیث	۳۸۲
تاسیس وقیام	۳۱۹	دارالتفسیر	۳۸۵

دارجدید	۳۸۶	مولانا سید احمد دہلوی	۴۵۱
باب الظاہر	۳۸۷	شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی	۴۵۲
دارالقرآن	۳۸۸		
کتب خانہ	۳۸۸	مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری	۴۶۰
جامعۂ طبیہ	۳۹۱		
مہمان خانہ	۳۹۱	مولانا سید حسین احمد مدنی	۴۶۸
فضلائے دارالعلوم کی علمی خدمات	۳۹۱	مولانا سید فخر الدین احمد	۴۷۳
		ارباب اہتمام	۴۷۷
اساتذہ وطلباء کی معاشرتی زندگی	۳۹۵	حاجی سید محمد عابد دیوبندی	۴۷۷
		مولانا رفیع الدین دیوبندی	۴۸۲
مشہور علمائے کرام	۴۰۹	حاجی سید فضل حق دیوبندی	۴۸۳
دارالعلوم کا عالم اسلامی سے رابطہ	۴۱۳	مولانا محمد منیر نانوتوی	۴۸۴
دارالعلوم کا سیاسی موقف	۴۲۴	مولانا حافظ محمد احمد	۴۸۶
		مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی	۴۹۲
نصاب تعلیم	۴۳۳		
اردو کی اشاعت وترویج	۴۳۸	مولانا قاری محمد طیب	۴۹۶
صدر مدرسین	۴۴۲	مولانا شبیر احمد عثمانی	۵۰۱
مولانا محمد یعقوب نانوتوی	۴۴۴	ماخذ	۵۰۵

اخبارات ورسائل کے آئینہ میں

تاریخ دیوبند کے پہلے ایڈیشن پر اخبارات ورسائل نے جو نقد وتبصرے شائع کئے تھے، اُن میں سے چند تبصروں کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ دیوبند جو ہزاروں علماء اور سیکڑوں اہل قلم کا مولد ومنشاء ہے، جہاں کے فیض یافتگان کی ہزاروں تصانیف ہندو بیرون ہند میں عام مقبولیت حاصل کئے ہوئے ہیں، خود اپنے حالات اور اپنی تاریخ کے تعارف سے آج تک ناآشنا رہا ہے، بقول کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ خداوند عالم نے یہ سعادت جناب محترم مولوی سیّد محبوب رضوی صاحب کا مخصوص حصہ قرار دی تھی، چنانچہ آپ نے تاریخ دیوبند تحریر فرماکر اس فرض کو انجام دیا اور دارالعلوم دیوبند کے ہزاروں فرزندانِ علم کو اس فرض سے سبکدوش کردیا ہے جو اخلاقی نقطۂ نظر سے ان کے ذمہ واجب الادا تھا۔

یہ کتاب دیوبند اور دارالعلوم دیوبند کے حالات کا بہترین مجموعہ ہے

پہلے حصّے میں جغرافیائی حالات، قدیم عمارتوں، مساجد اور مشہور خانوادوں تعلیمی اداروں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرے حصّے میں دارالعلوم کے حالات، موجودہ نظام، طریق تعلیم دارالعلوم کے مختلف شعبوں اور صدر المدرسین اور مہتممین کا سیر حاصل تذکرہ ہے۔ ہر ایک بیان پوری تحقیق و تفتیش سے مؤرخانہ انداز میں قلم بند کیا گیا ہے، اور خوبی یہ ہے کہ اختصار کے ساتھ ادب و انشا کی نزاکتیں بھی تحریر کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں سمو دی گئی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ دیوبند اور دارالعلوم سے تعلق رکھنے والا ہر ایک علم دوست اس کے مطالعہ سے محظوظ ہوگا، اور اس کو ان کتابوں کی فہرست میں شامل کریگا جن کا محفوظ رکھنا وہ اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے"۔

(روزنامہ الجمعیۃ دہلی ۔ ۳۰ مارچ ۱۹۵۳ء)

"دیوبند کو جہاں یہ شرف حاصل ہے کہ اس سرزمین پر دنیا کی عظیم الشان اور بے مثال درسگاہ قائم ہوئی، وہاں اس سرزمین کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ یہ دنیا کی قدیم ترین آبادیوں میں شمار کی جاتی ہے، افسوس کا مقام تھا کہ ایسی مشہور اور تاریخی بستی کے حالات اب تک ترتیب و تدوین کی منزلوں سے نہیں گذر سکے تھے۔

مولانا سید محبوب صاحب رضوی قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے کئی سال کی محنت اور عرق ریزیوں کے بعد دیوبند کی مبسوط تاریخ مرتب

کردی ہے۔ کتاب کا محققانہ اور شگفتہ اندازِ بیان بجائے خود اسے گلدستۂ سرسبد سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

اس کتاب میں دیوبند کی قدیم آبادی، مشہور علماء و مشائخ کے تذکرے کے علاوہ دارالعلوم کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے۔ دارالعلوم کے تعلیمی نظام اور مسلمانوں کے اس سوادِ اعظم کے اس سب سے بڑے محاذ کی اہمیت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

تاریخِ دیوبند کا نام ہی بجائے خود اس کتاب کے پڑھنے کی سفارش ہے۔"

(روزنامہ جمہوریت بمبئی ۔ ۱۴ اپریل ۱۹۵۳ء)

دیوبند ایک چھوٹی سی بستی ہونے کے باوجود ایشیا کی مشہور ترین بستی ہے، یہاں کی بعض مقدس ہستیوں نے ملکی سیاست میں نمایاں کارنامے انجام دئے ہیں، یہاں کے علماء کا وسیع علم و فضل اور دینی فیضان اس کی شہرت کا باعث ہے، دارالعلوم جیسی عظیم الشان درسگاہ نے اس کی شہرت کو دوام عطا کر دیا ہے۔

ضرورت تھی کہ اس تاریخی بستی اور اس عظیم درسگاہ کی مفصل تاریخ مرتب کی جاتی، دیوبند کے ممتاز صاحب قلم جناب سید محبوب رضوی صاحب نے بڑی محنت و کاوش سے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

مؤلف نے کافی تگ و دو سے معلومات فراہم کی ہیں، چونکہ آپ عرصے سے

دارالعلوم میں ذمہ دارانہ مناصب پر کام کر رہے ہیں اس لئے دارالعلوم کی انتظامی تفصیلات کے باب میں آپ کی تحریر زیادہ قابل اعتماد سمجھی جا سکتی ہے، مؤلف نے دارالعلوم سے متعلق تقریباً ساری تفصیلات درجِ کتاب کر دی ہیں۔ جب ہم اس ہمت آزما کاوش و جستجو کو دیکھتے ہیں جو تاریخی حقائق کے لئے موصوف برابر کئے جا رہے ہیں تو بے اختیار دل سے نکلتا ہے:

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

(ماہنامہ تجلی دیوبند، اپریل ۱۹۵۳ء و مارچ ۱۹۵۴ء)

"ازہر الہند دارالعلوم کے وجود سے یہ بستی پوری دنیا میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ ضرورت تھی کہ اس خطۂ پاک کی جو گوناگوں خصوصیات کی مالک ہے کوئی مستند اور قابل اعتماد تاریخ لکھی جاتی، ہمارے دوست سید محبوب رضوی نے اس کمی کو محسوس کیا اور موضوع کی اہمیت کے قدرتی تقاضے پر یہ کتاب کافی محنت کے بعد ملک کے سامنے پیش کی ہے۔ جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو تاریخ کے حوالوں سے مزین کیا ہے، دیوبند کی سیکڑوں سالہ زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دارالعلوم جس کی تاریخ آج تک منظر عام پر نہیں آسکی اس کا ذکر کافی تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں موجود ہے، ضمنی طور پر بہت سی بحثیں کتاب میں آگئی ہیں جن سے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے، ضمناً ان بحثوں

کے سامنے آجانے سے مصنف نہ اپنے موضوع سے دور ہوئے اور نہ کہیں بے ربطی پیدا ہوئی ہے۔ یہ مصنف کی اپنے فن پر قابو یافتہ ہونے کی ایک واضح مثال ہے۔"

(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، مئی ۱۹۵۳ء)

"صوبۂ متحدہ کے مغربی اضلاع میں دیوبند نہایت قدیم قصبہ اور اسلامی آبادی ہے، یہاں بہت سے آثار قدیمہ اور مسلمانوں کے پرانے خاندان آباد ہیں، اور اس کی نئی تاریخ میں دارالعلوم نے تو اس کی شہرت کو عالمگیر بنا دیا ہے، تاریخ دیوبند میں دیوبند کی تاریخ، اس کے آثار قدیمہ اور دارالعلوم کی سرگذشت تحریر کی گئی ہے جس سے اس کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے اور اس کے جملہ علمی و تعلیمی اور انتظامی حالات معلوم ہوجاتے ہیں، انداز تحریر نہایت شگفتہ اور دلچسپ ہے۔"

(ماہنامہ معارف اعظم گڈھ، جون ۱۹۵۳ء)

"دیوبند کی تاریخ انقلاب چرخ دوراں کی تاریخ ہے، دیوبند ادبی، علمی، مذہبی اور تاریخی روایات کے لحاظ سے دنیا کے ان ممتاز ترین مقامات میں سے ہے جو قوموں کی تاریخ میں انقلاب آفریں سمجھے جاتے ہیں۔

اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلے حصے میں دیوبند کی قدامت اور مختلف زبانوں میں اس کی دینی و روحانی خدمات وغیرہ کے

متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں، دیوبند کا طبعی و سیاسی جغرافیہ بھی دیا گیا ہے۔

دوسرے حصے میں دارالعلوم کے احوال و کوائف شامل ہیں، دارالعلوم نے اپنی عظمت کے ایسے منارے تعمیر کئے ہیں جن سے دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں اس کی روشنی پہنچ رہی ہے، دارالعلوم ایک ایسا باغ ہے جس کی خوشبو سے چاروں انگ عالم مہک رہا ہے۔

غرض کتاب کیا ہے دیوبند کے متعلق ایک چھوٹا سا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ رضوی صاحب نے بڑی کد و کاوش اور تحقیق و تدقیق کے بعد دیوبند کے نقوش اجاگر کئے ہیں۔ انہوں نے جو انداز نگارش اختیار کیا ہے وہ تاریخ نویسی کے لئے انتہائی موزوں ہے۔

اس تصنیف کی دشوار گذار وادی سے فاضل مرتب جس حسن و خوبی سے گزرے ہیں اس کے پیش نظر وہ قابلِ مبارک باد ہیں"

(مدینہ بجنور، ۵ر جولائی ۱۹۵۳ء)

"سید محبوب رضوی صاحب نے جن کو کسی موضوع سے متعلق مواد فراہم کرنے اور اس کو خوش اسلوبی کے ساتھ شستہ و شگفتہ زبان میں مرتب کرنے کا بڑا اچھا سلیقہ ہے، بڑی محنت و جستجو کے بعد یہ کتاب لکھ کر پیش کی ہے، اس میں دیوبند کا جغرافیہ، قدیم سیاسی تاریخ، اس کے شہری اور سماجی حالات اور وجہ تسمیہ وغیرہ پر گفتگو کرنے کے بعد دارالعلوم کے

حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ لائق مؤلف کی یہ کوشش لائق تحسین و آفریں ہے، اور یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسلامی ہند کی تاریخ کا ہر طالب علم اس کا مطالعہ کرے۔

(ماہنامہ برہان دہلی، اگست ۱۹۵۳ء)

"دیوبند اور دارالعلوم کے موضوع پر یہ پہلی تالیف ہے، مسلمانوں کی آمد کے اثرات، وہاں کے مسلمانوں کی اقتصادی اور دینی حالت قدیم عمارتوں، مساجد و مدارس اور دارالعلوم کی تاریخ اور اس کی تدریجی ترقیوں سے متعلق بہت سی ضروری معلومات کی جامع ہے، اُن اکابر کے حالات بھی کتاب میں درج ہیں جو دارالعلوم کے اہم تدریسی اور انتظامی عہدوں پر فائز رہے ہیں۔"

(صدق جدید لکھنؤ، ۳۰ر اکتوبر ۱۹۵۳ء)

ہمارے دوست سید محبوب صاحب رضوی نے جس کاوش عرق ریزی اور ژرف نگاہی سے کام لے کر دیوبند کے موضوع کو اپنایا ہے وہ اُنہی کا حصہ ہے، موصوف نے دنیائے اسلام کے مشہور علمی مرکز دارالعلوم دیوبند پر وقتاً فوقتاً جو مضامین لکھے ہیں وہ ادب و انشاء کی دل فریبی کے ساتھ ساتھ غائت مفکرانہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔

(ہفتہ وار "البلاغ" بمبئی، ۲۱ر اگست ۱۹۵۴ء)

تعارف

حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب شیخ الادب دار العلوم دیوبند

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

دیوبند اُن مقامات میں سے ہے جن کی آبادی کا سنگِ بنیاد صدیوں پہلے رکھا گیا ہے، ایسی قدیم آبادی میں تاریخی آثارِ قدیمہ نہ ہوں تو قابلِ صد تعجب اور لائق ہزار حیرت ہے، مگر ان دُرَرِ مکنونہ اور آثارِ مخزونہ کے باوجود کسی مؤرخ کی نظر اس پر نہ پڑی تھی، اس لئے ضرورت تھی کہ دیوبند کے حالات وسوانح اہلِ ملک کے سامنے لائے جائیں۔

۱۸۵۷ء میں جس کو اہلِ غرض نے "غدر" کہا اور خود ہماری زبانوں سے کہلوا دیا تھا، اکابر علماء نے کفن بردوش ہو کر بے سر و سامانی کے باوجود اجنبی حکومت کا مقابلہ کیا اور جانیں دیں، مگر جب مقدراتِ الٰہیہ نے اُن تمام مساعی کو ناکام بنا دیا تو رضا بالقضاء سے متمسک ہو کر دار العلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی اور علوم دینیہ کی اشاعت میں مصروف ہو گئے، دار العلوم سے دیوبند کی شہرت کا آغاز ہوا، اور چونکہ بیرونی ممالک کے طلباء بھی جوق جوق آنے لگے اس لئے دیوبند کے شرف میں چار چاند لگ گئے۔ مسلمانوں کو دار العلوم دیوبند سے جو وابستگی رہی ہے

وہ اظہر من الشمس ہے! اکبر الہ آبادی مرحوم نے :-

"ہے دلِ روشن مثالِ دیوبند"

میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ۔ میں ، مولوی سید محبوب صاحب رضوی کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے اس سنگلاخ وادی میں سب سے پہلے قدم اٹھایا ، والفضل للمتقدم ، اور کئی سال کی محنت و کاوش کے بعد اس قدر مواد پیش کر دیا کہ جس سے دیوبند کی صحیح تصویر سامنے آجائے ، میں نے اس کتاب کا بیشتر حصہ دیکھا ہے ، اس میں جو خاص بات میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ مصنفِ ممدوح نے بیانِ حالات میں جذبات کا اظہار نہیں کیا ، بلکہ ہر چیز کی اصلی تصویر سامنے لانے کی سعیِ محمود کی ہے ، میں سمجھتا ہوں کہ مؤرخ کا سب سے بڑا فریضہ یہی ہے کہ وہ اظہارِ سوانح میں اپنے جذبات و تاثرات کا مظاہرہ نہ کرے! مگر ایسے تاریخ نویسوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے مصنفِ ممدوح نے اس بارے میں جس قدر جاں فشانی کی ہے وہ بہت زیادہ قابلِ قدر ہے ، انھوں نے ایک ایسی ضرورت پوری کی ہے جس کی طرف یا تو خیال ہی نہ جاتا تھا یا وہ اس قدر مشکل تھا کہ اس کا سمیٹنا دشوار تھا۔

میں دعا کرتا ہوں (اور اصحابِ علم جانتے ہیں کہ اجابتِ دعا کے لئے داعی کی صلاحیت شرط نہیں ہے) کہ اللہ تعالیٰ مصنف ممدوح کو صحت و عافیت کے ساتھ حیاتِ طویلہ بخشے! اور توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس قسم کی تصانیف سے ملک و قوم کو نفع پہنچائیں اور اردو ادب میں ضروری تاریخ کا گراں قدر اضافہ کریں۔ وہو الموفق

محمد اعزاز علی امروہی غفرلہٗ ، ۱۶ ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ

پیش لفظ

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

غیر معمولی قدامت "شے" کو قدرتاً تاریخی بنا دیتی ہے!

اس لئے دیوبند جو سہارنپور کے ضلع میں بہت ہی قدیم بستی اور مسلمانوں کی قدیم تہذیب وتمدن کی یادگار ہے، بلاشبہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے، کم وبیش دو تین ہزار سال تک اس کی آبادی کا تاریخی طور پر پتہ چلتا ہے۔

معنوی حیثیت سے عظمتِ اسلامی کی سو سالہ یادگار دارالعلوم دیوبند اسی بستی میں واقع ہے، جس نے اس کی تاریخی حیثیت کو شہرت وعظمت کے لحاظ سے چار چاند لگا دیئے ہیں، عموماً دیوبند کی شہرت وعظمت اور دنیائے اسلام میں اس کا تعارف دارالعلوم ہی کی وجہ سے ہے

دیوبند کی اس شہرتِ عامہ کی وجہ سے قدرتاً دلوں میں یہ آرزو موج زن تھی کہ اس کے تاریخی اور جغرافیائی حالات سامنے آئیں، اور جس طرح وہ اپنے

اسم و معنیٰ کے لحاظ سے دلوں میں متعارف ہے اسی طرح اپنی تاریخ کے لحاظ سے بھی جانا پہچانا بن جائے۔

محترم سید محبوب رضوی صاحب شکریہ و مبارکباد کے مستحق ہیں، انھوں نے کافی عرق ریزی سے اس بستی کے تاریخی اور جغرافیائی حالات کو یکجا کر کے ایک طبعی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے اور منتشر تاریخی واقعات کو نہایت سلیقہ مندی کے ساتھ قلم بند کر کے کتنے ہی دلوں کی آرزوئیں پوری کر دی ہیں، اور ساتھ ہی اس بستی کے مایہ الافتخار دار العلوم کے حالات پر بھی کافی حد تک روشنی ڈال کر دور دراز کے لوگوں کیلئے دور رہتے ہوئے بھی دار العلوم کی سیر کر لینے کا موقع بہم پہنچا دیا ہے۔

موصوف کے تاریخی مذاق اور وسعتِ نظر کو دیکھتے ہوئے امید ہے کہ ان کے پیش کردہ تاریخی واقعات و حقائق مستند اور قابلِ اعتماد ثابت ہوں گے۔ حق تعالیٰ ان کی اس سعی کو قبول فرمائے اور اربابِ نظر کیلئے نافع بنائے!

محمد طیب غفرلہٗ

مہتمم دار العلوم دیوبند

۸ محرم الحرام ۱۳۷۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

مقدّمہ

دیوبند ایک قدیم آبادی ہے، اور اپنی علمی، مذہبی اور تاریخی روایات کے لحاظ سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے، یہ دنیا کے ان تاریخی مقامات میں سے ہے جو قوموں کی تاریخ میں انقلاب آفریں سمجھے جاتے ہیں، اگرچہ دیوبند اپنی آبادی کی وسعت یا صنعت و تجارت کے لحاظ سے کوئی بڑا اور مرکزی شہر نہیں ہے، مگر اس کی موجودہ تاریخ ایک قابلِ قدر علمی کارنامے سے وابستہ ہے جس کے سبب سے دیوبند کی شہرت نہ صرف ایشیا بلکہ دوسرے براعظموں تک پہنچ گئی ہے، دیوبند کی موجودہ شہرت کا سبب دار العلوم دیوبند ہے جو ایشیا میں مسلمانوں کا سب سے بڑا علمی اور دینی مرکز ہے، دار العلوم دیوبند کے علمی فیضان کا دائرہ اقصائے چین سے لے کر مراکش تک پھیلا ہوا ہے۔

دیوبند اگرچہ اپنی قدامت کے لحاظ سے ہندوستان کے قدیم شہروں میں سے ہے مگر اس کے قدیم تاریخی حالات پر تاریکی کا گہرا پردہ پڑا ہوا ہے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ مہابھارت کے زمانے میں دیوبند موجود تھا۔ اور پانڈوے اپنی جلاوطنی کے آغاز میں یہاں کچھ دن قیام کیا تھا

آثار و قرائن اور آبادی کے نشیب و فراز اس کی غیر معمولی قدامت کی شہادت دیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخ کے ابتدائی دور میں اس شہر کی بنیاد پڑی تھی، جس پر کئی ہزار سال گذر چکے ہیں، مگر قدیم تاریخ اور جغرافیہ کی کتابیں دیوبند کی نسبت بالکل ساکت اور خاموش ہیں، خصوصاً گیارھویں صدی عیسوی سے قبل کے حالات تو قطعاً تاریکی میں ہیں، اور اس دور کے حالات کا پتہ لگانے کے ایسے ذرائع جو تاریخی نوعیت رکھتے ہوں یکسر معدوم ہیں، غرض کہ دیوبند آج جتنا مشہور و معروف ہے اُسی قدر اس کے قدیم تاریخی حالات گہری تاریکی میں ہیں، اس کے قدیم حالات کا معلوم کرنا اسی طرح مشکل ہے جس طرح ہندوستان کی قدیم تاریخ کا پتہ چلانا دشوار ہے، ہندو عہد کے آثار و شواہد یہاں بالکل مفقود ہیں، تلاش و جستجو کے بعد چند افسانوی طرز کی حکایتوں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، مسلمانوں کی آمد کے بعد اس کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے، مگر اس دور کی تفصیلات بھی پردۂ خفا میں ہیں، بلاشبہ قدیم ہندوستان کو حکمت و فلسفہ اور ریاضی میں نمایاں مقام حاصل تھا، مگر ہندوستان تاریخ کے فن سے ناآشنا رہا ہے، تاریخ نویسی کا مذاق مسلمانوں کے ساتھ اس ملک میں آیا، اور پھر انھیں سے یہ فن یہاں کے لوگوں نے سیکھا۔

تاریخ بالعموم دو طرح کی ہوتی ہے، ایک واقعی تاریخ جو بڑی چھان بین اور تلاش و تحقیق کے بعد لکھی جاتی ہے، دوسری تاریخ کو افسانوی کہنا چاہئے

یہ تخیّل اور جذبات کے رنگ سے عوام کے دل و دماغ پر نقش ہو جاتی ہے، اور جب تحقیق کی روشنی میں اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو حقیقت بہت کم نکلتی ہے، بلکہ بسا اوقات حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی، مؤرخ کا فرض ہے کہ صرف سنی سنائی باتوں کا یقین نہ کرے، بلکہ اسے چاہیئے کہ ایسی روایات کو تحقیق کی کسوٹی پر جانچ کر واقعی اور غیر واقعی کا پتہ چلائے، جو تاریخ نویس ایسا نہیں کرتا وہ تاریخ نگاری کے اہم فرض میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے!

ایسی صورت میں دیوبند کی قدیم تاریخ کو تفصیل سے پیش کرنا بہت مشکل ہے، تاریخ نویس جب تاریخی مواد فراہم کرنے کی جستجو کرتا ہے اور منتشر و پراگندہ واقعات پر غور و خوض کرنے کے لئے قابلِ اعتبار ذرائع پر نظر ڈالتا ہے تو مختلف و متضاد روایتوں کے انبار میں تحقیق کی تشنگی کا دور کرنا مشکل ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں تاریخ نویس کا اپنے فرائض سے باحسن وجوہ عہدہ برآ ہونا بہت دشوار ہے، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس قسم کی دشوار گذار وادی سے گذرنا پڑا ہو اس نوع کی مشکلات میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جبکہ خاطر خواہ مواد موجود نہ ہو، واقعات بکھرے ہوئے اور منتشر ہوں، اسباب و علل جو تاریخ کی جان ہیں تحقیق و تدقیق کے محتاج ہوں، راقم سطور کو دیوبند کی تاریخ کے لئے ایک ایک واقعے کے تفحص و تحقیق میں برسوں سرگرداں رہنا پڑا ہے، تب کہیں جاکر واقعات کا یہ مجموعہ مرتب ہو سکا ہے، اس لئے

12285

اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ؎

لایا ہوں اس طرح دلِ صد پارہ ڈھونڈ کر
ٹکڑا جہاں پڑا کوئی دیکھا، اٹھا لیا

اس کے باوجود مجھے اس امر کا افسوس ہے کہ دیوبند کی تاریخ میں مسلمانوں کی آمد سے قبل کے واقعات دست یاب نہیں ہو سکے، اور ؎

سُنی حکایتِ ہستی، تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

بہرحال اس سلسلے میں اپنی امکانی جدوجہد، تلاش و تجسس اور چھان بین سے جس قدر قابلِ اعتبار حالات دست یاب ہو سکے وہ پیش کر دیے گئے ہیں، اور گو معلومات کا بہت محدود ذخیرہ پیش کیا جا سکا ہے، تاہم امکانی سعی و تلاش کے نتائج سے جو ناتمام مرقع تیار ہو سکا ہے وہ آئندہ صفحات میں نظر آئے گا۔

میں نے واقعات کے بیان میں بالعموم تو یہ کوشش کی ہے کہ تحریری مآخذ کو بنیاد قرار دیا جائے، مگر اکثر واقعات ایسے بھی ہیں جو پرانے لوگوں سے سُن کر بیان کیے گئے ہیں، اس صورت میں شہادتِ تائیدی کے مقابلے میں شہادت تردیدی کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے، یعنی اگر کسی واقعے کے متعلق کوئی مخالف بات معلوم ہوئی تو اس واقعے کو قطعاً ترک کر دیا ہے، اور یورپ کے اس اصولِ موضوعہ سے حتی الامکان احتراز کیا ہے کہ ایک ساتھ کے دو واقعوں میں علت و معلول کا تعلق

پیدا کرکے مفروضہ بنیاد پر قیاسات کی عالی شان عمارت کھڑی کردی جائے یہ "تاریخ نویسی نہیں، تاریخ سازی ہے!

تاریخ کے صفحات میں سب سے پہلے اکبر کے عہد میں ابوالفضل کی آئین اکبری میں دیوبند کا ذکر ملتا ہے، البتہ انیسویں صدی سے بعض حضرات نے اس کی تاریخ کی جانب فی الجملہ توجہ کی ہے، اس سلسلہ میں پہلی تحریر مولانا فصیح الدین دیوبندیؒ کی ملتی ہے، انہوں نے ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۶ء میں سہارنپور کا جغرافیہ لکھا تھا، اس میں ضمناً دیوبند کا ذکر بھی کیا ہے، اس کے بعد متصلاً ہی ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۸ء میں منشی نند کشور ڈپٹی کلکٹر ضلع میرٹھ نے صوبہ متحدہ (موجودہ اتر پردیش) کی گورنمنٹ کی جانب سے ضلع سہارنپور کی مفصل تاریخ مرتب کی ہے، اس میں کسی قدر تفصیل سے دیوبند کے حالات بیان کئے گئے ہیں، عربی زبان کے مشہور ادیب مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ نے بھی اپنے رسالہ الہدیۃ السنیہ میں دیوبند کی نسبت اجمالاً چند باتیں لکھی ہیں۔

راقم سطور نے دیوبند کے واقعات کو حتی الامکان صحت و تحقیق کے ساتھ سہل اور عام فہم انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور دیوبند کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا وہ پیش کر دیا گیا ہے، جو باتیں قابل اعتماد طور پر بایہ تحقیق کو پہنچی ہیں ان کو بلا تردد بیان کر دیا ہے، اور جس بات کے بارے میں شبہ ہے اس کا اظہار کر دیا گیا ہے۔

بایں ہمہ تدبر و احتیاط نہ تو میں خود کو لغزش سے ماوراء سمجھتا ہوں

اور نہ کتاب کے اغلاط سے پاک ہونے کا یقین دلاتا ہوں، انسان کا کون عمل آج تک مکمل ہوا ہے۔

اُتر پردیش کے شمالی مغربی اضلاع کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ سرزمین ہمیشہ مذہبی روایات کی حامل رہی ہے، گنگ وجمن کا یہ سرسبز وشاداب خطّہ قدیم زمانے سے مقدس سمجھا جاتا ہے، ہندوؤں کی عظیم تیرتھ گاہ ہردوار اسی جگہ واقع ہے، رشی کیش بھی یہیں ہے۔

اس علاقے کے مشرقی گوشے میں ہردوار اور مغربی سرے پر تھانیسر کے قریب کرکشیتر کی قدیم تیرتھ گاہیں اس کے تقدس کی زندہ شہادتیں ہیں گنگا و جمنا جو ہندوؤں کے مقدس دریا ہیں ان کا منبع بھی یہی سرزمین ہے ہردوار میں جو ہمالیہ کی وادی میں خوبصورت جگہ ہے، ہندوستان کے گوشے گوشے سے ہمیشہ بے شمار یاتری اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق اشنان کرنے کے لئے آتے رہتے ہیں۔

تیرھویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ان اضلاع میں مسلمان بسنے شروع ہو گئے تھے، کلیر، گنگوہ، نانوتہ، امبہٹہ تھانہ بھون، جھنجھانہ، کیرانہ، پھلت اور منگلور وغیرہ قصبات شمالی ہند میں مسلمانوں کی وہ قدیم بستیاں ہیں جن میں بہت سے اولیاء اللہ، مشائخ عظام اور علمائے کرام آسودۂ خواب ہیں، ان حضرات کی برکت سے اس سرزمین کو یہ شرف حاصل ہے کہ مسلمانوں میں قدیم زمانے سے دین داری اور اتباعِ شریعت کا جذبہ دوسرے مقامات سے کہیں زیادہ یہاں کارفرما رہا ہے

یہاں کے مسلمانوں نے دین و مذہب کے نام پر سب کچھ قربان کر دینے کو ہمیشہ اپنا مقصدِ زندگی سمجھا ہے، ان اضلاع اور خصوصاً دیوبند کی سرزمین کی فضا میں قال اللہ اور قال الرسول کی آوزیں اسلام کی زندگی کا واضح ثبوت ہیں، دینی خدمات کی بیشتر تحریکوں میں ان اضلاع کے مسلمانوں نے دل کھول کر حصّہ لیا ہے اور اس مبارک فرض کو انجام دینے میں وہ ہمیشہ دوسروں سے آگے رہے ہیں، غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ پچھلی صدی میں اس سرزمین کو دینی سرگرمیوں کا مرکز بننے کا شرف حاصل ہوا۔

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں دنیائے اسلام کی ممتاز ترین درس گاہ دارالعلوم کے قیام نے دیوبند کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے ہیں، جس سے اس کی شہرت تمام دنیا میں پھیل گئی، تیرھویں صدی ہجری کے اواخر سے اسلامی تاریخ میں دینی علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کا یہ سرزمین گہوارہ بنی ہوئی ہے، دارالعلوم دیوبند ایک صدی سے ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کی علمی و دینی رہ نمائی کر رہا ہے اس کی علمی آغوش سے ایسے ایسے علماء اور اصحاب کمال اٹھے جن کے فیض سے بلا مبالغہ پورا ایشیا سیراب ہو رہا ہے، علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں دیوبند نے ایک گرانقدر اور بیش بہا کارنامہ انجام دیا ہے پچھلے سو برس سے دارالعلوم، ہندو پاک کے علاوہ پورے ایشیا کے مسلمانوں کے علمی و روحانی نشو و نما کا عظیم مرکز سمجھا جاتا ہے، اس کی علمی

اور دینی خدمات پورے عالم اسلام میں مقبول ہیں، دار العلوم کے ہزاروں فضلاء ہند و پاک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور دین کی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں، درس و تدریس، وعظ و تقریر، تصنیف و تالیف، تبلیغ و مناظرہ، رُشد و ہدایت اور سیاست و قیادت کے سبھی میدانوں میں فضلائے دار العلوم نظر آتے ہیں چنانچہ دیوبند مذہبی حلقوں میں کسی خطۂ زمین کے بجائے اپنے مسلک کے نام سے زیادہ روشناس ہے، اس کی علمی کشش نے دور دور سے طالبانِ علم کو کھینچ کر اپنی آغوش میں جمع کر لیا ہے، اور مختلف رنگ و بُو کے پھولوں سے اس کا دامن پُر نظر آتا ہے۔

درحقیقت دار العلوم دیوبند کی تاریخ، اسلامی علوم و فنون کے ایک نہایت اہم دور کی تاریخ ہے، دسویں صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کے زوال و انحطاط کے زمانے میں صرف دار العلوم دیوبند ہی علومِ اسلامی کی وہ تعلیم گاہ ہے جس نے علمِ نبوت کے چراغ کو بادِ مخالف کے پیہم تھپیڑوں کے باوجود روشن رکھا، اور برطانوی حکومت سے بے نیاز رہ کر سیاسی غلامی کی فضا میں ذہنی اور علمی آزادی کو برقرار رکھنے کی کامیاب جد و جہد کی!

دار العلوم نے بے شمار طالبان علم کو اپنی آغوش میں جذب کر کے ان کو علمی اور ذہنی انتشار و پراگندگی کی حالت سے نکال کر اس قابل بنا دیا کہ وہ علمی حیثیت سے اسلام کی دعوت و تبلیغ میں حصہ لے سکیں

بالخصوص ہندوپاک کے مسلمانوں کی دینی وملّی بیداری میں دارالعلوم دیوبند کا بڑا حصّہ ہے۔

۱۸۵۷ء کے خونین انقلاب کے بعد مسلمان قوم پر زوال وانحطاط کی جو کیفیت طاری ہوگئی تھی، اُس وقت اس بات کا قوی اندیشہ تھا کہ کہیں اس زوال کے طوفانِ بلاخیز میں اسلامی تعلیمات اور مسلمان فنا کے گھاٹ نہ اتر جائیں، دارالعلوم نے بروقت ان سنگین حالات کا جائزہ لیکر اس خطرے کا سدِّباب کردیا اور ایک ایسا دفاعی حصار بناکر پیش کیا جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو پیش آنے والے خطرات سے محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے ؎

حبّذا اے مادرِ علم وفنوں در ملکِ ہند
صیتِ تو مشہور گشت از قاف تا ہم قیروان

دارالعلوم کے حالات اگرچہ تاریخِ دیوبند کے تقریباً نصف حصّے پر پھیلے ہوئے ہیں، مگر اس کے باوجود، دارالعلوم کا یہ بہت ہی مختصر اور اجمالی تذکرہ ہے، اس عظیم الشان درس گاہ کے علمی کارناموں کو پیش کرنے کے لئے درحقیقت ایک ضخیم "تالیف درکار ہے، افسوس ہے کہ دارالعلوم کی جانب سے اب تک اس کی کوئی ایسی تاریخ شائع نہیں ہوئی جس میں تفصیل کے ساتھ اس کے حالات مذکور ہوں۔!

"تاریخ دیوبند" پہلی مرتبہ ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی تھی، مؤلف خدائے بزرگ وبرتر کی بارگاہ میں سراپا نیاز اور سپاس گذار ہے

کہ اس نے تاریخ دیوبند کو قبولِ عام کا شرف عطا فرمایا اور اربابِ علم وادب نے اس کی نسبت جس طرح کمال پسندیدگی کا اظہار کیا وہ مؤلف کی توقع سے کہیں زیادہ ہے۔

اس دوران میں جو معلومات دست یاب ہوتی رہیں نظرِ ثانی میں جا بجا ان کا اضافہ کر دیا گیا ہے، بعض جدید عنوانات بھی شامل کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشن میں نہ تھے، نئے اضافوں کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے بعد کتاب کی ضخامت دو چند ہو گئی ہے، نظرِ ثانی میں بعض مقامات پر حکّ و ترمیم کی ضرورت بھی پیش آئی ہے، مجھے پورا احساس ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حرفِ آخر نہیں ہے، یہ محض سنگِ بنیاد ہے اور اپنے موضوع پر پہلی کوشش ہے، چنانچہ ابتدائی تاریخ میں کافی خلا ہے، اس دور سے ہماری واقفیت بہت محدود ہے، تاہم ایک خاکہ تیار ہو گیا ہے، جس پر آئندہ ایک رفیع الشان قصر تعمیر کیا جا سکتا ہے، اس کے لئے کہاں کہاں سے مواد فراہم کرنا پڑا ہے اس کا جواب آپ کو کتاب کے صفحات دے سکیں گے ؎

تمتّع ز ہر گوشہ یافتم
ز ہر خرمنے خوشہ یافتم

سالہا سال کی جگر کاوی اور تگ و دو کے بعد جگہ جگہ سے پھول چُن کر جو گلدستہ تیار ہو سکا وہ پیش کیا جا رہا ہے۔

تاریخ دیوبند میں سَن جس طرح لکھے گئے ہیں ان کی نسبت یہ بات عرض کر دینی ضروری ہے کہ انیسویں صدی عیسوی سے پہلے ہماری تاریخوں میں سنِ ہجری استعمال کیا جاتا تھا، اس دَور کے حالات لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اصل سنِ ہجری کو باقی رکھا جائے، ورنہ صرف مطابق عیسوی سَن لکھ دینے سے اکثر واقعات کی توقیت میں فرق آجاتا ہے، اور بعض اوقات اس بے احتیاطی کی وجہ سے اُس واقعہ کا زمانہ مقدّم یا مؤخر ہو جاتا ہے یہ تاریخ نویسی کا بہت بڑا نقص ہے، تاریخ دیوبند میں ایسے مقامات پر ہجری اور عیسوی دونوں سَن لکھے گئے ہیں، ان کے لکھنے میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ منقول سن کو اصل قرار دے کر اوپر لکھا گیا ہے اور نیچے اس کے مطابق دوسرا سَن لکھ دیا گیا ہے، اس التزام کی وجہ سے کہیں سنِ ہجری اوپر لکھا ہوا ہے اور کہیں سنِ عیسوی اوپر لکھا ہوا ملے گا۔

دیوبند کے علماء و مشائخ، مصنّفین، شعراء اور دوسرے اہلِ کمال کے تذکرے کے لئے ایک مستقل جلد کی ضرورت ہے، یہ حالات انشاء اللہ دوسری جلد میں پیش کئے جائیں گے، تیرھویں صدی ہجری تک جن علماء و مشائخ کے حالات اس جلد میں آگئے ہیں اُن کو ضمنی طور پر سمجھنا چاہیئے۔

سید محبوب رضوی

دیوبند
۳ر صفر المظفر ۱۳۹۱ھ
۳۱ر مارچ ۱۹۷۱ء

قدامت

دیوبند ایک قدیم اور پرانی بستی ہے، چنانچہ اس کے در و دیوار سے قدامت نمایاں ہے، دیکھنے میں تو یہ ایک چھوٹی سی بستی ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی خاک کو بڑا مردم خیز بنایا ہے اور علم تو اس سرزمین سے سبزے کی طرح اُگتا ہے۔

دیوبند کو کب اور کس نے آباد کیا؟ اس کا فیصلہ کُن جواب دینا بہت مشکل ہے، قدامت کے باعث اب تک اس کے زمانۂ تعمیر کی ٹھیک ٹھیک تعیین نہیں کی جا سکی ہے، کسی نے ایک ہزار برس کی آبادی بیان کی ہے اور کسی نے سمبت بکرماجیت سے پہلے کی جس کو دو ہزار سے زائد گزر چکے ہیں، غرض کہ دیوبند کی قدیم تاریخ کا حال معلوم ہونا اسی قدر مشکل ہے جس طرح ہندوستان کی اور بہت سی آبادیوں کا پتہ چلانا دشوار ہے۔

ایک روایت میں طوفانِ نوح کے قریب ترین زمانے میں آباد ہونا بتلایا گیا ہے، تاہم پرانی عمارتوں اور کتبوں سے اس قدر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ابتدائی عہدِ حکومت کے بہت پہلے سے آباد ہے، دوآبہ کا علاقہ تاریخ کے قدیم ترین زمانے سے ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔

موجودہ آبادی سے مشرق کی جانب تقریباً دو میل کے فاصلے پر خستہ عمارتوں اور غیر مسلم عبادت گاہوں کے بکثرت نشانات ملتے ہیں، ایک مندر کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ اسی قدیم دور کی یادگار ہے، پرانے لوگوں کا بیان ہے کہ ڈیڑھ دو ہزار سال قبل دیوبند کی قدیم آبادی یہی تھی، میرا خیال ہے کہ اگر اس سلسلہ میں تجسس و تحقیق اور چھان بین سے کام کیا جائے اور یہاں کے کھنڈروں کی اینٹوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا جائے تو یقیناً کچھ نہ کچھ انکشافات ہو سکتے ہیں۔

دیوبند کے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ بودھ مت کے عروج کے آخری زمانے میں جب کہ برہمن اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کے لئے خفیہ جد و جہد کر رہے تھے تو یہ مقام بھی ان کے خفیہ انقلابی مرکزوں میں سے تھا۔

بہرحال اس کا افسوس ہے کہ دیوبند کی قدامت کے لحاظ سے اس کے حالات کا پتہ لگانے کے ذرائع دست یاب نہیں ہو سکے، اس لئے مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ کے طور پر جو معلومات حاصل ہو سکیں وہ پیش کی جا رہی ہیں۔

مولانا فصیح الدین صاحبؒ نے ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۶ء میں ضلع سہارنپور کا جغرافیہ لکھا ہے، اس میں دیوبند کی آبادی کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"آبادی نہایت پرانی سمبت بکرماجیت سے پہلے کی ہے"[1]

---

[1] جغرافیہ ضلع سہارنپور۔ ص ۱۹

تاریخ سہارنپور کا مصنّف بھی زمانۂ آبادی کی ٹھیک تعیین نہیں کرسکا یہ کتاب صوبۂ متحدہ کی گورنمنٹ کی جانب سے بطور گزیٹیر ۱۸۶۸ء میں لکھی گئی ہے، اس میں لکھا ہے کہ :-

"یہ قصبہ قدیمی ہے، تخمیناً ایک ہزار برس کی آبادی بیان کرتے ہیں، ایک قلعہ اس میں تھا کہ اب اس پر عمارت سابق کا نشان نہیں ہے، اب مثل ایک کھیڑے کے ہے، سرکار انگریزی نے مقام تحصیل اس پر بنایا ہے، اس قلعہ کے دروازہ پر ایک مسجد بہ عمارت پختہ کہنہ تعمیر موجود ہے اور پیش دروازہ اس کے پتھر پر یہ عبارت اس کے سَن و تاریخ کی کندہ ہے سنہ ۹۱۶ھ سلطان سکندر بن بہلول شاہ[۲]"

مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ، دیوبند کو طوفانِ نوحؑ کے بعد کی ابتدائی بستیوں میں شمار کرتے ہیں، انھوں نے ذیل کے ادیبانہ انداز میں اس کی قدامت کا ذکر کیا ہے :-

دیوبند، کورۃٌ قدیمۃٌ و قصبۃٌ عظیمۃٌ ومدینۃٌ کریمۃٌ وبلدۃٌ فخیمۃٌ کانہا	دیوبند ایک قدیم آبادی اور بڑا قصبہ ہے، شرفا کی بستی ایک باعظمت اور عظیم الشان شہر ہے، معلوم ہوتا ہے

---

[۱] تاریخ سہارنپور کے مصنّف کو مسجد کے سنِ تعمیر کے پڑھنے میں مشہور روایت کی بنا پر غلط فہمی ہوئی ہے، دراصل یہ مسجد سنہ ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء کی تعمیر ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

[۲] تاریخ سہارنپور ص ۲۶ و ۱۶۰۔

اوّل عُمران، عُمر بعد الطوفان ذات المعاهد الوسيعة، و المساجد الرفيعة والمعالم المشهورة، والمقابر المزورة، و الآثار المحمودة، والاخبار المسعودة، وأبنية مرصوصة وامكنة محصوصة[۱]

کہ طوفانِ نوح کے بعد کی ابتدائی بستیوں میں سے ہے، اس کی عمارت ومساجد نہایت وسیع اور بلند واقع ہوئی ہیں، آثارِ قدیمہ اور مزاراتِ اولیاء اللہ سے بھرا ہوا ہے، اس کے آثار محمودہ اور حالاتِ مبارکہ مشہور ہیں اس میں پختہ عمارات اور مستحکم عمارتیں ہیں۔

ہندی زبان کے "ہندو سنسکرتی کا ایک کیندر" کے مصنف نے لکھا ہے کہ :-

"دیوبند کا ذکر مارکنڈے پُران میں ملتا ہے جس سے دیوبند کی قدامت ثابت ہے، نیز یہ بھی مشہور ہے کہ کوروپانڈو کے عہدِ حکومت میں دیوبند آباد تھا۔"[۲]

امپیریل گزیٹر میں لکھا ہے۔

"پانڈو نے ملک بدر ہونے کی پہلی مدت یہیں گذاری تھی، یہاں کا قلعہ سالار مسعود غازی[۳] کے اوّلین مفتوحہ قلعوں

---

[۱] الہدیۃ السنیۃ مطبع مجتبائی دہلی، ص ۱۰

[۲] ہندو سنسکرتی کا ایک کیندر ص ۲ شائع کردہ نراتن نند سرستی۔

[۳] سالار مسعود غازی اوائل پانچویں صدی ہجری کے ایک اولوالعزم مجاہد اور سلطان محمود غزنوی کے بھانجے تھے، ان کے والد سالار ساہو کو (باقی حاشیہ صفحہ ۳۴ پر)

میں سے تھا۔" [۱]

شہر سے باہر جنوب کی جانب ایک محلہ سرائے پیرزادگان ہے، اس محلہ کے ایک کنویں میں سنسکرت رسم الخط کا ایک کتبہ اینٹوں پر کھدا ہوا ہے اس کتبے کو پڑھنے کی بے حد کوشش کی گئی، مگر اینٹوں کے گھس جانے کی وجہ سے حروف صاف طور پر معلوم نہیں ہوتے، صرف نیچے کی جانب کسی قدر سن کا پتہ چلتا ہے، غالباً ۱۱۹۰ء بکرماجیت ہے، سوا سو سال سے

(بقیہ حاشیہ صـ۳۳) سلطان محمود نے اجمیر کی مہم میں فوج کا سالار مقرر کیا تھا، سالار مسعود غازی ۱۰۱۴ء/۴۰۵ھ میں پیدا ہوئے، نوجوانی ہی میں دہلی، میرٹھ، قنوج اور بہرائچ وغیرہ مقامات کی جنگوں میں نمایاں فتوحات حاصل کیں، آخر میں بہرائچ میں مقیم تھے کہ گردونواح کی ریاستوں نے ان پر حملہ کیا، اس جنگ میں سالار مسعود غازی نے ۱۴ رجب ۱۰۳۴ء/۴۲۴ھ کو جام شہادت نوش کیا، بہرائچ میں ان کا مزار زیارتگاہ خاص وعام ہے۔

(سوانح عمری سالار مسعود غازی مصنفہ حافظ محمد فاروق بہرائچی مطبوعہ ۱۹۱۲ء/۱۳۳۱ھ نظامی پریس کانپور سے یہ حالات ماخوذ ہیں۔)

تاریخ میں سالار مسعود غازی کے دیوبند پر حملہ کرنے کا کوئی ذکر نہیں ملتا البتہ تاریخ سہارنپور میں سلطان محمود غزنوی کا دیوبند آنا اور یہاں کی آبادی کی توسیع پر توجہ دینے کا واقعہ مذکور ہے (ص۱۶۰) ہو سکتا ہے کہ میرٹھ کی فتح کے بعد سالار مسعود غازی نے دیوبند کا رخ کیا ہو۔

[۱] امپیریل گزیٹیر آف انڈیا جلد ۱۱ ص ۲۴۲، مطبوعہ ۱۹۰۸ء۔

کچھ زائد ہوئے کہ تعمیر مکان کے سلسلے میں ایک بہت پرانے بند کنوئیں سے ایک سنگی کتبہ برآمد ہوا تھا، جس کو سکندر اعظم کے زمانے کا بتایا جاتا ہے اس کتبے پر برآمدگی کے بعد ماہرین آثار قدیمہ نے قبضہ کرلیا۔ معلوم نہیں کہ اب کہاں ہے۔ اگر یہ کتبہ ہاتھ آتا تو شاید مزید انکشاف ہوسکتا تھا۔

یہاں ایک قلعہ بھی راجگان ہستناپور کے زمانے کا بیان کیا جاتا ہے سلطان سکندر شاہ (۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء، ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء) کے عہد میں حسن خاں صوبہ دار نے قدیم عمارت کو مسمار کرا کر از سر نو پختہ اینٹوں کا تعمیر کرایا تھا، حسن خاں کے نام کی نسبت سے قلعہ کا مقام اب تک حسن گڈھ کہلاتا ہے۔

اس قلعہ کے متعلق آئین اکبری میں ہے :-

"دیوبند، قلعہ از خشت پختہ دارد"[1]

قلعہ اور اس کی عمارتوں کا اب کوئی نشان نہیں ملتا، صرف ایک اونچا مقام ہے، جس پر زیادہ تر سرکاری عمارتیں تحصیل، عدالت منصفی، دفتر رجسٹری، ڈاک خانہ اور اسکول واقع ہیں۔ اس قلعہ کے ایک کنوئیں کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں دیوؤں کو قید کیا گیا تھا۔

قدیم آبادیوں میں یہ خصوصیت عام طور پر پائی جاتی ہے کہ ان کی آبادی ہموار سطح پر واقع نہیں ہوتی، کہیں نشیب ہوتا ہے اور کہیں فراز، اس کا سبب ماہرین آثار قدیمہ کے نزدیک یہ ہے کہ زمانے کے حوادثات سے جب بھی کوئی

---

[1] آئین اکبری ج دوم ص ۱۴۳

آبادی نیست و نابود ہوتی ہے تو زمین پر اپنا ارتفاعی نشان ضرور چھوڑتی ہے بعد کے لوگ اسی جگہ آباد ہونے کی خواہش کے ماتحت اس پر دوبارہ تعمیر کرتے ہیں، اور جب یہ سلسلہ ہزاروں سال تک جاری رہتا ہے اور آبادیاں بگڑتی اور بنتی رہتی ہیں تو سطح میں ناہمواری اور نشیب و فراز کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ یہ صورت حال ایسے مقامات میں زیادہ نمایاں ہوتی ہے جہاں مٹی سے مکانات بنائے جاتے ہیں، چونکہ مٹی کے مکانات زیادہ پائیدار نہیں ہوتے، اور جلد جلد منہدم ہوتے رہتے ہیں۔ وہی مٹی جس سے دیواریں بنائی گئی تھیں منہدم ہو کر سطح زمین کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے، رفتہ رفتہ ہزاروں سال کی گردش سے وہ جگہ ایک بلند ٹیلے کی شکل اختیار کر لیتی ہے چنانچہ تیسری صدی ہجری کے سیاح ابن حوقل نے اس زمانے کی عمارتوں کی نسبت لکھا ہے کہ زیادہ تر عمارتیں مٹی سے بنائی جاتی ہیں[۱]۔

اس اصول کے مطابق جب دیوبند کو دیکھا جاتا ہے تو اس کی آبادی میں بکثرت نشیب و فراز نمایاں نظر آتے ہیں، بعض بعض جگہ تو یہ تفاوت چالیس پچاس فٹ تک پہنچ جاتا ہے۔

اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آبادی اپنے جغرافیائی نشیب و فراز کے ساتھ نہ معلوم کتنے نشیب و فراز اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے۔

---

[۱] ابن حوقل ص ۲۶۵ بحوالہ ہزار سال پہلے ص ۹۰، مطبوعہ ۱۳۶۹ھ / ۱۹۵۰ء

وجہ تسمیہ

دیوبند کی وجہ تسمیہ میں ذیل کی متعدد اور مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دیوبند کو پہلے "دیوی بلاس" کہتے تھے، کیونکہ یہاں پر سُندری دیوی کا ایک مندر معروف بہ "دیوی کنڈ" اور ایک جنگل موسوم بہ "بلاس" واقع تھے۔

۲۔ منشی نند کشور نے ضلع سہارنپور کی تاریخ میں دیوبند کی وجہ تسمیہ کی نسبت لکھا ہے کہ :-

"وجہ تسمیہ قصبہ میں بہت سی روایات زبان زد ساکنینِ قصبہ کے ہیں مگر قرین قیاس وجہ تسمیہ کے یہ معلوم ہوئی کہ پہلے اس موقع پر جنگل لق و دق تھا، ایک مکان معروف "دیبی کنڈ" اور دوسرا جنگل "بلاس" اس موقع پر واقع تھے، ان دونوں مکانوں کے سبب سے بنام نہاد دیوبند مشہور ہوا، پہلے اس مقام کو "دیبی بن" کہتے تھے، کثرت استعمال سے دیوبند ہو گیا۔"[1]

---

[1] تاریخ سہارنپور، مطبوعہ ۱۸۶۸ء / ۱۲۸۵ھ ص ۲۷، ۱۶۰۔

تاریخ سہارنپور کے مصنف منشی نند کشور کے حالات معلوم نہیں ہو سکے

تاریخ سہارنپور سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ میرٹھ میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز تھے، صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ (اُتر پردیش) کے لیفٹیننٹ گورنر ولیم میور کے

(باقی حاشیہ بر صـ۳۸)

۳ ۔ بعض کا قول یہ ہے کہ "سلیمان پیغمبر نے اس کے قلعہ میں دیوؤں کو بند کیا ہے، اس واسطے دیوبند نام ہے، کس واسطے کہ ہندی میں "دیو" معنی "دیوتا" اور "بن" مراد جنگل سے ہے۔ [۵۱]

۴ ۔ بعض لوگ ایران کی تاریخ کے حوالے سے ایک اور سببِ تسمیہ بیان کرتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے :-

"ایران کے آریہ نسل کے باشندوں کی زبان میں لفظ "دیو" کا اطلاق وحشی اور جنگلی انسانوں پر کیا جاتا تھا، چنانچہ یہی لفظ ہندوستان میں آکر بعد کو "مہادیو" بن گیا۔ ہندوستان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی آریہ نسلوں نے ہندوستان آکر یہاں کے اصلی باشندوں کو کھلے میدانوں اور آبادیوں سے بزورِ شمشیر نکال کر گنجان جنگلوں اور دشوار گذار پہاڑوں میں مار بھگایا۔"

پس چونکہ دیوبند میں جنگلات کی کثرت تھی، قرینِ قیاس ہے کہ نووارد آریوں نے وحشی اقوام کو اس جنگل میں بند کر دیا ہو، اس لئے دیوبند کے نام سے موسوم ہوا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷) حکم سے تاریخ سہارنپور مرتب کی، جس میں بڑی تفصیل کے ساتھ ضلع سہارنپور کے قصبات و دیہات کے حالات لکھے ہیں، تاریخ سہارنپور کی تدوین میں سہارنپور کے اسسٹنٹ کلکٹر ولیم سے انھیں بڑی مدد ملی، جابجا سرکاری ریکارڈ سے حوالے بھی دئے گئے ہیں۔

[۵۱] "تاریخ سہارنپور، مطبوعہ ۱۸۶۸ء / ۱۲۸۵ھ۔ ص ۱۶۰

۵ــ ایک روایت (جس کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے) یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ "حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں دیوبند کے باشندوں کی فریاد پر آپ کے عمّال نے یہاں آکر ایذا دہندہ جنات کو قید کر دیا، اور دیوؤں کا یہ تقیّد آگے چل کر سببِ تسمیہ بن گیا، چنانچہ اسی روایت کی بنا پر ایک پرانے بند کنوئیں کو دوبارہ کھودنے کے وقت ایک جن کا نکلنا بھی عوام الناس کی زبان پر ہے[۱]

تاریخی اور تحقیقی طور پر ان میں سے ہر ایک روایت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا البتہ روایات کے اختلاف سے تین ناموں کا یقین ہوتا ہے "دیوی بلاس" "ڈیوی بن"۔ "دیوبند"۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں یہ مقام کس نام سے ملتا ہے، جہاں تک تلفظ کا تعلق ہے اس میں مؤخر الذکر دو نام مروّج ہیں، تاریخ سے بھی ان ہی دو ناموں کا ثبوت ملتا ہے مگر وہ بھی بہت زیادہ قدیم نہیں، راقم سطور کے اجداد میں بعض بزرگوں کے نام جہانگیر اور شاہ جہاں نے جاگیریں عطا کی ہیں اُن میں دیوبند ہی تحریر ہے۔

آئین اکبری جو عہد اکبری (۹۶۳ھ / ۱۵۵۵ء - ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء) کی تصنیف ہے اس میں بھی دیوبند ہی لکھا گیا ہے[۲]

ٹھیک اسی زمانے میں ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی ایک نظم میں "دیبن" لکھا ہے۔ بدایونی کا شعر یہ ہے ؎

---

[۱] مقدمہ حیات شیخ الہندؒ، مصنفہ مولانا میاں اصغر حسینؒ ص ۵

[۲] آئین اکبری جلد دوم مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۹۳ء ص ۲۸ و ۱۴۲

شیخ عثمانی کہ بُد در پارسائی بے عدیل
نازلِ دیہہِ منونہ اصل دین را سلام [1]

کتب خانہ دار العلوم دیوبند میں زیچ اُلغ بیگی کا ایک مخطوطہ ہے اسکے آخر میں تحریر ہے :-

"ایں اوراق زیچ اُلغ بیگی درروز یوم السبت در قلعۂ دیوبند بتاریخ نوزدہم شہر ربیع الاول سنہ ۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۳ء صورت تحریر یافت"

دیوبند میں ایک بزرگ "قالو قلندرؒ" گذرے ہیں، جن کا مزار تحصیل کے قریب سبزی فروشوں کے بازار میں واقع ہے۔ تذکرۃ العابدین میں ان کا سن وفات سنہ ۸۲۵ھ / ۱۴۲۱ء لکھا ہے، ان قالو قلندرؒ کا ایک شعر عام طور پر زبان زد ہے

---

[1] منتخب التواریخ کے مصنف ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی ایک طویل نظم میں بزرگانِ بدایوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ نظم "سلام" کے عنوان سے موسوم ہے۔

مذکورہ بالا شعر شیخ دانیال عثمانی کے متعلق ہے جو ساتویں صدی ہجری کے اوائل کے ایک نامور عالم تھے۔ سلطان شمس الدین التمش نے اپنی بدایوں کی گورنری کے زمانے میں ان کو بدایوں کے عہدۂ قضاء پر مامور کیا تھا، شیخ دانیال کا ذکر آگے آئے گا۔

ملّا عبدالقادر کا "سلام" مولوی نظام الدین حسین نظامی کے مجموعۂ کلام تجلیاتِ سخن میں چھپا ہے جو سنہ ۱۹۳۰ء / ۱۳۴۹ھ میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا ہے۔

اس میں دیوبند نظم کیا گیا ہے۔ اس شعر کا پہلا مصرع یہ ہے ؏

قالو قلندرست بدروازہ دیوبند

مجدد الف ثانی کی سیرت زبدۃ المقامات جو اوائل گیارھویں صدی ہجری کی تصنیف ہے، اس میں ایک مکتوب بنام شیخ احمد دینیؒ کے ذیل میں تحریر ہے

"دیبن موضعی ست از مضافات سہارنپور میان دو آب"[1]

دیوبند میں ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۳ء میں ایک زبردست پلیگ پھیلا تھا، اس پلیگ کی تباہ کاریوں کو مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ نے فارسی میں نظم کیا ہے، اس نظم کا تاریخی نام "قصہ غم دیبن" ہے

۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۵ء میں جیمس ڈکس لاٹوش لفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ کے معائنہ دارالعلوم دیوبند کے خیر مقدم میں جو نظم پڑھی گئی اس میں بھی "دیبن" نظم کیا گیا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

ہے یہ دارالعلم شاہا! یادگارِ مسلمیں
کوردہ دیبن ساجس سے رشکِ شہر طوس ہے

مذکورہ بالا تحریری اسناد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "دیبن" اور "دیوبند" دونوں نام مدتِ مدید سے مروج اور زبان زد ہیں، اس لئے قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں اولیت کس کو حاصل ہے، تاہم میرے نزدیک وجہ تسمیہ کی پہلی دو روایتیں عقل اور قیاس کے اعتبار سے

---

[1] زبدۃ المقامات مطبوعہ محمود پریس لکھنؤ، ص ۳۸۴

زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں کہ دیوبند " دیوی" اور "بن" سے مرکب ہے ان دونوں لفظوں کی آمیزش نے اس کو اولاً " دیوی بن" سے موسوم کرایا جو بعد ازاں کثرتِ استعمال سے " دِے بَنْ " اور پھر رفتہ رفتہ تصرّفِ متکلمین سے دیوبند ہوگیا۔

اس روایت کے آثار و قرائن بھی فی الجملہ پائے جاتے ہیں، یعنی دیوی" کا مندر اور "بن" گو ان میں سے آخری چیز ختم ہوتے ہوتے، اب قریب قریب معدوم ہو چکی ہے مگر اس کے وجود کا ثبوت وجہ تسمیہ کے علاوہ متعدد روایات کے سبب سے " خبر متواتر" کی حیثیت رکھتا ہے، نیز دیوبند کے شمالی جانب کا ایک مقام" قاضی فضل اللہ شیرؒ کی بنی" کے نام سے موسوم ہوگیا ہے، جو اسی بَنْ کا ایک حصہ ہونے کی وجہ سے بصیغۂ تصغیر " بنی" کہلاتا ہے، اس "بنی" کے کچھ کچھ آثار اب بھی باقی رہ گئے ہیں۔

محلِّ وقوع

دیوبند شمالی ہند میں ۲۹ درجے ۵۸ دقیقے عرض البلد اور ۷۷ درجے ۳۵ دقیقے طول البلد پر واقع ہے، دیوبند کے جنوب مغرب سے نارتھ ورن ریلوے گذرتی ہے، دیوبند کا ریلوے اسٹیشن دہلی سے بجانب شمال ۱۴۴ کیلو میٹر پر ہے، نارتھ ورن ریلوے کی یہ لائن دہلی، یوپی، ہریانہ اور پنجاب سے گذرتی ہوئی امرت سر تک جاتی ہے، یہ ریلوے لائن اپریل ۱۹۵۲ء / ۱۳۷۱ھ سے پہلے نارتھ ویسٹرن ریلوے کے نام سے موسوم تھی۔ ہندوستان کی تقسیم ۱۹۴۷ء / ۱۳۶۶ھ سے قبل پشاور تک جاتی تھی، ستمبر ۱۸۶۵ء / ۱۲۸۲ھ سے دسمبر ۱۸۶۸ء / ۱۲۸۵ھ کے درمیان اس کی تعمیر ہوئی، اور یکم جنوری ۱۸۶۹ء سے اس پر گاڑیاں چل رہی ہیں۔ [۵۱]

دیوبند سہارنپور[۵۲] کے جنوب میں واقع ہے، اس کے جنوب میں

---

[۵۱] تاریخ سہارنپور۔ ص ۲۸۔

[۵۲] ۷۲۶ھ میں بعہد غیاث الدین تغلق ایک بزرگ شاہ ہارون چشتیؒ کے قیام سے سہارنپور کی آبادی کا آغاز ہوا، چنانچہ ابتداءً شاہ ہارون پور کے نام سے موسوم رہا، پھر رفتہ رفتہ کثرتِ استعمال سے سہارنپور ہوگیا" شہر پُر زیب" اس کا تاریخی نام ہے۔

(جغرافیہ ضلع سہارنپور ص ۹ مطبوعہ ۱۸۶۸ء)

مظفر نگر، شرق میں بجنور اور مغرب میں ہریانہ کا ضلع کرنال ہے۔

سہارنپور کے مشرق میں دریائے گنگا بہتا ہے اور مغرب میں دریائے جمنا، دیوبند ان دونوں دریاؤں کے مابین دوآبہ میں واقع ہے۔ شیر شاہ سوری (۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء - ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء) کی وہ شاہراہِ اعظم جو سنارگاؤں[1] سے رہتاس[2] گڈھ تک پھیلی ہوئی تھی، اس کی ایک شاخ دیوبند سے گذرتی ہے، یہ وہی شاہی سڑک ہے جس کی تعریف خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنے مسدّس کے اس بند میں کی ہے ؎

یہ ہموار سڑکیں یہ راہیں مصفّا — دو طرفہ برابر درختوں کا سایا
نشاں جا بجا میل و فرسخ کے برپا — سرِ رہ کنویں اور سرائیں مہیّا

واقعہ یہ ہے کہ شیر شاہ کا رفاہِ عام کا یہ تعمیری کارنامہ اپنے زمانے کے لحاظ سے عدیم المثال ہے، یہ سڑک چار مہینوں (تقریباً دو ہزار میل)

---

[1] سُنارگاؤں، یہ شہر ڈھاکہ سے ۱۵ میل کے فاصلے پر واقع تھا، یہ اس زمانے میں بڑا اہم مقام تھا، قدیم زمانے میں بنگال کا دارالحکومت رہا ہے۔

(سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم ص ۳۷۹ ر ۳۸۰)

[2] رہتاس گڑھ، کشمیر اور سرحدی علاقے کے سرکشوں کی سرکوبی کے لئے شیر شاہ نے ایک مستحکم قلعہ تعمیر کرایا تھا، یہ مقام خراسان جانے والی شاہراہ پر واقع تھا، آج کل یہ مقام مغربی پاکستان کے ضلع جہلم میں ہے۔

(تاریخ ہندوستان مؤلفہ ذکاء اللہ جلد سوم ص ۳۳۱)

کی مسافت پر پھیلی ہوئی تھی، فاصلہ بتانے کے لئے ہر کوس پر مینارہ بنا ہوتا تھا، سڑک کے دونوں جانب پھل دار درخت لگوائے گئے تھے جو مسافروں کے کام آتے تھے، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پختہ سرائیں اور کنویں بنوائے گئے تھے، سراؤں میں مسلمان اور ہندو مسافروں کیلئے الگ الگ سرکاری نوکر رہتے تھے، غریب مسافروں کو سرکار کی طرف سے کھانا مفت ملتا تھا، سراؤں میں مسجدیں بھی تعمیر کی گئی تھیں جن میں حکومت کی جانب سے امام اور مؤذن مقرر تھے [۱]

دیوبند میں اس قسم کی سرائے کے آثار اور نشانات سڑک کے کنارے اب تک موجود ہیں، مظفر نگر اور سہارنپور کے درمیان میں یہ سڑک خام تھی، ۱۹۵۳ء / ۱۳۷۱ھ سے پختہ ہو گئی ہے۔

زمانہ قدیم میں کورو اور پانڈو کی وہ عظیم جنگ جو مہابھارت کے نام سے موسوم ہے جس میدان میں لڑی گئی اس کی طویل و عریض حدود میں دیوبند کی سرزمین بھی شامل ہے [۲]

---

[۱] منتخب التواریخ عبدالقادر بدایونی ص ۹۷ و ۹۸

[۲] آرین قبیلے جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو وہ ابتداءً دریائے سندھ اور ستلج کے درمیان میں آباد تھے، لیکن جوں جوں ان کی نسلیں بڑھتی گئیں وہ رفتہ رفتہ مشرق کی جانب بڑھتے رہے، ان کے قبیلے کے قبیلے شمال مغربی مقامات سے اٹھتے اور دریائے گنگا و جمنا کے زرخیز علاقوں میں (باقی صفحہ ۴۶ پر)

کورو کی فوج کا طویل محاذ "گُٹَر بیُوہ" کے نام سے موسوم تھا، اس فوج میں پنجاب کے دستے کے علاوہ۔ ترگرت۔ جے درتھ اور بھورے وغیرہ سرداران فوج دیوبند کی مشرقی سمت میں متعین تھے اور مغربی جانب پانڈو کا محاذ جنگ قائم تھا۔

(بقیہ حاشیہ صـ۴۵) جہاں وسائل معاش کی فراوانی تھی آکر بس جاتے تھے۔ انھیں قبیلوں میں سے ایک قبیلے نے ہستناپور میں اپنی راجدھانی قائم کی، یہ مقام دہلی کے شمال مغرب میں ۶۰ میل کے فاصلے پر اب دریائے گنگا واقع تھا، ہستناپور کا ایک راجہ پانڈو گذرا ہے، اس راجہ کے پانچ بیٹے تھے جو پانڈو کہلاتے تھے یہ اپنے باپ کے انتقال کے وقت بہت کم سن تھے، اس لئے اُن کے بجائے دھرت راشٹر جو ان کا چچا تھا، حکمراں ہوا، دھرت راشٹر نے اپنے بڑے بیٹے دریودھن کو اپنی زندگی میں اپنا جانشین بناکر پانڈو کو ریاست سے محروم کردیا۔ دھرت راشٹر کی اولاد کورو کہلاتی ہے، دریودھن نے زمامِ اقتدار سنبھالنے پر پانڈو کو جلا وطن کردیا، وطن سے نکل کر یہ لوگ قنوج پہنچے، اور وہاں راجہ قنوج کی لڑکی دروپدی سے پانڈو کے ایک لڑکے ارجُن کی شادی ہوگئی، اس تعلق کے بعد راجہ قنوج کے اثر سے پانڈو اپنی آبائی ریاست کے نصف حصّے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ہستناپور کی ریاست پانڈو اور کورو میں برابر برابر تقسیم ہوگئی۔

پانڈو میں بڑا بھائی یدھشٹر راجہ قرار پایا، اس نے موجودہ نئی دہلی کے قریب اپنی راجدھانی اندرپرست کے نام سے آباد کی (بقیہ حاشیہ صـ۴۷ پر دیکھئے)

دونوں فوجوں کے مابین طویل فاصلہ حائل تھا، ایک روز پانڈو کی فوج کے مامور سردار ارجن نے ایک زبردست حملہ کیا اور کورو کی فوج کو دباتا ہوا اس مقام پر پہنچ گیا جہاں جے درتھ مامور تھا اور ایک سخت معرکہ کے بعد جے درتھ کا کام تمام کر دیا۔

(بقیہ حاشیہ ص۴۶ سے آگے) لیکن اسے زیادہ عرصے تک راج کرنے کا موقع نہ مل سکا یہ جوئے کا بہت شوقین تھا، دریودھن کے ساتھ جوئے میں اپنی ریاست کے علاوہ بیوی تک ہار بیٹھا۔ ہار کے نتیجے میں دریودھن نے یدھشٹر اور اس کے بھائیوں ارجن وغیرہ کو پھر بارہ سال کے لئے جلاوطن کر دیا، جلاوطنی کی طویل مدت گذارنے کے بعد پانڈو نے دریودھن سے اپنی سلطنت طلب کی مگر جب دریودھن نے انکار کر دیا تو پانڈو کو آخر کار جنگ کے لئے مجبور ہونا پڑا چنانچہ دونوں فریقوں کے درمیان کورکشیتر کے مشہور میدان میں ۱۸ دن تک زبردست جنگ ہوئی جو مہا بھارت کے نام سے موسوم ہے۔ کورو سردار یک ایک کر کے مارے گئے، بے اندازہ کشت وخون کے بعد آخر میں پانڈو کو فتح ہوئی اور ہستناپور کے راج پر یدھشٹر کا قبضہ ہو گیا۔

مہا بھارت کی داستان ایک رزمیہ نظم کے ذریعے سے تاریخ کے دامن تک پہنچی ہے، اہلِ تحقیق کی رائے ہے کہ اس نظم میں وقتاً فوقتاً مبالغہ آمیز اضافہ ہوتا رہا ہے، اس کے زمانۂ وقوع میں بھی مبالغے سے کام لیا گیا ہے، زمانۂ حال کے محققین کے نزدیک مہا بھارت کا زمانہ زیادہ سے زیادہ (باقی حاشیہ ص۴۸ پر)

مہابھارت کے مترجم منشی سری رام ماتھر دہلوی نے مہابھارت کے محاذِ جنگ کا جو نقشہ تیار کیا ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جے درتھ پر ارجن کا یہ حملہ دیوبند یا اس کے قرب وجوار کے راستے سے کیا گیا ہوگا۔ [۵]

دیوبند کے جنوب میں تقریباً پانچ چھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں رنٹر کھنڈی کے نام سے موسوم ہے، رنٹر کے معنی جنگ اور کھنڈ کے معنی حصّے کے ہیں، علاقے کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے جیسے بندھیل کھنڈ وغیرہ، ہو سکتا ہے کہ رنٹر کھنڈی نام ہونے کی یہی وجہ تسمیہ ہو، اور یہ نام اسی تاریخی معرکہ کی یادگار ہو۔

(بقیہ حاشیہ ص۴۷ سے آگے) ایک ہزار سال قبل مسیح ہے۔
(ماخوذ از تاریخ ہند۔ مؤلفہ سید ہاشمی فرید آبادی، جلد اول باب ۱۳ مطبوعہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن
و نیو ہسٹری آف انڈیا مؤلفہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد، مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد سنہ ۱۹۴۰ء)

[۵] تفصیل کے لئے دیکھئے نقشہ مشمولہ مہابھارت جلد چہارم ترجمہ اردو منشی سری رام ماتھر دہلوی۔
مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ۔

آبادی کا طرز

دیوبند کی آبادی کا طرز بھی قابلِ ذکر ہے، جس کی نظیر بہت کم دوسری جگہ ملے گی، یہاں کی آبادی کی تقسیم اس طرح پر ہے کہ ایک جانب مسلمان آباد ہیں اور دوسری طرف ہندو۔ درمیان میں شمالاً جنوباً ایک بازار ہے جو بمنزلۂ حدِّ فاصل کے ہے، بازار کی جانبِ مغرب مسلمان آباد ہیں، اور دوسری جانبِ مشرق میں ہندو، پھر مسلمانوں اور ہندوؤں میں ہر ایک قوم علیحدہ علیحدہ ایک جگہ آباد ہے، اگرچہ امتدادِ زمانہ اور نقلِ مکانی سے تغیّر و تبدّل ہو گیا ہے اور اب یہ حالت بہت کچھ بدل گئی ہے تاہم یہ ترتیب ابھی تک ظاہر اور محسوس ہوتی ہے، قوموں اور محلوں کی یہ ترتیب و تقسیم سلطان شہاب الدین غوری کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے، منشی نند کشور نے تاریخ سہارنپور میں لکھا ہے کہ :-

"زمینداری موضع نورپور اور چہارم قصبہ دیوبند بنام مہاجنان کے مقرر ہوئی اور گوجران قوم ہنود جو آباد تھے بباعث کاشت قصبہ دیوبند کی زمینداری میں شریک ہوئے، اور مسلمانان شیخزادہا اور ہنود نے اپنے اپنے محلے تجویز کرکے بود و باش اختیار کی، گوجروں نے جو آبادی شہر میں رہتے تھے اپنا ایک محلّہ علیحدہ کر لیا، اور جلال الدین اکبر بادشاہ کے عہد میں وہ مسلمان ہو گئے اور عہدہ چودھرائی قصبہ کا ان کے نام ہوا، ہنگام عملداری مرہٹہ در دہلیہ

چودھری صابر بخش نے بہت اقتدار پایا کہ چند مزرعہ اور قصبہ خالصہ اور چہارم مہاجنان کی زمینداری بنام اس کے ہوگئی [۱]

موجودہ آبادی ۳۶ محلوں پر منقسم ہے، ۱۹۴۶ء کے راشننگ سسٹم کے اعداد و شمار کے مطابق مکانوں کی تعداد ۵۴۰۶ ہے۔

آب و ہوا اور موسم

دیوبند کوہِ ہمالیہ کے قریب چونکہ دوآبہ (دریائے گنگا و جمنا سے سیراب ہونے والے علاقے) میں واقع ہے اس لئے یہاں کی زمین نہایت زرخیز اور سیر حاصل ہے، آب و ہوا خوش گوار اور معتدل ہے، پانی ٹھنڈا، شیریں اور ہلکا ہے، دارالعلوم دیوبند کی ایک پرانی روداد میں لکھا ہے کہ یہ قصبہ ہمیشہ سے اپنے گرد و نواح کے جملہ مقامات و دیہات میں آب و ہوا کی عمدگی اور خوبی میں مشہور ہے [۲]

جغرافیہ ضلع سہارنپور میں لکھا ہے کہ آب و ہوا اس تحصیل کی بہ نسبت اور تحصیلوں کے اچھی ہے، آب و ہوا کی یہ کیفیت اس علاقے میں نہر کے جاری ہونے سے پہلے تھی، مگر نہر کے جاری ہونے کے بعد سے آب و ہوا میں سابقہ اعتدال باقی نہیں رہا ہے [۳]

---

[۱] تاریخ سہارنپور ص ۱۶۱

[۲] روداد دارالعلوم دیوبند ۱۳۰۱ھ ص ۱۰۴

[۳] اشتہار مشمولہ روداد ۱۳۰۱ھ ص ۴

شمالی ہند کے عام موسم کی طرح وسطِ اکتوبر سے وسطِ فروری تک سردی کا موسم رہتا ہے، دسمبر اور جنوری زیادہ سردی کے مہینے ہیں، اس زمانے میں عموماً سرد ہوائیں چلتی ہیں۔ درجۂ حرارت تقریباً ۱۶ سینٹی گریڈ تک رہتا ہے، مگر کبھی کبھی ۱۰ سینٹی گریڈ تک ہوجاتا ہے۔

وسطِ فروری سے وسطِ جون تک گرمی کا موسم رہتا ہے، مئی اور جون میں گرمی خوب ہوتی ہے، گرم ہوائیں (لُوئیں) چلتی ہیں اور درجۂ حرارت ۴۵ سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔

وسطِ جون سے وسطِ اکتوبر تک برسات کا موسم رہتا ہے، بارش کے دنوں میں موسم بڑا خوش گوار ہوجاتا ہے، اس موسم میں درجۂ حرارت نسبتہً اعتدال پر رہتا ہے اور ۲۵، اور ۳۱ سینٹی گریڈ کے درمیان رہتا ہے۔

یہاں ۲۱ر جون کو سب سے بڑا دن ہوتا ہے، اس تاریخ میں ۵ بجکر ۲۳ منٹ پر آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ اور ۷ بج کر ۲۸ منٹ پر غروب ہوتا ہے، اس کے برعکس ۲۳ر دسمبر کو سب سے چھوٹا دن ہوتا ہے، اس تاریخ میں ۷ بج کر ۱ منٹ پر آفتاب طلوع اور ۵ بج کر ۲۹ منٹ پر غروب ہوتا ہے، ۲۱ر مارچ اور ۲۳ ستمبر کو دن رات برابر ہوجاتے ہیں [۱]

---

[۱] دوامی اسلامی جنتری مطبوعہ مطبع قاسمی ۱۳۳۱ھ

پیداوار

دیوبند کی زمین بہت زرخیز ہے، اس کو دریائے گنگا کا پانی نہر گنگ کے ذریعے سیراب کرتا ہے، دیوبند کے علاقے میں گیہوں، جَو، چنا، سرسوں گوجی، جوی، مٹر وغیرہ فصلِ ربیع کی خاص پیداوار ہیں۔ فصلِ خریف میں چاول جس کی بہت سی قسمیں ہیں بکثرت پیدا ہوتا ہے، ان میں بانسمتی نہایت عمدہ اور لذیذ چاول ہے۔ مکئی، جوار، باجرہ، مونٹھ، ارہر اور اُڑد بھی پیدا ہوتے ہیں، اسی فصل میں کپاس کے علاوہ گنا بھی کثرت سے پیدا ہوتا ہے، اس کی بھی بہت سی قسمیں تھیں، مگر اب عام طور پر جو گنا پیدا ہوتا ہے وہ فارم کا گنا کہلاتا ہے، یہ سابقہ گنوں کے مقابلے میں لمبا بھی زیادہ ہوتا ہے اور موٹائی بھی اس کی زیادہ ہے، مگر لطافت میں سابقہ گنے سے بہت کم ہے۔

پھلوں میں آم کو سب پھلوں پر فوقیت حاصل ہے مگر اس کے باغات اب دن بدن کم ہوتے جا رہے ہیں۔ دیسی آم کے علاوہ تخمی اور قلمی کی بہت سی اقسام ہیں۔ امرود، انار، انگور، کیلا، سنگترہ، لوکاٹ نارنگی، آلو بخارہ، ناشپاتی، لیچی، خربزہ، تربوز، پپیتا، سنگھاڑا جامن، لیموں، کٹھل، چمرخ وغیرہ بھی کم و بیش پیدا ہوتے ہیں، یہاں کا پیوندی بیر بہت مشہور ہے۔ یہ عام بیر سے بڑا اور شیریں ہوتا ہے

سبزیوں میں آلو، گوبھی، ٹماٹر، شلجم، بینگن، سویا، پالک

خرفہ، کدو، توری، بھنڈی، ٹنڈہ، چقندر، گاجر، مولی، میتھی، پیاز لہسن اور لوبیا وغیرہ وغیرہ ہیں۔

مردم شماری

جہاں تک دیوبند کی مردم شماری کا تعلق ہے، سنہ ۱۸۶۸ء / ۱۲۸۵ھ سے پہلے کا کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں ہو سکا۔ سنہ ۱۸۶۸ء / ۱۲۸۵ھ میں دیوبند کی مردم شماری ۱۴۷۲۱ تھی [۱]

سنہ ۱۹۰۱ء میں بڑھ کر ۲۰۱۶۷ ہو گئی، جس میں نصف سے زائد یعنی ۱۱۸۲۵ مسلمان تھے اور بقیہ ۸۳۴۲ غیر مسلم [۲]

سنہ ۱۹۵۱ء / ۱۳۷۰ھ کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق ۲۵۸۷۲ افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں ۱۵،۴۳۴ مسلمان اور ۱۰،۴۳۸ غیر مسلم ہیں۔

---

[۱] تاریخ سہارنپور۔ ص ۲۷

[۲] امپیریل گزیٹیر۔ جلد ۱۱ ص ۲۴۲

مسلمانوں کی آبادکاری

پہلی صدی ہجری میں عرب تاجروں کے قافلے ہندوستان آنے لگے تھے، جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں مالابار اور کالی کٹ وغیرہ میں انھوں نے سب سے پہلے قدم رکھا، ان علاقوں کی سرزمین نے ان کا خیر مقدم کیا اور وہ یہاں بسنے لگے، ان کے عمل وکردار، دیانت و امانت اور بلند اخلاقی نے وہاں کے باشندوں پر غیر معمولی اثر کیا، اور وہ ان نو واردوں سے بہت جلد مانوس ہو گئے، چوتھی صدی ہجری کے مشہور سیاح ابن حوقل نے جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کی نسبت لکھا ہے:-

"بعض علاقوں میں ایسے مسلمانوں سے بھی میری ملاقات ہوئی جن کی پارسائی اور اخلاقی برتری کا یہ حال ہے کہ غیر مسلم طبقات کے افراد عموماً اپنے مقدمات میں مسلمانوں کو اپنا گواہ مقرر کر کے حکومت کے سامنے پیش کرتے ہیں اور مقدمہ کا دوسرا فریق بھی ان کی راست بیانی پر معترض نہیں ہوتا، اور اسی کی شہادت پر مقدمہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے"[1]

---

[1] ابن حوقل ص ۲۲۸، بحوالہ ہزار سال پہلے ص ۱۵ مطبوعہ ۱۹۵۰ء

اسی زمانے میں جنوبی ہند کی ایک ریاست بلھرا کے حکمرانوں کی عمریں زیادہ ہوتی تھیں، سلیمان تاجر نے لکھا ہے کہ بلھرا والوں کا خیال ہے کہ ان کی حکومت کی مدت اور ان کی درازیٔ عمر کا سبب یہ ہے کہ وہ عربوں سے محبت کرتے ہیں [1]

تجارت کے ساتھ ساتھ یہ تاجر اسلام کی دعوت و تبلیغ کے زبردست علم بردار تھے، چنانچہ پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ "مسلمان تاجروں نے تجارت کی غرض سے زمین کی طنابیں کھینچیں، اور اپنے ہمراہ اسلام کو ان قبائل کے پاس لے گئے جو تہذیب و تمدن اور معاشرت میں ان سے فروتر تھے، تاجروں کے قافلوں نے وہ کام کیا جو ایک مستقل نظام کے ماتحت بھی انجام نہیں پا سکتا" تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کی اشاعت کبھی کسی منظم نظام کے ماتحت نہیں ہوئی، یہ صرف انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مشرق و مغرب کے ہر گوشے میں اسلام کی آواز

---

[1] سلیمان ص ۲۷، بحوالہ ہزار سال پہلے ص ۱۸ مطبوعہ ۱۹۵۰ء۔

سلیمان تیسری صدی ہجری کے اوائل کا اور ابن حوقل چوتھی صدی ہجری کے وسط کا سیاح ہے، یہ دونوں تاجر تھے، تجارت کے سلسلے میں انھوں نے دور دراز ممالک کے سفر کیے۔ سلیمان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان بھی آیا تھا، اس عہد کے دوسرے سیاحوں کی طرح ان دونوں نے بھی اپنے دورانِ سفر کے مشاہدات کو قلم بند کر لیا تھا، ان کے بیانات ہندوستان کے دورِ قدیم کے تاریخی حالات کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

پہنچ گئی، چونکہ یہ کام کسی تنظیم کے ماتحت نہیں ہوا، اس لئے جن لوگوں نے ہندوستان اور افریقہ میں اسلام کا عَلَمْ بلند کیا اُن کے کارنامے ریکارڈ میں نہ آسکے۔

بعد کی صدیوں میں جو مسلمان درّۂ خیبر کے راستے سے آئے وہ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں تک پہنچ گئے، سندھ میں بھی ان کی نوآبادیاں قائم ہوگئی تھیں، پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں شیخ ابوالحسن علی ہجویری رح (۴۰۰ھ/۱۰۰۹ء - ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) لاہور میں، اور خواجہ معین الدین چشتی رح (۵۳۷ھ/۱۱۳۲ء - ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء) اجمیر میں فروکش ہوئے اس دور کے مسلمانوں کی بادیہ پیمائی کی نسبت خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنے مسدّس میں لکھا ہے کہ ؎

وہ گنتے تھے یکساں وطن اور سفر کو ؛ گھر اپنا سمجھتے تھے ہر دشت و در کو

ہندوستان کے اطراف و جوانب میں مسلمانوں کے قافلے ساتویں صدی ہجری میں پہنچے[1] اس عہد میں عالم اسلام پر تاتاریوں کے پے در پے

---

[1] مسلمان فاتحین کے قدم اس سے بہت پہلے یہاں پہنچ چکے تھے، تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان ابراہیم بن مسعود غزنوی نے ۴۷۲ھ/۱۰۷۹ء میں ہندوستان پر حملہ کیا اور اس علاقے تک فتوحات کرتا چلا گیا جو اب سہارنپور کا ضلع کہلاتا ہے، ان دنوں یہاں خطرناک جنگل واقع تھے، یہاں سے ابراہیم درّہ کی جانب بڑھا اور اسے فتح کرلیا، ہوسکتا ہے کہ درّہ سے مراد موجودہ دہرہ دون ہو، مگر اس زمانے میں غالباً یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں ہوسکی (ملاحظہ ہو اردو ترجمہ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۷۷، ۷۸ و حواشی ۲۲، مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۳۴۴ھ - ۱۹۲۶ء

حملوں کے بعد ہندوستان کی طرف ترکِ وطن کرنے کا عام رجحان پیدا ہوگیا تھا، یہ رجحان ایران، ترکستان اور ماوراء النہر میں زیادہ تھا، ان علاقوں کا امن و امان وحشی تاتاریوں کے حملوں سے درہم برہم ہو چکا تھا، ہندوستان اس عہد میں اسلام کا سب سے زیادہ مضبوط قلعہ سمجھا جاتا تھا، تاتاریوں کا وہ سیلابِ عظیم جس نے عالم اسلام کے بڑے حصّے کو تہ و بالا کر دیا تھا جب ہندوستان کی طرف بڑھا تو اسے پے در پے شکستوں کا منہ دیکھنا پڑا غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء - ۶۸۵ھ/۱۲۸۷ء) اور اس کے بعد علاء الدین خلجی (۶۹۵ھ/۱۲۹۵ء - ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء) کے عہد میں تاتاریوں نے ہندوستان پر پانچ مرتبہ حملے کئے، مگر ہندوستان کی فوجوں نے انھیں ہر مرتبہ ایسی فاش شکست دی کہ ہمیشہ کے لئے تاتاریوں کے حوصلے پست ہو گئے۔

ساتویں صدی ہجری میں مسلمانوں کے جو قافلے ہندوستان آئے اُن کا یہاں کی حکومت نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ استقبال کیا، اور ان کی آبادکاری میں سہولتیں بہم پہنچائیں، یہاں آنے والوں میں عام مسلمانوں کے علاوہ علماء اور مشائخ کی بھی ایک بڑی تعداد تھی، اس زمانے میں عرب شام، ایران اور عراق سے مسلمانوں کے مختلف خاندان آتے اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں آباد ہوتے رہے، زبدۃ التواریخ کا بیان ہے کہ

"اس زمانے میں صدہا علماء و مشائخ وسطِ ایشیا کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر ہندوستان آرہے تھے۔ سلطان شمس الدین

التمش (۶۰۷ھ - ۶۳۳ھ / ۱۲۱۰ء - ۱۲۳۶ء) نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا، سلطان کے التفات نے مقناطیس کا کام کیا اور بہت سے مشاہیر فن اور بزرگ یہاں آکر فروکش ہو گئے [۱]

مشرق میں اسلام انہی صوفیاء کے ذریعے سے پھیلا اور اس قدر تیزی سے پھیلا کہ آج ایشیا کے بڑے بڑے ملک اسلام کی بستیاں ہیں شمالی ہند میں دوآبہ کا علاقہ عہدِ قدیم سے تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے دیوبند کی آب و ہوا چونکہ پُر فضا تھی، اس کے اطراف کی زمین نہایت زرخیز اور سیر حاصل ہے، اور چاروں سمتوں میں آم کے باغات سے گھرا ہوا تھا اس لئے مسلمانوں کے اکثر خاندانوں نے یہاں سکونت اختیار کر لی۔

دیوبند کی ایک بڑی خصوصیت اس عہد میں --- یہ بھی تھی کہ یہ ایک پرسکون مقام تھا، جہاں بیٹھ کر اہل اللہ اطمینان کے ساتھ ذکر و اذکار میں مشغول ہو سکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اکثر گم نامی پسند بزرگوں نے ادھر کا رُخ کیا اور اس طرح یہ سرزمین آہستہ آہستہ اہل اللہ کا مسکن بن گئی دیوبند ایک مردم خیز خطہ ہے، عالم اسلام کی متعدد ایسی شخصیتوں کا مرز بوم رہا ہے جن کے فیضانِ صحبت کے آثار و برکات آج تک محسوس کئے جا سکتے ہیں۔

ہندوستان کی روحانی اور اخلاقی تعمیر میں صوفیاء اور مشائخ کا

---

[۱] زبدۃ التواریخ ص ۱۱ بحوالہ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۱۱۳

کردار... بہت نمایاں رہا ہے، انھوں نے سیاست اور اقتدار کی الجھنوں سے ہمیشہ یکسو رہ کر انسانی زندگی کو فکری اور عملی تربیت دینے اور اخلاقی اور روحانی غذا بہم پہنچانے میں اپنی عمریں صرف کر دیں، ان کے کام کا دائرہ خانقاہوں اور مسجدوں کی شکل میں پھیلا ہوا تھا، جہاں بیٹھ کر وہ انفرادی طور پر علمی اور اصلاحی خدمات انجام دیتے تھے۔

ان علماء و صوفیاء نے اسلامی علوم و فنون کی اشاعت اور اخلاقی و اصلاحی تربیت کسی خاص نصب العین یا اجتماعی منصوبہ بندی کے تحت نہیں کی بلکہ وہ اس طرزِ فکر کا تقاضا تھا جو ایک سچّا مسلمان اسلام کی بنیادی ہدایت سے حاصل کرتا ہے

مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں تعلیم و تبلیغ کے سلسلے میں جانفشانیوں اور صبر آزمائیوں کی حیرت انگیز مثالیں قائم کی ہیں دیوبند میں مسلمانوں کی آمد کے متعلق تاریخ سہارنپور کے مصنّف منشی نند کشور نے ذیل کی عجیب روایت بیان کی ہے، اگرچہ اس روایت کے بعض حصّے غور طلب اور تاریخ کے لحاظ سے ناقابلِ یقین ہیں، تاہم چونکہ اس روایت سے بعض مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں اس لئے اس کو بعینہٖ نقل کر دینا مناسب ہوگا، لکھا ہے کہ:

"محمود غزنوی کا گزر جب اس طرف ہوا تب اس نے بھی اس قصبہ کی آبادی میں کوشش کی، وجہ کوشش کی یہ بیان کرتے ہیں کہ جس جگہ خیمہ بادشاہ کا نصب ہوا تھا اس جگہ زیرِ زمین سے اتفاقاً

ایک حجرہ برآمد ہوا، جس میں ایک فقیر نہایت ضعیف بیٹھا تھا، اس فقیر نے بادشاہ کو واسطے آبادی اس شہر کے ہدایت کی [1]

جب آبادی قصبہ کی زیادہ ہونے لگی تب برہمن اور مسلمان اور گوجر کثرت سے آباد ہوئے، لیکن کثرت ہونے جنگل اور حائل ہونے جھیل سے جو غرب و شمال قصبہ کے تھی، اگرچہ اب وہ آبادی میں آگئی ہے مگر نشیب و فراز اس کا نمودار ہے، قزاقوں نے اپنا مسکن اختیار کرکے تاخت و تاراج کرنا شروع کیا، بعدہٗ شہاب الدین غوری بادشاہ (سنہ ۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء سنہ ۶۰۲ھ / ۱۲۰۵ء) کے عہد میں مرزا نوربیگ و حسن بیگ و حیات بیگ قوم مغل بیگی

---

[1] تاریخ سے سلطان محمود غزنوی (سنہ ۳۸۷ھ / ۹۹۷ء - سنہ ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء) کے دیوبند آنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، البتہ سلطان محمود کے پوتے سلطان ابراہیم بن مسعود غزنوی (سنہ ۴۵۰ھ / ۱۰۵۹ء - سنہ ۴۹۲ھ / ۱۰۹۸ء) کے نواح سہارنپور تک پہنچنے کا ذکر تاریخوں میں موجود ہے، سلطان ابراہیم غزنوی نے سنہ ۴۷۲ھ / ۱۰۷۹ء میں ہندوستان پر حملہ کیا اور پاک پٹن اور ردپڑ وغیرہ کے قلعوں کو فتح کرتا ہوا سہارنپور تک کے علاقے کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا، غزنوی کی نسبت سے سلطان محمود کو چونکہ سب سے زیادہ شہرت حاصل ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ سلطان ابراہیم غزنوی سے اولاً یہ روایت منسوب ہو اور بعد میں امتدادِ زمانہ سے یہ مقامی روایت سلطان ابراہیم کے بجائے تاریخ سے ناواقفیت کے باعث سلطان محمود کی جانب منسوب کردی گئی ہو۔

ولایت سے آکے بحکم بادشاہِ مذکور اس قصبہ میں آباد ہوئے اور قزاقوں کو قتل و گرفتار کیا اور بادشاہ کے حضور میں لے گئے، روایت یہ ہے کہ وہ قزاق قوم مہاجن سے تھے اور اولاد ان کی اب تک دیوبند میں موجود ہے، جب گرفتار ہو کے بادشاہ کے سامنے گئے تب غارت گری سے عہد کیا اور سکونت کے خواستگار ہوئے، بادشاہ نے ایک موضع نورپور متصل قصبہ دیوبند واسطے سکونت کے عطا کیا، اس وقت نورپور اور قصبہ دیوبند شامل ہو کر بخوبی آباد ہوا، اور زمینداری موضع نورپور، اور چہارم قصبہ دیوبند مہاجنان مذکور کے مقرر ہوئی اور گوجران قوم ہنود جو آباد تھے بباعث کاشت قصبہ دیوبند کے زمینداری میں شریک ہوئے اور مسلمانان شیخ زادہا اور ہنود نے اپنے اپنے محلّے تجویز کر کے بود و باش اختیار کی، اور گوجران بیشتر آبادی شہر میں رہتے تھے بعدہٗ نامبردگان نے بھی اپنا ایک محلہ علیٰحدہ کر لیا اور جلال الدین اکبر بادشاہ کے عہد میں وہ مسلمان ہو گئے اور عہدہ چودھرائی قصبہ کا انکے نام ہوا۔ ہنگام عملداری مرہٹہ اور روہیلہ چودھری صابر بخش نے بہت اقتدار پایا کہ چند مزرعہ اور قصبہ خالصہ اور چہارم حصہ مہاجنان کی زمینداری بنام اس کے ہو گئی ؛ لہ

لہ تاریخ سہارنپور ص ۱۶۰ و ۱۶۱

قاضی دانیال قطریؒ[1]

تاریخ سہارنپور کے مصنف نے دیوبند میں جن لوگوں کا پہلے پہل آباد ہونا بیان کیا ہے، اب اُن کا کوئی نام ونشان باقی نہیں ہے، یہاں مسلمانوں کی آبادکاری کا سلسلہ چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں شروع ہوا حضرت خواجہ عثمان ہارونی (وفات ۶۱۷ھ / ۱۲۱۰ء) کی بیعت وخلافت سے سرفراز ہوکر دو بزرگوں نے ہندوستان کا راستہ اختیار کیا، یہاں پہنچ کر ایک بزرگ خواجہ معین الدین چشتیؒ لاہور سے اجمیر تشریف لے گئے اور دوسرے بزرگ قاضی دانیال قطریؒ نے اپنی دعوت وتبلیغ اور رشد وہدایت کے لئے دیوبند کی سرزمین کو منتخب فرمایا۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ قاضی دانیال قطریؒ کس سن میں دیوبند آئے، سلطان قطب الدین ایبک (۶۰۲ھ / ۱۲۰۶ء - ۶۰۶ھ / ۱۲۱۰ء) کی جانب سے جس زمانے میں شمس الدین التمش[2] بدایوں کا گورنر تھا اہلِ فضل وکمال کو

---

[1] قطر۔ جزیرہ نمائے عرب کے جنوب شرقی گوشے کو عُمان کہا جاتا ہے عُمان کے شمال مغرب میں جزیرہ نما کی ایک ساحلی پٹی سمندر کے اندر کچھ دور تک چلی گئی ہے جو جزیرہ نما قطر کہلاتی ہے۔ پہلے قطر ایک شہر کا نام تھا جو قطیف کے نواح میں تھا۔ مشرقِ وسطیٰ میں آج کل قطر کا شمار تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں ہوتا ہے۔

[2] سلطان شمس الدین التمش (۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء - ۶۳۳ھ / ۱۲۳۶ء) باقی حاشیہ صـ۶۳ پر ملاحظہ ہو

ڈھونڈ ڈھونڈ کر بلاتا اور ان کی حتی الامکان قدر افزائی کرتا تھا، اس نے قاضی دانیال قطریؒ کے علم و فضل کی شہرت سنی تو ان کو بدایوں آنے کی دعوت دی، شیخ جب بدایوں پہنچے تو پھر وہیں کے ہو رہے اور وہیں ان کی اولاد و احفاد کا سلسلہ چلا جو ابھی تک موجود ہے، قاضی دانیال قطری کا خاندان بدایوں کے ممتاز خاندانوں میں شمار ہوتا ہے، عرصے تک ان کے اخلاف میں علم و فضل کا چرچا باقی رہا۔

(بقیہ حاشیہ صـ۶۲ سے آگے) قرونِ وسطیٰ کی اسلامی تاریخ میں ہندوستان کا دوسرا فرماں روا تھا، اس نے چھبیس سال تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کی، اس کا عہدِ سلطنت علمی اور مذہبی حیثیت سے ایک امتیازی شان رکھتا ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے تہذیبی اور ثقافتی اداروں کی داغ بیل اسی کی کوششوں کی رہین منت ہے، علماء و فضلاء اور مشائخ کا بڑا قدرداں تھا۔

ایلتمش کو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (وفات ۶۳۳ھ / ۱۲۳۵ء) سے بڑی عقیدت تھی، اس کے عہدِ سلطنت میں دہلی میں علماء، فضلاء اور صوفیاء و مشائخ کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا، کثرت سے لوگ ترکستان، ایران اور ماوراء النہر سے ترکِ وطن کر کے ہندوستان پہنچے۔ عالم اسلام میں مغلوں کے زبردست حملوں سے بڑی تباہی پھیلی ہوئی تھی، جان و مال محفوظ نہ تھے، اس وقت ہندوستان ہی سب سے بڑا ملجا و ماویٰ تھا۔ ایلتمش نے پناہ گزینوں کی بڑی مدد اور دستگیری کی، اس کی فیاضی اور قدر دانی نے دہلی کو علماء، فضلاء اور صوفیاء و مشائخ کا مرکز بنا دیا تھا (باقی حاشیہ صـ۶۴ پر)

ملا عبدالقادر بدایونی نے بزرگانِ بدایوں کے حالات میں ایک طویل قصیدہ لکھا ہے، جس میں وہاں کے بزرگوں اور خاندانوں کا ذکر کیا گیا ہے، شیخ دانیال قطریؒ کی نسبت لکھا ہے: ؎

شیخِ عثمانی کہ بُد در پارسائی بے عدیل
نازلِ دیہہ منونہ[1]، اصل دین را اسلام

(بقیہ حاشیہ ص ۶۳ سے آگے) قاضی حمیدالدین ناگوری (وفات ۶۴۱ھ / ۱۲۰۸ء) قاضی منہاج سراج مولانا جمال الدین لسبطامی، سید نورالدین مبارک غزنوی جیسے علماء و فضلاء موجود تھے اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ جلال الدین تبریزی، شیخ بدرالدین غزنوی، اور قاضی قطب الدین کاشانی جیسے مشائخ کرام رشد و ہدایت کی مسندیں آراستہ کئے ہوئے تھے، ان علماء و مشائخ کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو بزم مملوکیہ ص ۷۰ تا ۷۸، اور سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، از خلیق احمد نظامی ص ۱۰۹ تا ۱۲۴ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۸ء

۵۴ بدایوں شمالی ہند کا مشہور شہر ہے، اسے قطب الدین ایبک نے ۵۹۱ھ / ۱۱۹۴ء میں فتح کیا، بدایوں اس وقت ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا قدیم ترین مرکز تھا، شہاب الدین غوری کی فتوحات سے قبل وہاں مسلمانوں کی نوآبادی قائم ہو گئی تھی، اور بہت سے علماء و مشائخ وہاں ارشاد و تلقین میں مصروف تھے۔ میراں ملہم شہید جو سپہ سالار مسعود غازی کے رفیقوں میں تھے وہاں کے قدیم ترین بزرگوں میں ہیں۔ قطب الدین ایبک نے ۶۰۳ھ / ۱۲۰۶ء میں التمش کو بدایوں کا حاکم مقرر کیا تھا۔ (سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات: از پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۱۰۴ و ۳۷۵)

[1] منونہ، بریلی کا ایک گاؤں ہے جو قصبہ آنولہ سے دو میل کے فاصلے پر بجانب مغرب واقع ہے۔

اکمل التواریخ میں شیخ دانیال قطری کے حسب ذیل حالات ملتے ہیں:

"چھٹی صدی ہجری کے اختتام پر سلطان قطب الدین ایبک نے ۵۹۹ھ میں قلعۂ کالنجر اور کالپی کی فتح کے بعد قلعۂ بدایوں کو فتح کیا اور یہاں مستقل اسلامی حکومت قائم کر کے گرد و نواح کے بہت بڑے علاقے کو جو زمانۂ مابعد میں علاقۂ کٹھیر کے نام سے موسوم ہوا، صوبہ بدایوں میں الحاق کیا، اور سلطان شمس الدین التمش کو یہاں کی حکومت تفویض کی گئی۔ اسی زمانے میں قاضی دانیال قطری جو نواح قطر سے ترک سکونت کر کے جیش اسلامی کے ہمراہ ہندوستان وارد ہو کر اول لاہور میں مقیم ہوئے تھے اور اس کے بعد دیوبند میں کچھ دنوں رہ کر ایک عالم کو مستفیض کر کے شہرت کامل حاصل کر چکے تھے، سلطان کی اشتیاق آفریں طلب کی بدولت ہاتھوں ہاتھ بدایوں بلائے گئے، عزت و تکریم سے خیر مقدم کر کے عظمت و وقار کی مسند پر بٹھایا، عہدۂ قضا حکومت کی جانب سے پیش کیا گیا، اس وقت سے آپ دائرۂ حکومتِ شمسی کے قاضی القضات مشہور رہے۔

قاضی صاحب ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ باطنی کمال کے دلدادہ تھے اور خواجہ عثمان ہارونی (وفات ۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء) کی جوشِ عقیدت نے سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے زمرۂ ارادت میں آپ کو داخل کر دیا تھا، آپ کے سالِ رحلت کا پتہ نہیں چلتا، مزار آپ کا پیر مکہ صاحب علیہ الرحمہ کے شرقی دروازے کے سامنے گوشۂ جنوب میں بتایا جاتا ہے، آپ کے بعد آپ کی نسل میں

علم و فضل نسلاً بعد نسلٍ اب تک چلا آتا ہے، ہمارے خیال میں یہ خصوصی شرف آپ ہی کے خاندان کو حاصل ہے کہ سات سو برس سے علم گویا میراث ہو گیا ہے۔

ہندوستان میں کوئی خاندان اہلِ علم کا ایسا نہیں سُنا جو اس قدر زمانۂ دراز سے وارثِ علم و کمال ہونے کا مدعی ہو۔ [۱]

بدایوں کے علماء میں مولانا عبدالماجد، مولانا عبدالحامد، اور مولانا عبدالقدیر کا نسبی تعلق اسی خاندان سے ہے [۲]

شیخ علاء الدین سہروردیؒ

دیوبند کے معلوم بزرگوں میں سب سے زیادہ قدیم مزار شیخ علاء الدینؒ معروف بشاہ جنگل باش کا ہے، یہ بزرگ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (وفات ۶۳۲ھ / ۱۲۳۴ء) کے خلیفہ ہیں۔ مقامی روایت ہے کہ یہ علامہ ابن جوزیؒ کے شاگرد تھے [۳] شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (وفات ۶۶۱ھ / ۱۲۶۲ء یا ۶۶۶ھ / ۱۲۶۷ء) اور شیخ سعدی شیرازی ان کے ہم درس اور پیر بھائی تھے۔

---

[۱] و [۲] اکمل التواریخ مؤلفہ مولوی محمد یعقوب بدایونی ص ۱۹-۲۲

[۳] مولانا سید محمد میاں صاحبؒ نے بھی علماء ہند کے شاندار ماضی جلد سوم میں مقامی روایت کے حوالے سے شیخ علاء الدینؒ کو علامہ ابن جوزیؒ کا شاگرد لکھا ہے مگر علامہ ابن جوزیؒ (وفات ۵۹۷ھ) اور شیخ علاء الدینؒ (وفات ۶۴۲ھ)

(باقی ص ۶۷ پر)

"تذکرۃ العابدین میں لکھا ہے :-

"شاہ علاء الدین مرید شیخ شہاب الدین سہروردی مشہور جنگل باش وفات ۱۵ شعبان ۷۴۲ھ (۱۳۴۱ء) مزار دیوبند"[1]

(بقیہ حاشیہ ص۶۶ سے آگے) کے سنین وفات میں ۱۴۵ سال کا طویل فصل واقع ہے یہ تفاوت علامہ ابن جوزیؒ سے شیخ علاء الدینؒ کے تلمذ کو مشتبہ بنا دینے والا ہے شیخ علاء الدین کا سنِ ولادت معلوم نہیں ہے، علامہ ابن جوزیؒ سے ان کے تلمذ کی ایک ہی شکل ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ ان کی عمر کم از کم ۱۶۰ سال قرار دیجائے اور ان کا سال ولادت ۵۸۲ھ کے لگ بھگ سمجھا جائے تو ان کو علامہ ابن جوزیؒ کے تلامذہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اتنی طویل عمر بہت کم ہوتی ہے مگر امکان سے خالی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ علامہ ابن جوزیؒ کے بجائے بالواسطہ ان کے کسی شاگرد سے مستفیض ہوں مگر امتدادِ زمانہ کے سبب سے کسی وقت درمیانی واسطے کو لوگ بھول گئے ہوں، اور علامہ ابن جوزیؒ کا نام، ان کی شہرت و عظمت کے باعث یاد رہ گیا ہو، اس لئے بعد میں ان کا علامہ ابن جوزیؒ کا شاگرد ہونا مشہور ہو گیا ہو۔ یہی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] تذکرۃ العابدین۔ ذکر شیخ شہاب الدین ص ۱۴۸ و ۲۶۴

شیخ علاء الدین سہروردیؒ سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء - ۷۵۲ھ ۱۳۵۱ء) کے عہد میں دیوبند تشریف لائے، دیوی کنڈ کی جانب مغرب سہارنپور مظفر نگر روڈ کے متصل آپ کا مزار زیارت گاہِ خلائق ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ سلسلۂ سہروردیہ کے مؤسس شیخ شہاب الدینؒ کے ایک فیض یافتہ کی ابدی آرام گاہ ہونے کا فخر اس سرزمین کو حاصل ہے

ایک یہ روایت مشہور ہے کہ "شیخ سعدی شیرازیؒ[1] سیاحت ہند کے دوران اپنے انہی بزرگ ساتھی سے ملاقات کے لئے دیوبند آئے تھے"

---

[1] شرف الدین نام اور سعدی تخلص ہے، وطن شیراز تھا، سال ولادت ۵۸۹ھ ۱۱۹۳ء، اور سال وفات ۶۹۱ھ ۱۲۹۱ء ہے، مدرسہ نظامیہ بغداد میں تعلیم پائی، علامہ ابن جوزیؒ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا، باطنی تعلیم شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خدمت میں رہ کر حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد عمر کا بڑا حصہ سیر و سیاحت میں بسر کیا، شیخ سعدی غزل گوئی کے امام ہیں ان کی فصاحت و بلاغت کا شہرہ ان کی زندگی ہی میں دور دراز ممالک میں پھیل گیا تھا شیخ سعدی کی تصانیف میں گلستاں و بوستاں کو بڑا قبولِ عام حاصل ہوا، ان کی گلستاں فارسی نثر کا بے مثل نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں گلستاں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ گلستاں کے اردو ترجموں میں مولوی خلیل الرحمٰن ایڈیٹر اخبار الخلیل بجنور کا کیا ہوا ترجمہ اپنی سلاست اور روانی کے لحاظ سے دوسرے تمام ترجموں پر بازی لے گیا ہے۔ شیخ سعدی اور شیخ علاء الدین سہروردیؒ دونوں

بزرگ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔

بوستاں کے آخر میں سومنات کے مندر سے واپسی پر خود شیخ نے ہندوستان سے اپنے گزرنے کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر لکھا ہے ؎

بہند آمدم بعد ازاں رُستہ خیز
وزانجا براہِ یمن تا حجیز

(میں گرتا پڑتا ہندوستان آیا، اور وہاں سے براہِ یمن حجاز چلا گیا)

اس زمانے میں ہندوستان کا اطلاق زیادہ تر نواح دہلی پر ہوتا تھا خود شیخ نے یہ نہیں بتلایا کہ وہ کہاں تک پہنچے تھے، یہ خود شیخ کا بیان ہے مگر کسی تاریخ میں ان کے ہندوستان آنے کا ذکر نہیں ملتا۔

شاہ ولایتؒ

فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء - ۷۸۹ھ / ۱۳۸۸ء) کے عہد حکومت میں شیخ شہاب الدین بخاریؒ مشہور بشاہ ولایت دیوبند تشریف لائے، شاہ ولایتؒ کو شیخ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ (۶۳۵ھ - ۷۶۵ھ) سے شرف بیعت حاصل تھا۔

تذکرۃ العابدین میں ہے :-

"شیخ شہاب الدین مشہور بشاہ ولایت صاحب، مرید جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی، مولد و مسکن شہر نجارا تھا۔ وفات ۶ ربیع الاول سنہ ۷۸۰ھ / ۱۳۷۸ء"[1]

دار العلوم کے جنوب مغرب میں آپ کا مزار پُر انوار مرجع خلائق ہے دیوبند میں آپ کا قیام محلہ ابو المعالی میں اس جگہ رہا ہے جہاں اب

---

[1] تذکرۃ العابدین ص ۲۵۱

راقم سطور کا رہائشی مکان "تعلیم منزل" واقع ہے۔

اس زمانے میں اس جگہ ہندو بڑھئی رہتے تھے، انھیں کے یہاں حضرت شاہ ولایتؒ عرصے تک مقیم رہے، وفات کے بعد بڑھیوں کا یہی خاندان نسلاً بعد نسلٍ کئی سو سال تک شاہ ولایتؒ کے مزار کی مجاورت کرتا رہا، تقریباً سو سال سے یہاں کی مجاورت مسلمانوں میں منتقل ہو گئی ہے ادھر بڑھیوں کا یہ خاندان بھی اب دوسری جگہ منتقل ہو گیا ہے۔

شیخ معز الاسلام

دیوبند کے شیوخ صدیقی کے مورثِ اعلیٰ ہیں، ان کے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے شرف صحبت سے مستفیض تھے۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے باختلاف روایت ۶۶۱ھ/۱۲۶۲ء یا ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء میں وفات پائی اس لحاظ سے شیخ معز الاسلام کو ساتویں صدی ہجری کے آخر میں سمجھنا چاہیے ان کا مزار محلہ بڑے بھائیان میں آدینی مسجد کے قریب بتلایا جاتا ہے مشہور شاعر غلام انور صابری اُن ہی کی اولاد میں سے ہیں۔

قالو قلندرؒ

ان کا سن وفات ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء ہے۔ حالات کا پتہ نہیں چلتا، قالو قلندر کا مزار تحصیل کے قریب سبزی فروشوں کے بازار میں ہے۔ ان کا ایک شعر زبان زد ہے ؎

قالو قلندر ست بدروازہ دیوبند ؛ آمندگان رحمت و باشندگانِ رنج[1]

سبزی منڈی میں ان کا مزار زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

---

[1] تذکرۃ العابدین ص ۲۷۹

شیخ ابوالوفا عثمانیؒ

دیوبند کے خاندانِ عثمانی کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ یہ شیخ جلال الدین کبیرالاولیاءؒ پانی پتیؒ کے خاندان سے ہیں، کبیرالاولیاءؒ شیخ یعقوب کی تیسری پشت میں ہیں اور شیخ ابوالوفاء عثمانی آٹھویں پشت میں ہیں۔ شیخ جلال الدین کبیرالاولیاء کا سن ولادت ۶۲۵ھ ہے۔ دونوں بزرگوں میں پانچ پشتوں کا فصل ہے۔ ماہرین انساب کے معروف طریقے کے مطابق ۵ پشتوں میں ۱۶۶ سال کا فرق ہونا چاہئے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شیخ ابوالوفاء دیوبند میں نویں صدی کے اوائل میں سکونت پذیر ہوئے ہوں گے، یہ دہلی میں خاندان تغلق کا آخری عہد تھا۔ محلہ محل میں ان کا مزار خام حالت میں ہے۔ شیخ ابوالوفاء کا سلسلۂ نسب یہ ہے:-

ابوالوفاء بن عبداللہ، بن حسین بن عبدالرزاق بن عبدالحکیم بن حسن بن عبداللہ عرف ضیاء الدین بن یعقوب بن عیسیٰ بن اسمٰعیل بن محمد بن ابوبکر بن علی بن عثمان بن عبداللہ حرمانی بن عبدالرحمٰن گازرونی بن عبدالعزیز ثالث بن خالد بن ولید بن عبدالعزیز ثانی بن شہاب الدین المعروف عبدالرحمٰن اکبر بن عبداللہ ثانی بن عبدالعزیز بن عبداللہ الکبیر بن عمرو بن امیرالمومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ [۱]

---

[۱] یہ نسب نامہ مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ کے شجرے سے منقول ہے، تذکرۃ العابدین میں بھی شیخ ابوالوفا کا نسب نامہ مرقوم ہے۔ (باقی حاشیہ ص۷۲ پر ملاحظہ فرمائیں)

شیخ عبدالرحمٰن گازرونی رح حسب روایت اقتباس الانوار مدینہ منورہ سے ترک وطن کر کے گازرون علاقہ ماوراء النہر میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہ سلطان محمود غزنوی کی فوج میں قاضی لشکر کے منصب پر مامور تھے۔

محمود غزنوی کے ہمراہ ہندوستان آئے اور پانی پت کی فتح کے بعد وہاں مقیم ہو گئے۔ شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء رح آپ کی بارھویں پشت میں اور شیخ ابوالوفا سترھویں پشت میں ہیں۔

شیخ عبدالرحمٰن گازرونی کی اولاد کا ایک سلسلہ اودھ کے مشہور مردم خیز قصبہ بلگرام میں موجود ہے۔ قاضی زادگانِ بلگرام انہی کی نسل سے ہیں[1]

شیخ ابوالوفا عثمانی رح کی اولاد میں اللہ نے بڑی برکت دی، دیوبند کے تمام عثمانی شیوخ انہی کی اولاد میں ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سے آگے) مگر اس میں عبدالحکیم بن حسن کے بعد سے علی بن عثمان تک ۸ پشتیں درج نہیں ہیں، اس شجرے کے لحاظ سے حضرت عثمان سے شیخ ابوالوفا تک ۱۸ پشتیں ہوتی ہیں، اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے شجرے کی رو سے ۲۶ پشتیں ہوتی ہیں، ماہرین انساب کے اصولِ موضوعہ کے مطابق ایک صدی میں تین پشتیں ہونی چاہئیں شیخ ابوالوفا چونکہ نویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں اس لئے ۹ صدیوں میں ۲۷ پشتیں ہونی چاہئیں۔ البتہ ایک دو پشتوں کی کمی بیشی لائق اعتنا نہیں سمجھی جاتی، اس اصول کے مطابق تذکرۃ العابدین کا شجرہ جس میں صرف ۱۸ پشتیں مذکور ہیں صحیح نہیں ہے۔

[1] عیون المعارف مؤلفہ محمد عالم قیصری ص ۱۲

شیخ ابوالوفا عثمانیؒ کی اولاد میں دیوان لطف اللہ ایک مشہور شخصیت گزری ہے۔ یہ شاہجہاں (۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۸ء - ۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۸ء) کے عہد میں دیوان کے عہدے پر فائز تھے۔ دیوبند میں ایک عظیم الشان محل ان کی یادگار ہے جس کا اب صرف پرشکوہ دروازہ اور دونوں جانب کی برجیاں اور جنوب و مغرب کی دیواروں کا کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے اندر کی عمارتیں تقریباً ختم ہو چکی ہیں۔ دیوان لطف اللہ کے دیوان خانہ کی جگہ پر اب دارالعلوم کے عظیم الشان مہمان خانہ کی دو منزلہ عمارت بن گئی ہے۔

دیوان لطف اللہ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:-

دیوان لطف اللہ بن خواجہ اویس بن مولانا احمد بن مولانا عبدالرزاق بن مولانا محمد حسن مدرس بن خواجہ حبیب علی بن خواجہ عثمان بن علی بن قاضی شیخ محمد بن قاضی فضل اللہ شیر بن شیخ ابوالوفا عثمانی [1]

اسی خاندان کے ایک بزرگ شیخ عبدالرحمٰن بن شیخ چندا عثمانی کے اہتمام میں عہد اورنگ زیب کی مسجد تعمیر ہوئی۔ مسجد کے کتبہ میں ان کا نام کندہ ہے۔ مسجد کا سن تعمیر ۱۰۷۸ھ / ۱۶۶۷ء ہے۔

قاضی فضل اللہ شیرؒ بھی اس خاندان میں ایک نامور بزرگ گزرے ہیں۔ اپنے زمانے میں دیوبند کے قاضی تھے، قاضی مسجد انھیں کی تعمیری یادگار ہے۔ ایک جنگل "قاضی فضل اللہ شیر کی بنی" بھی ان کے نام پر موسوم ہے۔

---

[1] شجرہ قلمی، تیار کردہ دفتری نورالحق مرحوم

دیوان لطف اللہؒ کی اولاد میں شیخ کرامت حسین اور ان کے فرزند شیخ نہال احمد (وفات ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) اپنے زمانے میں دیوبند کے سربرآوردہ لوگوں میں رہے ہیں۔ شیخ نہال احمد دارالعلوم کی پہلی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔

مولانا ظفر احمد تھانوی اگرچہ تھانہ بھون کی نسبت سے مشہور ہیں مگر اصلاً دیوبند کے رہنے والے اور دیوان لطف اللہؒ کے خاندان سے ہیں یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ظفر احمد تھانوی کا سلسلۂ نسب دیوان لطف اللہؒ تک پیش کر دیا جائے، تاکہ موجودہ دور تک اس خاندان کا شجرہ پورا آجائے۔ شجرہ یہ ہے:-

مولانا ظفر احمد تھانوی بن لطیف احمد بن نہال احمد بن کرامت حسین بن بنی بخش بن حیات اللہ بن عنایت اللہ بن لقاء اللہ بن احسان اللہ بن نصیر اللہ بن دیوان لطف اللہ[۱]

سید احمد شہید (۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) جب اپنی تحریک جہاد کے سلسلے میں دورہ کرتے ہوئے دیوبند تشریف لائے تو اس خاندان کے متعدد حضرات سید صاحبؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے، چند حضرات نے سید صاحب کی معیّت اختیار کر لی اور متعدد جنگی معرکوں میں حصہ لیا ان سب کا ذکر ایک مستقل عنوان کے تحت آگے آئے گا۔

---

[۱] شجرہ قلمی تیار کردہ دفتری نورالحق مرحوم

اس خاندان میں ایک بزرگ شیخ ابو البرکات گزرے ہیں۔ جہاں ان کا خاندان آباد ہے وہ محلہ انہی کے نام پر ابو البرکات کہلاتا ہے شیخ کی یادگار میں ایک مسجد بھی ہے جو سفید مسجد کہلاتی ہے۔ شیخ ابو البرکات کا مزار دیوبند کے شمالی جانب سہارنپور، مظفر نگر روڈ کے قریب ہے۔

شیخ ابو البرکات کا نسب نامہ یہ ہے:-

ابو البرکات بن مخدوم شیخ بڑے بن ابو الحسن بن محمد ابراہیم بن فضل اللہ شیر بن شیخ ابو الوفا [1]

شیخ ابو البرکات کے ایک فرزند کریم الدین تھے، انھوں نے اپنے صاحبزادہ غلام ابو سعید کے لئے مثنوی مولانا رومؒ کا ایک انتخاب کیا ہے جو ۱۷ ۶۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ آخر میں کچھ اوراد و وظائف اعمال اور نسخے جات شامل ہیں، یہ انتخاب غیر مطبوعہ ہے، اس کا مخطوطہ بصورت بیاض ۲۰ ربیع الاول ۱۱۴۴ھ کا لکھا ہوا ہے [2]

آخری دور میں بھی اس خاندان میں نامور علماء و مشائخ گزرے ہیں جو آسمان علم و ہدایت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے، انھوں نے اپنے علم و فضل اور رشد و ہدایت سے دنیائے علم و تصوف کو منور کیا ہے۔

---

[1] شجرہ قلمی تیار کردہ دفتری نور الحق مرحوم

[2] مکتوب محمد ایوب قادری مترجم تذکرہ علمائے ہند وغیرہ بنام راقم سطور مورخہ ۱۸ اگست ۱۹۵۹ء

مولانا فرید الدین ؒ اپنے زمانے کے جیّد عالم تھے، دہلی میں تحصیل علم کی تھی، ساری عمر درس و تدریس میں مشغول رہے شیخ باذبخت ان کے چھوٹے بھائی تھے، ان کا ذکر آگے آئے گا۔

مولانا رفیع الدین ؒ :- وفات (۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء) حضرت شاہ عبد الغنی محدث دہلوی ؒ (۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۸ء) کے مخصوص خلفاء میں تھے، اپنے زمانے کے اولیائے کاملین میں ان کا شمار ہوتا تھا، اسی کے ساتھ انتظامی امور کا زبردست ملکہ حاصل تھا۔ عرصے تک دار العلوم کے مہتمم رہے، آپ کے زمانے میں دار العلوم نے بڑی ترقی کی، مدینہ منورہ میں انتقال ہوا، اور وہیں جنۃ البقیع میں آپ کی قبر ہے۔

ملا محمود :- (وفات ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء) علوم حدیث و فقہ کے فاضل استاد تھے، میرٹھ کے مطبع ہاشمی میں ملازم تھے، چھتہ کی مسجد میں جب اولاً دار العلوم قائم ہوا تو اس کی مدرسی کے لئے حضرت نانوتویؒ کی نظرِ انتخاب جس پر پڑی وہ یہی ملا محمود تھے، یہ دار العلوم کے سب سے پہلے مدرس ہیں، حضرت شیخ الہندؒ نے چھتہ کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے انہی سے سب سے پہلا سبق پڑھا تھا۔ حضرت تھانویؒ کے مندرجہ ذیل اشعار سے ان کے علم و فضل کا اندازہ ہوتا ہے ؎

در حدیث و فقہ و تفسیر و اصول — شہرتے کامل بدارد در فحول

زلیعی و لوذعی دریائے علم — منبعِ خلق و تواضع کانِ علم

برزبانش ہست مضمون کتاب ؎ ہست تقریرش چو بارندہ سحاب[1]

مولانا فصیح الدین:- دہلی میں حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے تحصیل علم کی۔ حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ (المتوفی ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء) سے شرف بیعت حاصل تھا، تعلیم سے فراغت کے بعد محکمۂ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء میں محکمۂ تعلیم کی فرمائش پر ضلع سہارنپور کا جغرافیہ لکھا جو اس ضلع کا غالباً سب سے پہلا جغرافیہ ہے۔ جغرافیہ کے آخر میں میر تفضل حسین سعید امروہوی کا مندرجۂ ذیل قطعۂ تاریخ درج ہے ؎

حکم ٹی، بی، کین صاحب سے مرتب جب کیا
خوب مولانا فصیح الدین نے یہ جغرافیہ
کچھ تامل کر کے یوں بولا سعید خوش بیاں
کہہ اٹھارہ سو چھیاسٹھ سن ہوا یہ مادّہ

۱۲ ۸۲ ھ

سالِ ہجری معنوی اور عیسوی الفاظ میں
اور اگر سمبت کو پوچھو، خوب ہے جغرافیہ

۱۹۲۲ سمبت

اس قطعۂ تاریخ میں دلچسپ معنویت یہ ہے کہ اس کے چوتھے مصرع کے الفاظ میں تو ۱۲۸۲ھ نظم کیا گیا ہے مگر اس مصرع کے حروف

---

[1] شنوی زیر دیم بحوالہ "القاسم" دارالعلوم نمبر محرم ۱۳۴۷ھ ص ۴۰

"کہہ اٹھارہ سو چھیاسٹ سن" کے اعداد سے بحساب جمل ۱۲۸۲ھ نکلتا ہے تیسرے شعر کے پہلے مصرع "سال ہجری معنوی اور عیسوی الفاظ میں" اس کا واضح اشارہ موجود ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی ابتدائی سالوں کی رودادوں میں مولانا فصیح الدینؒ کی دارالعلوم کو دی ہوئی متعدد کتابوں کے نام درج ہیں، مولانا مرحوم راقم سطور کی والدہ کے نانا تھے، ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء میں وفات پائی۔

حافظ لطافت علی :- (وفات ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء) مجذوب صفت بزرگ تھے، سہارنپور کے قریب شیخپورہ میں مدفون ہیں، ان کی سوانح حیات تذکرۂ حافظ کے نام سے مولانا محمد نعیم صاحب نے لکھی ہے۔

مولوی عظمت علیؒ :- (وفات ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء) حافظ لطافت علیؒ سے خلافت حاصل تھی، یہ بھی مجذوب صفت تھے، دارالعلوم کے متصل جانب شمال ان کا مزار ہے۔

مولانا ذوالفقار علی :- شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ (والد مولانا محمود الحسنؒ) کے والد ماجد تھے، دہلی کالج میں حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی (وفات ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء) سے پڑھا، فراغت کے بعد بریلی کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے چند سال کے بعد محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر ہو گئے، عربی زبان و ادب پر بڑی دسترس تھی، دیوان حماسہ کی شرح تسہیل الدراسہ، دیوان متنبّی کی شرح تسہیل البیان، سبعۂ معلقہ کی شرح التعلیقات علی السبع المعلقات، قصیدہ بانت سعاد کی شرح ارشاد اور قصیدۂ بردہ

کی شرح عطر الوردہ، اردو میں تحریر فرمائیں۔ معانی وبیان میں تذکرۃ البلاغت اور ریاضی میں تسہیل الحساب ان کی یادگاریں ہیں۔

۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء میں عربی زبان میں ایک مختصر رسالہ الہدیۃ السنیۃ فی ذکر المدرسۃ الاسلامیۃ الدیوبندیہ کے نام سے لکھا ہے، جس میں بزرگانِ دار العلوم کے اوصاف وکمالات اور سرزمینِ دیوبند کی خصوصیات پر بڑے لطیف اور ادیبانہ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

مولانا ذوالفقار علیؒ کے متعلق گارساں دتاسی لکھتا ہے :۔

" وہ دہلی کالج کے طالب علم تھے، چند سال کے لئے بریلی کالج میں پروفیسر ہو گئے، ۱۸۵۷ء میں میرٹھ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے ٹیلراں سے واقف تھے، ان کا بیان ہے کہ ذوالفقار علی ذہین اور طبّاع ہونے کے علاوہ فارسی اور مغربی علوم سے بھی واقف تھے، انھوں نے اردو میں تسہیل الحساب کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو بریلی میں ۱۸۵۲ء میں چھپی ہے[1]

مولانا ذوالفقار علی پنشن پانے کے بعد دیوبند میں آنریری مجسٹریٹ رہے، دار العلوم دیوبند کے اوّلین بانیوں میں سے تھے۔ ۴۰ سال تک دار العلوم کی مجلسِ شوریٰ کے رکن رہے، ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں بعمر ۸۵ سال انتقال ہوا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پہلو میں جانبِ شرق ان کی قبر ہے، ان کی بائیں جانب مولانا محمد احسن نانوتوی مدفون ہیں،

مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ کے ایک شعر سے اس کی دلچسپ نشاندہی

---

[1] بحوالہ مولانا محمد احسن نانوتویؒ ص ۲۷

ہوتی ہے، شعر یہ ہے ؎

ہاں بخُسپ آسودہ تر، مابین دو یارانِ خویش
قاسمِ بزمِ مودّت، احسنِ شائستہ خو

مولانا فضل الرحمٰن عثمانی:۔ (وفات ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء) دار العلوم دیوبند کے بانیوں میں سے تھے، مجلسِ شوریٰ کے آخر عمر تک رکن رہے، دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی، فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر تھے، متعدد نظمیں قصیدے اور مرثیے وغیرہ ان کے ذوقِ شعری کے آئینہ دار ہیں۔

مولانا منفعت علیؒ:۔ (۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء) حضرت تھانویؒ کے اساتذہ میں سے تھے۔ ایک کتاب فرائض اردو کے مصنف ہیں، کانپور میں انتقال ہوا۔

مولانا ناظر حسن:۔ (وفات ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء) مشہور عالم تھے، مدرسۂ عالیہ ڈھاکہ کے پرنسپل رہے، مسئلہ قرأت خلف الامام پر ان کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ:۔ (وفات ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، دار العلوم کے شیخ الحدیث رہے، متعدد کتابوں کے مصنّف ہیں، شاہ عبد القادر دہلویؒ کے ترجمہ قرآن کی تہذیب کی، ہندوستان کی آزادی کے لئے ایک خفیہ جماعت قائم کی تھی، جو تاریخ ہند میں "ریشمی خطوط کی تحریک" کے نام سے متعارف ہے اس جرم میں چار سال تک بحرِ روم کے جزیرۂ مالٹا میں نظر بند رہے،

تفصیلی حالات دارالعلوم کے ضمن میں پیش کئے گئے ہیں۔

حبیب حسن وحشی: (وفات ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۵ء) باکمال شاعر تھے، ان کا کلام دست بردِ زمانہ سے ضائع ہو گیا، علامہ تاجور نجیب آبادی کو وحشی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن: (وفات ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء) دارالعلوم دیوبند میں مفتیٔ اعظم رہے، صاحبِ درس و تدریس ہونے کے علاوہ ولیٔ کامل اور عارف باللہ بزرگ تھے، حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ سے خلافت حاصل تھی، ان کے لکھے ہوئے فتاویٰ کے عظیم الشان ذخیرے کو پہلے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے مرتب کر کے ۸ جلدوں میں شائع کیا بعد ازاں دارالعلوم سے یہ فتاویٰ از سرِ نو مرتب کر کے شائع کئے جا رہے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (وفات ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء) عربی نثر و نظم میں کمال حاصل تھا، عربی ادب اور تاریخ سے خاص ذوق تھا، قصیدہ لامیۃ المعجزات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں تقریباً تین سو اشعار پر مشتمل ہے، اردو میں اشاعت اسلام اور تعلیمات اسلام ان کی بڑی قابلِ قدر تصانیف ہیں، دانش و تدبیر میں مشہور زمانہ تھے، دارالعلوم کے عرصے تک نائب مہتمم رہے۔

مولوی نذیر احمد: (وفات ۱۳۸۵ھ / ۱۹۳۷ء) حاجی محمد عابدؒ سے خلافت حاصل تھی، مشائخ کے حالات میں تذکرۃ العابدین کے نام سے ایک کتاب

لکھی ہے، جس میں اپنے مرشد کے حالات لکھنے کے علاوہ سلاسلِ اربعہ کے مشائخ کے مختصر مختصر حالات جمع کر دیئے گئے ہیں۔

مولانا محمد صدیق:- (۱۲۷۹ھ - ۱۳۶۱ھ / ۱۸۶۲ء - ۱۹۴۲ء) جیّد عالم تھے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ صدر مدرس دار العلوم نے ان کی سند میں لکھا ہے "استعداد درست، مناسبت تام، ذہن عمدہ، طبع مناسب اور فکر مستقیم رکھتے ہیں، زمانۂ طالب علمی میں اکثر اوقات طلبار کی درس و تدریس میں مشغول رہے" تعلیم اگرچہ دار العلوم دیوبند میں پائی، مگر حدیث کی تکمیل حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ (وفات ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء) سے کی، اس طرح ایک واسطے سے حضرت شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا، کانپور، مراد آباد اور دہلی کے مدارس میں صدر المدرسین رہے، مراد آباد میں وفات پائی، ان کے فرزند ماسٹر محمد طیب عثمانی انگریزی ادب اور ریاضی کے ماہر اساتذہ میں سے ہیں، ماسٹر صاحب کے فرزند ابو النصر صدیقی پاکستان میں واٹر لیس چیف انجینیر ہیں۔

مولانا محمد صدیق صاحبؒ سے راقم السطور کو صرف، نحو، ادب اور طب کی ابتدائی کتابوں میں شرفِ تلمذ حاصل ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ:- (۱۳۶۹ھ / ۱۹۴۹ء) قاسمی علوم کے زبردست شارح، اردو زبان کے بلند پایہ مصنف اور عدیم النظیر خطیب تھے متعدد کتابیں ان کی تصنیفی یادگار ہیں۔ عربی زبان میں صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم کے نام سے لکھی ہے، حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن پر

تفسیری حواشی لکھے ہیں، دار العلوم میں صدر مہتمم رہے، اور جامعہ ڈابھیل میں شیخ الحدیث کی مسند پر فائز رہے، آخر میں پاکستان چلے گئے تھے وہاں شیخ الاسلام کے لقب سے مشہور ہوئے۔

مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی:۔ (سابق ریاست حیدرآباد دکن کے ورنگل کالج میں دینیات کے پروفیسر رہے ہیں تفسیر فیض الرحمٰن اور سیرت نبوی میں پیغمبر انسانیت ان کی تصنیفی یادگار ہیں۔

مولانا مطلوب الرحمٰن رم (صاحب بیعت وارشاد بزرگ تھے، حضرت شیخ الہندؒ سے خلافت واجازت حاصل تھی۔

مولانا محمد مبین خطیب:۔ مدتوں (انبالہ کے مدرسہ میں صدر مدرس اور مہتمم رہے، دیوبند کی عیدگاہ کے خطیب تھے، حضرت شیخ الہندؒ کے ریشمی خطوط کی تحریک میں یہ بھی شامل تھے۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی:۔ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ کے خلف اکبر ہیں، عرصے تک دار العلوم دیوبند اور جامعہ ڈابھیل میں مدرس اور مفتی رہے۔ ۱۹۳۸ء میں ندوۃ المصنفین کے نام سے دہلی میں ایک تصنیفی ادارہ قائم کیا، اس ادارے سے دینی علمی، تاریخی اور ادبی موضوعات پر اب تک ایک سو سے زیادہ بلند پایہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ندوۃ المصنفین نے تاریخ، حدیث، تفسیر اور سیاسیات پر

جو گراں قدر علمی ذخیرہ فراہم کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے، مفتی صاحب بالغ نظر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسیات میں بھی ممتاز مقام رکھتے ہیں، مدتوں جمعیۃ علماء ہند کی قائدانہ خدمات انجام دی ہیں، اب مسلم مجلس مشاورت کی صدارت پر فائز ہیں، اور دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں

مولانا ظفر احمد :۔ تھانہ بھون کی نسبت سے تھانوی مشہور ہیں، مگر اصل وطن دیوبند ہے، دیوان لطف اللہ کی اولاد میں سے ہیں، تھانہ بھون اور سہارنپور میں علوم کی تکمیل کی، مختلف مدارس عربیہ میں صدر مدرس رہ چکے ہیں۔ آج کل سندھ کے ایک مدرسہ ٹنڈو الٰہ یار میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہیں، ایک عرصے تک حضرت تھانوی رح کی خدمت میں رہ کر تصنیف و تالیف کا کام بھی انجام دے چکے ہیں، علمی دینی اور سیاسی حیثیت سے علماء کی جماعت میں نمایاں مقام رکھتے ہیں ان کے صاحبزادے مولانا عمار احمد بھی علوم دینیہ کے فاضل اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب :۔ عرصے تک دار العلوم دیوبند میں مدرس اور صدر مفتی کے منصب پر فائز رہے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ فتاویٰ دار العلوم کے نام سے ۸ جلدوں میں دار الافتاء دار العلوم کے فتاویٰ مرتب کر کے شائع کئے ہیں، ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے، وہاں کراچی میں دار العلوم کے نام سے انھوں نے بڑے پیمانے پر ایک دینی درس گاہ قائم کی ہے، پاکستان میں ان کو مفتی اعظم

کی حیثیت حاصل ہے۔

مولانا محمد متین خطیب :۔ عرصے تک انبالہ چھاؤنی میں درس وتدریس کا مشغلہ رہا، ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے، وہاں کراچی میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں

مولانا محمد عثمان :۔ دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہیں اور مدت سے دیوبند میونسپل بورڈ کے چیئرمین ہیں۔ ان کی چیئرمینی کے زمانے میں دیوبند میں بڑے بڑے تعمیری کام انجام پائے، سینیٹیڈ سڑکوں کی تعمیر، گلیوں میں اینٹوں کے پختہ فرش، روشنی اور صفائی وغیرہ کے انتظامات ان کے لائق تحسین کارنامے ہیں، سیاسی لحاظ سے دیوبند کی لیڈرشپ انہی کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔

مولوی محمد تقی :۔ ذی استعداد نوجوان عالم ہیں، دارالعلوم کراچی میں مدرس ہیں، ماہنامہ "البلاغ" کراچی کے مدیر ہیں، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی کتاب اظہار حق کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور اس پر ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے، ردِّ عیسائیت میں یہ ایک اہم کتاب ہے اس کتاب کے ترجمے متعدد یورپی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

مولانا عامر عثمانی :۔ دارالعلوم کے فاضل ہیں "تجلی" کے نام سے ایک کامیاب ماہنامہ نکال رہے ہیں، شاعر ہونے کے علاوہ لائق صحیفہ نگار بھی ہیں، ان کی تحریروں میں بڑی شگفتگی ہوتی ہے

حسن خاں :- نویں صدی ہجری کے اواخر میں جون پور کے خود مختار فرماں روا سلطان حسین[1] شرقی کے غالباً بھائی حسن خاں کو دہلی کے لودھی حکمران کی جانب سے دیوبند کا حاکم بنا کر بھیجا گیا، حسن خاں نے

---

[1] سلطان فیروز تغلق کا لڑکا محمد جب باپ سے خفا ہو کر دہلی سے فرار ہوا تو چار شخصوں نے دشت نوردی میں اس کا ساتھ دیا، محمد جب ۷۹۱ھ/۱۳۸۸ء میں بادشاہ ہوا تو اس نے ان چاروں رفیقوں کو بڑے بڑے منصب عطا کئے۔ ملک سرور خواجہ سرا کو خواجہ جہان کا خطاب دے کر وزیر سلطنت بنایا۔ ظفر خاں کو مظفر خاں کا خطاب دے کر گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا۔ خضر خاں کو ملتان اور دلاور خاں غوری کو مالوہ کی گورنری پر مامور کیا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ محمد کے ان چاروں رفیقوں نے حق ولی نعمت فراموش کر کے اپنی اپنی خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ خواجہ جہان نے جون پور پر قبضہ کر کے ۸۰۲ھ/۱۳۹۹ء میں سلطنت شرقی کی بنیاد ڈالی، جہاں ۸۰ برس تک شرقی بادشاہوں کی حکومت رہی ۸۸۳ھ/۱۴۷۸ء میں سلطان بہلول لودھی کے ہاتھوں سلطنت شرقی کا چراغ گل ہو گیا، جون پور کے بادشاہوں میں ابراہیم شرقی کے زمانے میں اس سلطنت نے بڑی ترقی کی، ایک عالیشان مسجد تعمیر کی، اس کے زمانے میں علم کا بڑا چرچا رہا، بڑے بڑے علماء اس کے دربار میں جمع ہو گئے، درس و تدریس کا بازار گرم ہو گیا، مدارس قائم ہوئے، جون پور کا مدرسہ عرصے تک مشہور رہا، شیر شاہ سوری نے یہیں تعلیم پائی تھی۔

اپنے زمانے میں پختہ اینٹوں کا ایک قلعہ تعمیر کرایا اور حسن گڈھ نام رکھا، ابوالفضل نے آئین اکبری میں قلعہ کی نسبت لکھا ہے کہ پختہ اینٹوں کا بنا ہوا ہے اور اس میں ۶۰ سوار اور تین سو پیادوں کی فوج رہتی ہے [1]

قلعہ کے متصل سلطان سکندر لودھی [2] (۸۹۴ھ - ۹۲۳ھ / ۱۴۸۸ء - ۱۵۱۷ء) کے عہد کی ایک جامع مسجد اب تک موجود ہے۔ مسجد میں کتبہ لگا ہوا ہے جس میں سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں مسجد کا تعمیر ہونا بتلایا گیا ہے کتبے میں مسجد کے تعمیر کرانے والے کا نام اکرم میاں فیروز ملک محمد لطف اللہ افغان مرقوم ہے۔ یہ جامع مسجد ۹۱۰ھ / ۱۵۰۴ء کی تعمیر ہے۔

اگرچہ حسن خاں کی نسبت یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ پٹھان تھے، مگر ہو سکتا ہے کہ وہ بھی محمد لطف اللہ افغان کی طرح پٹھان ہوں اور یہی لوگ دیوبند کے پٹھانوں کے مورث اعلیٰ ہوں، چنانچہ قلعہ کے اطراف میں آج بھی پٹھانوں کی آبادی ہے، حسن گڈھ کے متصل ہی ایک محلہ پٹھان پورہ کے نام سے موسوم ہے، دیوبند میں پٹھانوں کی خاصی بڑی آبادی ہے مگر ان کے تاریخی حالات کا پتہ نہیں چلتا۔

---

[1] ترجمہ آئین اکبری جلد اول حصہ دوم مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ص ۹۹۹

[2] سکندر لودھی کے دور حکومت کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے زمانے میں ہندوؤں نے فارسی زبان سے اپنا رشتہ قائم کیا اور پھر جلد ہی اس قدر ترقی کر لی کہ اس زبان میں شعر و شاعری کرنے لگے اور مسند درس پر بیٹھ گئے (تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۸۷ و خافی خاں جلد اول ص ۳۲۳

دیوبند کی قدیم مسجدوں میں قلعہ کی یہی ایک ایسی مسجد ہے جس میں کتبہ لگا ہوا ہے، جامع مسجد ہونے کے باوجود اس کے دالان میں پچاس نمازیوں سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے تک دیوبند میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم تھی، اس مسجد کے بعد جو مسجدیں تعمیر ہوئیں وہ نسبتہً وسیع ہوتی چلی گئی ہیں جس سے رفتہ رفتہ مسلمانوں کی آبادی میں اضافے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ سہارنپور میں لکھا ہے کہ شاہجہاں (۱۰۳۷ھ - ۱۰۶۸ھ / ۱۶۲۸ء - ۱۶۵۸ء) کے زمانے میں یہاں کی آبادی میں اضافہ ہوا[۱]

مسجد قلعہ کے قدیمی زمانے میں جو مسجدیں تعمیر ہوئیں ان میں بھی کچھ زیادہ وسعت نہیں ہے، چھتہ کی مسجد، خانقاہ کی مسجد اور گوجر واڑے کی مسجد حالانکہ جامع مسجدیں ہیں مگر زیادہ سے زیادہ ان میں پچاس ساٹھ نمازیوں کی گنجائش ہے۔ خانقاہ کی مسجد جلال الدین اکبر (۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء - ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء) کے عہد کی تعمیر ہے، اور گوجر واڑے کی مسجد نور الدین جہانگیر (۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء - ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء) کے زمانے میں تعمیر ہوئی، البتہ آدینی مسجد ان مسجدوں کے مقابلے میں زیادہ کشادہ ہے۔

آدینی مسجد کے زمانۂ تعمیر کا پتہ نہیں چلتا، مگر اس کے طرز تعمیر سے دسویں صدی ہجری کی تعمیر کا اندازہ ہوتا ہے۔

---

[۱] تاریخ سہارنپور ص ۱۱۲

شیخ جیاؒ، صاحبِ خانقاہ: - جلال الدین اکبر کے ابتدائی عہدِ سلطنت میں یہ بزرگ دیوبند تشریف لائے، ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اجمیر سے دہلی آئے اور چند روز وہاں قیام فرمایا، اکبر کو ان سے عقیدت ہوگئی، اس نے حکم دیا کہ شیخ جہاں قیام کرنا پسند کریں وہاں ان کی حسب منشاء انتظام کر دیا جائے، شیخ جیاؒ نے دیوبند کے قیام کو پسند کیا، اکبر کے حکم کے مطابق مرزا بیگ ابن خواجہ محب علی بخشی نے شیخ کے لئے مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی[1] مسجد کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۶۵ھ/۱۵۵۷ء میں مسجد تعمیر ہوئی ہے۔

مولانا فضل اللہؒ، خطیبِ عیدین: - دسویں صدی ہجری کے اوائل میں صدیقی شیوخ کا ایک خاندان ٹونک (راجستھان) سے آکر یہاں آباد ہوا، ٹونک کی نسبت اس قدر قوی ثابت ہوئی کہ اسکی قومیت کا جزو لاینفک بن گئی، اور اب تک اس خاندان کے افراد ٹانک کہلاتے ہیں اور اسی نسبت سے جہاں ان کی آبادی ہے وہ جگہ محلہ ٹانکان کہلاتی ہے، اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ مولانا فضل اللہؒ خطیب تھے، ان کو مغل حکومت کی جانب سے دیوبند میں عیدین کی خطابت کا منصب تفویض ہوا تھا، اکبر بادشاہ کی جانب سے مولانا فضل اللہؒ کو خطابت عیدین کی خدمت کے لئے مدد معاش

---

[1] ماخوذ از اشتہار برائے مرمت مسجد خانقاہ مورخہ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند۔

کا جو شاہی فرمان جاری کیا گیا اس میں لکھا ہے:-

"چوں صلاح آثار مولانا فضل اللہ خطیب عیدین و مولانا اسمٰعیل وغیرہم جماعت صلحار از نظر اشرف اقدس گزشتند، شمہ از الطاف بادشاہی شامل حال مشارٌ الیہم شدہ، فرمانِ عالی شان واجب الاطاعت والاذعان از مخزن الطاف بیکراں شرف صدور غرور دیافت کہ موازی نہصد ہفتاد پنج بیگہ زمین بگزِ الٰہی از قرار مناصفہ مزروع و افتادہ در پرگنہ دیوبند حسب الضمن از ابتدائے فصل خریف ایں سال بتفویض خدمات در وجہ مدد معاش آنہا مقرر شد۔"[1]

ابوالفضل نے آئین اکبری میں عہد اکبری کے علمار و مشائخ کی جو فہرست دی ہے اس میں ایک نام مولانا اسمٰعیل لکھا ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ یہی مولانا اسمٰعیل ہوں جن کا نام اکبر کے اس فرمان میں لکھا ہوا ہے۔[2]

---

[1] اکبر کے اس فرمان پر ماہ مہر الٰہی سنہ ۴۳ جلوس تحریر ہے، ہجری تقویم سے اسکی مطابقت سنہ ۱۰۰۱ھ / ۱۶۰۱ء سے ہوتی ہے، اس فرمان کی جو مصدقہ نقل سنہ ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء میں کلکٹری سہارنپور سے حاصل کی گئی ہے وہ حاجی محمد طیب صدیقی قاسمی کلاتھا سٹور دیوبند کے پاس محفوظ ہے، مندرجہ بالا اقتباس اسی نقل سے ماخوذ ہے۔

[2] آئین اکبری ترجمہ اردو جلد اول، جدول دانش اندوزاں جاوید دولت اکبری و علمائے منقول ص ۴۹۰ و ۴۹۱

اگرچہ خطابت کا منصب اب اس خاندان میں باقی نہیں رہا ہے بلکہ دیوان لطف اللہ عثمانی کی اولاد میں منتقل ہوگیا ہے مگر اپنی نیکی اور صلاح کے لحاظ سے یہ خاندان ہمیشہ ممتاز چلا آتا ہے۔

افسوس ہے کہ مولانا فضل اللہ خطیب اور ان کے اسلاف وخاندان کے بزرگوں کے حالات کا پتہ نہیں چل سکا، کہا جاتا ہے کہ خاندان میں نسب نامہ موجود تھا مگر مرورِ ایام سے کسی وقت ضائع ہوگیا، اس خاندان کے کچھ افراد دیوبند سے مختلف اوقات میں قریب کے قصبات گنگوہ، رام پور منہیاران اور منگلور وغیرہ میں بھی منتقل ہوگئے ہیں۔

شیوخ ٹانک کا یہ خاندان دارالعلوم کا شروع سے ہمدرد ومعاون رہا ہے، اس خاندان کی ایک مخیّرہ خاتون سال بھر میں بڑے اہتمام کے ساتھ ایک مرتبہ پورے دارالعلوم کی دعوت کیا کرتی تھیں، جس میں طلبار کے علاوہ تمام اساتذہ اور کارکن شریک ہوتے تھے، ان کا یہ عملِ خیر زندگی بھر جاری رہا۔

اسی خاندان میں مولانا حکیم عبدالقدوس صدیقی ایک باکمال اور حاذق طبیب ہیں، موصوف اگرچہ ابھی نوجوان ہیں مگر تشخیص وتجویز میں ان کو بڑا ملکہ حاصل ہے، دیوبند میں ان کا مطب مرجع خاص وعام بنا ہوا ہے ان کے والد مولانا حکیم عبدالقادر مرحوم (وفات ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء) بھی بڑے نیک وصالح اور کامیاب طبیب تھے۔ دہرہ دون میں ان کا مطب خاص شہرت رکھتا تھا۔

شیخ احمد بدینی :- حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ (وفات ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء) کے خلفاء میں سے تھے، حضرت مجددؒ سے شرفِ تلمذ بھی حاصل تھا، ایک مدت تک حلقۂ درس میں شریک رہے، تحصیل علوم کے بعد برہان پور چلے گئے۔ وہاں شیخ محمد بن فضل اللہ سے بیعت ہوئے مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر خلافت حاصل کی، وہاں سے آگرہ آئے، حضرت مجددؒ اس وقت آگرہ میں مقیم تھے، ان کی صحبت سے سعادت اندوز ہوئے اور طریقۂ نقشبندیہ حاصل کیا، حضرت مجددؒ نے میر محمد نعمان کو خلافت دے کر جب برہان پور رخصت کیا تو شیخ احمد کی روحانی تربیت میر محمد نعمان کے سپرد فرمائی، میر صاحبؒ کی صحبت میں نسبت خواجگانِ نقشبندیہ کی دولت سے سرفراز ہوئے۔

ایک دفعہ مرشدِ سابق شیخ محمد بن فضل اللہ سے ملاقات ہوئی، انھوں نے دریافت فرمایا کہ "ہم نے تمہیں جو ذکر تعلیم کیا تھا اس میں اشتغال رکھتے ہو یا نہیں؟" شیخ احمد نے عرض کیا کہ "میں نے میر محمد نعمان سے طریقہ خواجگانِ نقشبندیہ کا ذکر حاصل کر لیا ہے، اس میں لذت محسوس کرتا ہوں"۔ شیخ محمدؒ نے فرمایا "کچھ مضائقہ نہیں، مقصد تو فائدہ کا حاصل کرنا ہے، جہاں سے بھی ہو"۔

برہان پور میں کچھ عرصے رہنے کے بعد حضرت مجدد کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوئے، اور مرشد کے الطاف بے پایاں سے نوازے گئے تاثیر کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ دو طالبوں کو ذکرِ طریقت کی تعلیم دی

وہ دونوں متاثر ہوئے اور ان سے احوال کا ظہور ہوا، یہ دیکھ کر آپ کو حیرت ہوئی، اور حضرت مجددؒ کی خدمت میں عریضہ بھیجا، اس میں لکھا تھا کہ باوجود یکہ میں اپنے اندر کوئی حال محسوس نہیں کرتا مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے دو طالبوں کو ذکر کی تعلیم دی اور ان سے احوال ظاہر ہوئے، اسی کے ساتھ ذہول اور دوام آگاہی[۵۱] کے متعلق بھی دریافت کیا، حضرت مجددؒ نے دونوں باتوں کا جواب عنایت فرمایا۔ دوسرے جز کے بارے میں تحریر فرمایا کہ مقصود حصولِ احوال ہے، نہ کہ علم احوال، یہ علیحدہ ایک دولت ہے، کسی کو علمِ احوال من جانب اللہ دیا جاتا ہے اور کسی کو نہیں دیا جاتا۔

شیخ احمد مدت تک آگرہ میں طالبین معرفت کے افادہ میں مشغول رہے، امرائے سلطنت میں ایک شخص کو شیخ احمد سے بڑی عقیدت تھی، وہ آپ کو اپنے ساتھ بنگال لے گیا، وہاں انھوں نے بڑی قبولیت حاصل کی، بنگال میں وفات پائی[۵۲]

---

[۵۱] دوام آگاہی اور ذہول تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ طالب راہ سلوک جب انتہائے سلوک میں پہنچ کر اور ذاتِ حق کے مشاہدہ میں غرق ہو کر فنائے تام حاصل کر لیتا ہے اور یہ حالت مستقل بن جاتی ہے جس میں ایک آن کو بھی مشاہدہ سے غفلت نہیں ہوتی اسے تصوف کی اصطلاح میں دوام آگاہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ذہول اسی مشاہدۂ حق سے غفلت غیر مستمرہ کو کہتے ہیں۔

[۵۲] زبدۃ المقامات ص ۳۸۴

سید محمد ابراہیمؒ

گیارھویں صدی ہجری کے اوائل میں خاندانِ سادات کے ایک بزرگ سید محمد ابراہیمؒ نے بعض اہل اللہ کے مشورے سے اسلام کی دعوت و تبلیغ اور رشد و ہدایت کے لئے دیوبند کا انتخاب فرمایا، تذکرۃ العابدین میں لکھا ہے کہ "آپ اولیائے کبار سے تھے، کرامتیں ان کی دیوبند میں مشہور و معروف ہیں، آپ کا سلسلہ قادریہ تھا"۔

دیوبند میں سیّد صاحبؒ کے قیام کے لئے دہلی کی مرکزی حکومت کی جانب سے مسجد اور ایک وسیع خانقاہ تعمیر کرائی گئی، جس میں افادۂ باطنی اور طریقت و تصوف کے حلقے کے ساتھ ساتھ علوم ظاہری کی تعلیم و تعلّم کی مسند بھی بچھی ہوئی تھی، سیّد صاحبؒ کے اخلاف کے نام مغل شہنشاہوں جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں مدد معاش کے لئے جو زمینیں دی گئی ہیں شاہی فرامین میں ان کی وجہ طالبانِ علم و طریقت کے مصارف بتلائے گئے ہیں۔

ہندوستان میں سادات رضویہ کے خاندان لکھنؤ، خیرآباد، زیدپور اور دوسرے مختلف مقامات میں موجود ہیں، سادات دانش مندانِ امروہہ، اور سرسید احمد مرحوم کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے، محمد الاعرج پران کا نسب دیوبند کے سادات سے مل جاتا ہے۔ تقسیم پنجاب سے قبل سونی پت، سفیدون اور سامانہ میں بھی اس خاندان کے افراد آباد تھے۔

سید محمد ابراہیمؒ کا سلسلۂ نسب یہ ہے :-

سیّد محمد ابراہیم بن سید سعد اللہ بن سید محمود قلندر بن سید احمد بن سید فرزند علی
ہ وجیہ الدین بن علاؤ الدین بن سید احمد کبیر بن شہاب الدین بن حسین علی بن
د الباسط بن ابو العباس بن اسحاق عندلیب المکی بن قاری حسین علی بن
لف اللہ بن تاج الدین بن حسین بن علاؤ الدین بن ابی طالب بن
مر الدین بن نظام الدین حسین بن موسیٰ بن محمد الاعرج بن ابی عبد اللہ
د بن موسیٰ المبرقع بن امام محمد تقی بن امام موسیٰ علی رضا بن امام موسیٰ کاظم
ن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن امام ابی عبد اللہ
ین بن سیّدۃ النساء فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا بنت سرور کائنات
د رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔

سیّد محمد ابراہیمؒ کے

ے دادا سید محمود قلندرؒ شہنشاہ ظہیر الدین بابر (۹۳۳ھ / ۱۵۲۶ء - ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء)
، زمانے میں اُدش سے لکھنؤ تشریف لائے۔ یہ ایک مرتاض درویش تھے

ے اُدش، فرغانہ کے علاقے میں واقع ہے۔ بابر کا وطن مالوف تھا، بابر نے
کِ بابری میں تفصیل کے ساتھ اُدش کے حالات لکھے ہیں (ترجمہ تزک بابری
لبوعہ دہلی ص ۲ و ۳) خاندانی شجروں میں اوش کے قبل حمصی لکھا ہوا ملتا ہے جو شام کا
شہور تاریخی شہر ہے، یہ خاندان حجاز سے پہلے حمص میں منتقل ہوا اور وہاں سے
ں کر اوش میں اقامت گزیں ہوا۔

عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے :-

شیخ محمود قلندر لکھنوی از خلفائے شیخ محمد غوث[1] است، صاحب دعوت و اسحار بود در ریاضت و فقر و توکل شانی داشت و صاحب بذل و ایثار بود، در لکھنؤ آمدہ لو خیلے از مردم شرف صحبت او یافتہ، تربہ ارشاد یافتند، و ہماں جا در گذشت ۵۲ .....

شیخ محمود قلندر لکھنوی، شیخ محمد غوث کے خلفاء میں سے ہیں، وہ اسحار الٰہیہ کے عامل تھے، ریاضت، فقر اور توکل میں ان کا بڑا مقام تھا اسی کے ساتھ لوگوں پر فیاضی سے خرچ کرتے تھے، لکھنؤ تشریف لائے تو آپ کی صحبت سے بہت سے لوگ شرف یاب ہوئے اور اپنے دور کے صاحب رشد و ہدایت بنے آپ کی وفات وہیں لکھنؤ میں ہوئی "

---

[1] شیخ محمد غوث گوالیاری سادات نیشاپور سے تھے شیخ حمید شطاری سے بیعت تھے جن کا سلسلہ صرف ایک واسطے سے صاحب سلسلہ شطاریہ شیخ عبداللہ شطار تک پہنچتا ہے شیخ محمد غوث مدت تک قلعہ کالنجر میں ریاضت و مجاہدہ میں مصروف رہے، مراتب عالیہ کے ساتھ دنیاوی عزت و دولت کے بھی مالک تھے، ہمایوں بادشاہ کو ان سے بڑی ارادت تھی (ترجمہ اردو اخبار الاخیار ص ۴۲۸) شیخ دعوت اسحار الٰہیہ میں زبردست مقام رکھتے تھے، اوراد و اعمال میں اورادِ غوثیہ اور جواہر خمسہ آپ کی مشہور کتابیں ہیں، شیخ وجیہ الدین گجراتی جیسے جامع کمالات عالم کو شیخ محمد غوث سے ارادت تھی شیخ محمود قلندر شیخ محمد غوث کے خلفاء میں تھے شیخ وجیہ الدین گجراتی کے معاصر اور پیر بھائی تھے، دونوں نے شیخ محمد غوث سے اکتساب فیض کیا تھا۔ شیخ محمد غوث نے ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء میں وفات پائی۔ گوالیار میں ان کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

۵۲ منتخب التواریخ عبدالقادر بدایونی ص ۲۸۶

مفتاح العارفین میں بھی شیخ محمود قلندرؒ کا ذکر ملتا ہے، لکھا ہے کہ:-

شیخ محمود قلندر حنفی مذہب شطاری مشرب از لکھنؤ کہ از بقاع ہند ست بود، صاحب کشف و کرامات بودند وفات شیخ در سن ہزار و نہ ہجری بود محمود نے ۱۰۰۹ھ میں وفات پائی[۲]

شیخ محمود قلندر کا مذہب حنفی اور مشرب شطاری تھا، آپ ہندوستان کے مشہور شہر لکھنؤ کے رہنے والے تھے صاحب کشف و کرامات تھے، شیخ

---

[۱] قدیم دستاویزات اور مآخذ میں افرادِ خاندان کے ناموں کے ساتھ "سید" کے بجائے "شیخ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس سے یہ خیال نہ ہونا چاہیئے کہ "شیخ" کا لفظ ان حضرات کے نسب اور سیادت سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے یا اس لفظ کی موجودگی خاندان کی سیادت کو مشتبہ بنا دیتی ہے، عرب اور دوسرے اسلامی ملکوں میں ہر جگہ قدیم زمانے سے عموماً یہ رواج چلا آرہا ہے کہ جن خاندانوں میں مشیخت اور بیعت و ارشاد کا سلسلہ قائم رہا ان کے ناموں کے ساتھ بزرگی اور بزرگ زادگی کے اظہار کے لئے بالعموم لفظ "شیخ" کا استعمال کیا جاتا رہا ہے، اس سے نسب کا تعارف مقصود نہیں ہوتا، جیسے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جو سادات میں سے ہیں مگر نام کے ساتھ سید کے بجائے شیخ لکھا اور بولا جاتا ہے، اس عہد میں سید و شیخ کے الفاظ کے استعمال کا نسب کے طور پر رواج نہیں تھا، بلکہ تعظیماً نام کے ساتھ ان کو لکھا جاتا تھا، بطور نسب کے ان الفاظ کے استعمال کا رواج بہت بعد میں ہوا ہے، جیسے غیر عربی قوموں کے اختلاط، خصوصاً ہندوستانی قوموں کے ذات پات کے تصور سے مغلوں کے آخری عہد میں زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے

[۲] مفتاح العارفین مصنفہ شیخ عبدالفتاح، ذکر مشائخ المائۃ الحادی عشر مخطوطہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند۔

سیّد محمد ابراہیمؒ اپنے دادا محمود قلندرؒ سے سلسلۂ قادریہ شطاریہ میں بیعت تھے [1] اولیائے کاملین میں تھے، لکھنؤ میں آپ کی ولادت ہوئی، علوم دینیہ کی تکمیل کے بعد اشغال صوفیا، قادریہ میں مشغول ہو گئے، اپنے دادا شیخ محمود قلندرؒ [2] اور شیخ محمد غوث گوالیاری کے اتباع میں سیاحت اختیار کی

---

[1] شطاری سلسلے کے بانی شیخ عبداللہ شطار تھے، ان کے متوسلین میں بعض نہایت بااثر شخصیتیں گذری ہیں، جنھوں نے اس سلسلے کو خوب ترقی دی، صوفیاء کے اس مسلک کی ایک خاص بات یہ ہے کہ شطاری مشائخ نے ہندوؤں کے ساتھ نہ صرف نہایت اچھے مراسم قائم کئے بلکہ ان کے مذہبی افکار و نظریات کو سمجھنے کی کوشش کی، اس کی ایک اہم مثال شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی تصنیف بحر الحیات ہے جس میں ہندوؤں کے مذہبی فکر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، اس دور میں ہندوؤں... اور مسلمانوں میں ایک دوسرے کے علوم کو سمجھنے کا شوق بڑھ رہا تھا، ہندوؤں نے اول اول فارسی زبان اسی زمانے میں پڑھنی شروع کی، ایک طرف رزق اللہ مشتاقی اور میاں طہٰ وغیرہ ہندوؤں کے علوم کے ماہرین میں شمار کئے جاتے ہیں تو دوسری طرف ایک ہندو برہمن کے اسلامی علوم پر عبور کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں کو درس دیتا تھا، شیخ رکن الدین گنگوہیؒ ایک ہندو جوگی بال ناتھ سے اسرار توحید معلوم کرتے تھے (صبح گلشن ص ۱۳۴، واقعات مشتاقی ۱۳۳، منتخب التواریخ ص ۳۲۳ لطائف قدوسی ص ۴۷ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۱ھ۔ بحوالہ سلاطین ہند کے مذہبی رجحانات مصنفہ خلیق احمد نظامی ص ۱۵۴ و ۱۵۸) شیخ رزق اللہ، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے چچا تھے عربی فارسی کے علاوہ سنسکرت کے بھی عالم تھے، ہندوؤں کے علوم پر بھی کامل حاصل تھی، ہندی میں راجن اور فارسی میں مشتاقی تخلص کرتے تھے۔ (باقی حاشیہ صـ ۹۹ پر ملاحظہ ہو)

سید محمد ابراہیمؒ کے دو بھائی اور تھے، سب سے بڑے بھائی جامع مسجد لکھنؤ میں امامت و خطابت کے منصب پر فائز تھے، دوسرے بھائی حیدر آباد دکن چلے گئے اور سید محمد ابراہیمؒ نے جو زہد و تقویٰ اور فقر و توکل میں اپنے دادا کے جانشین تھے مسندِ رشد و ہدایت کو رونق بخشی، پانچ مرتبہ حرمین شریفین میں حاضر ہو کر حج و زیارت روضۂ اقدس سے مشرف ہوئے اور مختلف ملکوں کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے ہندوستان واپس تشریف لائے، ملفوظات انوزی میں لکھا ہے کہ :-

"حضرت شاہ محمود قلندرؒ رضوی رحمۃ اللہ علیہ لکھنؤ تشریف لائے آپ کے تین فرزند ہوئے، بڑے بھائی لکھنؤ میں امامت پر رہے، دوسرے بھائی حیدر آباد دکن چلے گئے، تیسرے بھائی نے درویشی اختیار کی، پانچ حج کئے، کیونکہ وہاں کی حاضری کے بغیر اکثر اولیاء اللہ کمال کو

(بقیہ حاشیہ ۹۸ سے آگے) صبح گلشن ص ۱۳۴ بحوالہ سلاطین ہند کے مذہبی رجحانات ص ۴۵۸ ت

۵۲ شیخ محمود قلندرؒ کے خلفاء میں ایک بزرگ شیخ دانیال بنارسیؒ (وفات ۱۰۱۵ھ / ۱۶۰۶ء) کے حالات تذکرہ مشائخ بنارس میں ملتے ہیں لکھا ہے کہ اپنے زمانے کے بلند مرتبہ مشائخ میں تھے، بنارس کی مخلوق کو عرصے تک فائدہ پہنچایا، سارا شہر ان کی ولایت کا معتقد تھا، بحر زخار کے مصنف نے تحفۃ الابرار کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیخ محمد محمود قلندرؒ کے خلفاء میں سے تھے (تذکرہ مشائخ بنارس مؤلفہ مولانا عبد السلام ص ۱۶۵)

نہیں پہنچتے، پچھلے حج کے بعد براہ خشکی دیوبند تشریف لائے، اس وقت شاہجہاں بادشاہ[۱] تھے، یہاں کے شاہ ولایت ہوئے اور فیض جاری ہوا، قریب بادن سال کی عمر میں سادات بارہہ مقام جانسٹھ شادی کی یہ ساداتِ بارہہ آصف الدولہ کے وقت میں شیعہ ہو گئے، حضرت شاہ مینا لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ اسی خاندان کے نواسے ہیں[۲]"

سید محمد ابراہیمؒ نے ہندوستان کی سیاحت کے دوران اکثر اولیائے کرامؒ کی خدمات میں حاضر ہو کر روحانی فیوض و برکات حاصل کیں، برنادہ[۳] میں

---

[۱] یہ تاریخی غلطی ہے، شاہجہاں (۱۰۳۷ھ - ۱۰۶۸ھ) کا عہدِ سلطنت ۲۲ جمادی الاول ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ سید محمد ابراہیمؒ کی وفات ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء میں ہوئی، نیز سید صاحب کی وفات کے بعد ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء میں آپ کی زوجۂ محترمہ کے لئے "مدمعاش" جو فرمان شاہی جاری ہوا ہے وہ جہانگیر کی جانب سے ہے، ملفوظات انوری کے مکتوب نگار (حضرت حاجی سید محمد انورؒ) کو تسامح ہوا ہے۔

[۲] ملفوظات انوری مرتبہ حاجی مولا بخش دیوبندی ص ۶

[۳] برنادہ میرٹھ سے تقریباً ۱۹ میل جنوب مغرب میں واقع ہے، یہ ایک قدیم تاریخی بستی ہے، شیوخ کی آبادی ہے، برنادہ کے قریب ہنڈن ندی کے کنارے مشائخ برنادہ کے مزارات ہیں، برنادہ کے قریب ہی ایک موضع شیخوپورہ ہے۔ بزرگان برنادہ شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہرویؒ (م ۴۸۱ھ / ۱۰۸۸ء) کی اولاد میں سے ہیں۔ برنادہ میں اولاً شیخ بدرالدینؒ (م ۷۸۸ھ / ۱۳۸۶ء) نے سکونت اختیار کی، ان کو مخدوم نصیرالدین چراغ دہلیؒ (۷۵۷ھ / ۱۳۵۶ء) سے خلافت و اجازت حاصل تھی (باقی حاشیہ ص ۱۰۱ پر)

یخ علاء الدین چشتیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے مشورے سے
ام کے لئے دیوبند کو پسند فرمایا، سید صاحبؒ شریعت و طریقت کے
مع اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ یہاں کے اطراف میں
ن کا علمی اور روحانی فیض بہت پھیلا اور ان کے ارشاد و تلقین سے بہت
ے لوگوں کی اصلاح ہو گئی اور ایک عالم آپ کے چشمۂ فیض سے سیراب
وا، ان کی خانقاہ میں حقیقت و معرفت کا جو چراغ روشن تھا اس کی ضیا
اشیوں نے بہت سی تیرہ و تاریک زندگیوں میں اجالا کر دیا، چشتیہ بہشتیہ
ں لکھا ہے :-

ماجی ابراہیم دینی اولاً بملازمت	حاجی ابراہیم دینی حضرت والا کی
انحضرت در برنادہ رسید و آنچہ	خدمت میں حاضر ہوئے، اپنے حالات
ر دل مضمر داشت ظاہر گردانید	سنائے اور کہا کہ میں کافی سیر و سیاحت
و گفت کہ سیر و سفر بسیار کردم	کر چکا ہوں، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ
بکعبہ معظمہ و مدینہ طیبہ و بیت المقدس	بیت المقدس اور روم و شام
و روم و شام رسیدم و دیگر اطراف	اور دوسرے بہت سے مقامات کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس خاندان میں ایک بزرگ بدر الدین اسحٰقؒ تھے ان کے فرزند شیخ علاء الدین چشتیؒ (م ۹۷۶ھ) تھے جو رسالہ چشتیہ بہشتیہ کے مصنف ہیں، اس خاندان کا ایک سلسلہ سنبھل میں ہے اور دوسرا پانی پت میں تھا، تیسرا سلسلہ قصبہ سہالی (بارہ بنکی) میں آباد ہوا علمائے فرنگی محل اسی تیسرے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں (تذکرہ علمائے فرنگی محل از مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی مطبوعہ لکھنؤ ص ۸)

واکناف بسیار دیدم، اکنوں ویرانہ
بسر می خواہم کہ مکانے متعین ساختہ
وجودپرداختہ بقیہ عمر بگذرانم و بہر مقامے
وبہر دیارے مشاورہ ما مور گردد ممکن
ومستقر شود۔
فرمود کہ درویشاں ہر جا کہ اقامت
کنند مبارک است، لیکن قصبہ دیوبند
کہ دیوبند گویند دریں زماں از غلغلہ
اشخاص سلاسل متقادمہ نمایاں
شدہ است، مناسب آن ست کہ
دراں قصبہ وطن گیرند ونکاح کنند
تا مردم آنجائے استفادہ کنند۔
پس شیخ مذکور ہمچناں کرد و در اندک
فرصت انگشت نما گشت وعلائق
ظاہریہ بروجہ احسن حاصل آمد، چنانچہ
باغ وچاہ واملاک وحویلی واولاد و
غیر ذالک بمراد فؤاد محصل ومیسر آمد[1]

کی سیر کی ہے، اب چاہتا ہوں کہ
یکسوئی کی زندگی گذاروں اور اس کے
لئے آپ کے مشورے کا خواستگار ہوں،
جہاں آپ فرمائیں وہاں مستقل طور پر
مقیم ہو جاؤں۔ اور زندگی کے
بقیہ ایام وہاں گذاروں۔۔۔۔۔
۔۔۔۔ارشاد فرمایا کہ درویش جہاں کہیں
بھی اقامت پذیر ہوں مبارک ہے
مگر قصبہ دیوبند جیسے لوگ دیوبند کے
نام سے پکارتے ہیں وہ قدیم سلسلے
کے اشخاص کی شہرت سے آج کل
نمایاں ہے، اچھا یہ ہے کہ آپ دیوبند
میں قیام کریں اور نکاح کر کے وہیں بس
جائیں تاکہ وہاں کے رہنے والے
آپ سے استفادہ کر سکیں، چنانچہ شیخ
مذکور نے یہی کیا اور تھوڑے ہی دنوں
میں مشہور و مقبول ہو گئے اور ظاہری تعلقات

خوب اچھی طرح حاصل ہو گئے، باغ وکنواں، حویلی اور جائیداد اہل وعیال اور دوسری ساری ضروری چیزیں حسب دل خواہ میسر ہو گئیں۔

---

[1] رسالہ فردوسیہ چشتیہ بہشتیہ ص ۷۶ و ۷۷ ۔۔۔۔۔۔ مخطوطہ کتب خانہ دار العلوم دیوبند

چنانچہ شیخ علاء الدین چشتیؒ کے مشورے کے مطابق سید محمد ابراہیمؒ نے دیوبند میں قیام فرمایا، اور یہاں علم و عرفان اور رشد و ہدایت کی شمع روشن کی آبادی کی جانب جنوب دیوی کنڈ کے متصل مکان، مسجد اور خانقاہ تعمیر کرا کر خلق اللہ کی خدمت میں مشغول ہو گئے، آپ کے فیوض اور رشد و ہدایت کا دائرہ صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھا بلکہ غیر مسلم بھی آپ کے ساتھ ارادت مندی سے پیش آتے تھے، اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ شطّاری سلسلے کے مشائخ ہندوؤں سے بڑے اچھے تعلقات رکھتے تھے، چنانچہ دیوبند کے مشہور طبیب حکیم عبد اللطیف مرحوم (۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء - ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء) نے جو راجہ راج گڈھ (مالوہ) کے طبیب خاص تھے، راقم سطور سے بیان کیا کہ

"حضرت سید محمد ابراہیمؒ کی نظر کیمیا اثر اور فیضِ صحبت سے دیوبند اور اطراف و جوانب کے بہت سے لوگ یہاں حلقہ بگوش اسلام ہوئے خود اپنے خاندان کے بارے میں حکیم صاحب نے فرمایا کہ سید صاحبؒ کی توجہ سے مشرف باسلام ہوا، نیز دیوبند کے گوجر بھی آپ ہی کے فیض صحبت سے اسلام میں داخل ہوئے"

گوجروں میں دو بھائی تھے، ایک کا نام جے رام اور دوسرے کا نور رنگ تھا، جے رام مشرف باسلام ہو گیا اور دوسرا بھائی بدستور اپنے مذہب پر قائم رہا، دونوں بھائیوں کی اولاد جس محلے میں رہتی ہے، وہ گوجر واڑہ کہلاتا ہے، دونوں خاندان کے افراد بیاہ شادی میں ایک دوسرے کے یہاں شریک ہوتے ہیں، جے رام نے بقول اسلام کے بعد

اپنے آبائی مندر کے نزدیک مسجد۔۔ تعمیر کی جواب تک موجود ہے، اس مسجد میں جمعہ ہوتا ہے، جے رام کی بنوائی ہوئی حویلی بھی اب تک موجود ہے جس میں اس کی اولاد رہتی ہے۔ گوجروں کے قبولِ اسلام کی نسبت تاریخ سہارنپور کے مصنف نے لکھا ہے کہ :-

"بیشتر گوجران آبادی شہر میں رہتے تھے، بعدہٗ انھوں نے اپنا محلہ علیحدہ کرلیا، جلال الدین اکبر بادشاہ کے عہدِ حکومت میں وہ مسلمان ہوگئے"۔ [۱]

مگر آئین اکبری سے اکبر کے عہدِ حکومت میں گوجروں کے اسلام قبول کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، ابوالفضل نے دیوبند کی زمینداری کا ہندو گوجروں اور تگوں میں ہونا بتلایا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان، افریقہ، چین، انڈونیشیا ملائشیا اور فلپائن وغیرہ ملکوں میں اسلام کی اشاعت بڑی حد تک صوفیائے کرام کی کوششوں کی رہین منت ہے، چنانچہ ہندوستان میں شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ (وفات ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) نے پنجاب میں خواجہ معین الدین چشتیؒ (وفات ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء) نے راجپوتانے میں، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (وفات ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء) اور سلطان نظام الدین اولیاء (۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء) نے دہلی اور اس کے اطراف وجوانب میں اسلام کا چراغ روشن کیا ہے۔

---

[۱] تاریخ سہارنپور۔ ص ۱۶۱

دیوبند اور اس کے اطراف میں سید محمد ابراہیمؒ کی تبلیغی جدوجہد نتیجہ خیز ہوئی، ان کی ذات سے تبلیغ و اشاعت اسلام کی عظیم الشان خدمات ظہور میں آئیں۔

پروفیسر آرنلڈ نے دعوت اسلام میں لکھا ہے کہ "ہندوستان میں اسلام کی روشنی ان مقامات پر زیادہ پھیلی جہاں مسلمانوں کی سیاسی طاقت کمزور تھی، جیسے جنوبی ہندوستان اور مشرقی بنگال"[1]

ہندوستان میں صوفیائے کرام نے اصلاحِ نفس، تذکیۂ باطن اور خدمتِ خلق کی راہ میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیے وہ روز روشن کی طرح واضح ہیں، ان کارناموں کا اثر صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھا بلکہ ان سے ملک کی سماجی اور معاشرتی زندگی بھی متاثر ہوئی، چنانچہ نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی صوفیائے کرام کے ساتھ عقیدت و ارادت رکھتے تھے، اسلامی تعلیمات کی تشریح و توضیح میں صوفیائے کرام کا انداز و طریق براہ راست وجدان و شعور کو متاثر کرتا تھا، اس سے قلب میں سوز و گداز پیدا ہو جاتا تھا، جو لوگ ان کی صحبت اختیار کر لیتے تھے اسلام ان کے دلوں میں جاگزیں ہو جاتا تھا۔

ہندوستان میں مسلمان فاتح بالعموم اس تبلیغی روح کے ساتھ نہیں آئے جو عرب مجاہدین کا خاصہ تھا، ان کے ذہن و کردار میں جہانبانی اور فرمانروائی کا انداز پیدا ہو گیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان حکمران

---

[1] پریچنگ آف اسلام ص ۲۱۳

اس ملک کی اکثریت کے دل اس طرح نہیں جیت سکے جس طرح عرب مجاہدین نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں جیت لئے تھے، ہندوستان کے سلاطین تو بالعموم رزم آرائیوں اور کشور کشائیوں میں مصروف رہے مگر مشائخ کی خانقاہیں محبت و مودّت کے نغموں سے گونج رہی تھیں اور صوفیائے کرام اقلیم دل کی تسخیر میں مشغول تھے ——————

ان کی یہ کوشش رہی کہ اس سرزمین کو اسلام کی دولت سے مالا مال کریں اور یہاں کے رہنے والے جفاکش اور سماج کے ٹھکرائے ہوئے باشندوں کو اُن اسلامی اقدار سے روشناس کرائیں جو گفتار و کردار کو جلا بخشتی اور انسانی زندگی کو سنوارتی ہیں۔

سید صاحبؒ کی جدوجہد صرف اصلاحِ باطن، روحانی تربیت اور تبلیغ اسلام کی حد تک ہی محدود نہ تھی بلکہ جو لوگ اسلام قبول کر لیتے تھے، اُن کی تعلیم و تربیت کا بھی مناسب انتظام فرماتے تھے، مساجد کے انتظام کے سلسلے میں خود راقم سطور سے ڈاکٹر منصب علی خاں دیوبندی (وفات ۱۹۵۳ء / ۱۳۷۲ھ) نے یہ واقعہ بیان کیا کہ قلعہ کی جامع مسجد کی امامت و خطابت کے لئے سید صاحبؒ نے لوہاری (مظفر نگر) سے ملا حسام الدین کو بلا کر مقرر فرمایا، جن کی اولاد میں اب سے کچھ عرصہ پہلے تک برابر امامت کا یہ منصب چلا آتا رہا، موجودہ جامع مسجد کی تعمیر (۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء) سے قبل تک قلعہ کی مسجد کو دیوبند کی مرکزی مسجد ہونے کی حیثیت حاصل تھی۔

شہنشاہ جہانگیر (۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء - ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء) کے عہد حکومت میں سید صاحبؒ کے قیام کے لئے جو خانقاہ اور مسجد تعمیر کرائی گئی تھیں وہ اب معدوم ہو چکی ہیں۔

آپ کے دو صاحبزادے ہوئے، بندگی سید محمد اسمٰعیلؒ اور شاہ محمد امین، سید محمد ابراہیم نے ۵ شوال ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء کو وفات پائی مسجد کی جانبِ شمال آپ کا مزار ہے، یہ جگہ اب سرائے پیرزادگان کہلاتی ہے، سید صاحبؒ کا قطعۂ تاریخ وفات یہ ہے:-

حسرتا از جورِ چرخِ بے مدار — اندکے راحت رساند، رنج آرد بے شمار
حاجی الحرمین، ابراہیم نام — بود شیخِ قطبِ دوراں نامدار
در علومِ شرع وارث انبیاء — بر سریرِ فقر شاہِ روزگار
ذاتِ پاکش، مرشدِ راہِ یقیں — نورِ داتش شد بعالم آشکار
در مہ شوال بود، تاریخِ خمس — کوسِ رحلت زد بعالم بر دکار
شد جہاں تاریک بس بے نورِ او — عالمے از ہجرِ او شد دل نگار
سالِ تاریخش بجستم از خرد — بود از شورش فراواں زارزار
خندۂ او، گفتا ولی لایموت — از حسابِ ابجدش می کن شمار

۱۰۳۴ھ

قبر پر پانچ فٹ لمبا اور دو فیٹ چوڑا سنگ سرخ کا منقش پتھر لگا ہوا ہے، جس پر کلمۂ طیبہ اور سورۂ اخلاص نہایت پاکیزہ خطِ نسخ میں تحریر ہے۔

دیوبند میں سادات کے کئی خاندان ہیں مگر سب سے بڑا یہی خاندان ہے، اور اپنے علم و فضل اور ارشاد و ہدایت کے لحاظ سے ہمیشہ نمایاں رہا ہے، اس خاندان کے بزرگ تین صدیوں تک رشد و ہدایت کی مسندوں پر متمکن رہے ہیں وہ تصوّف و طریقت سے شغف کے ساتھ ساتھ علوم شریعت سے بھی آراستہ ہوتے تھے، جو لوگ ان کے پاس استفادے کی غرض سے آتے وہ اپنے دامن کو فیض کی دولت سے بھر کر لوٹتے تھے، دیوبند میں ان کے فیوض و برکات کا چشمہ عرصے تک جاری رہا۔

۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء میں سہارنپور کی عدالت میں ایک یادداشت پیش کی گئی تھی، اس میں تحریر ہے کہ :-

"حضرت سید محمد ابراہیم قدس اللہ سرہٗ کی درگاہ کے طلبار کی تعلیم اور درویشوں کے خورد و نوش کے مصارف اُس آمدنی سے پورے کئے جاتے ہیں جو اس مقصد کے لئے شاہجہاں بادشاہ نے حضرت سید صاحبؒ کے فرزند اکبر حضرت بندگی محمد اسمٰعیلؒ کو عطا فرمائی تھی۔

بندگی سید محمد اسمٰعیلؒ اپنے والد بزرگوار کے بعد اُن کے جانشین ہوئے اور تمام عمر درس و تدریس اور تربیت باطنی میں مشغول رہے عہد عالمگیری کے فرامین میں ان کے لئے "معارف آگاہ" اور بعد وفات "مغفرت پناہ" اور "غفران پناہ" وغیرہ القاب لکھے گئے ہیں، ۲۹ محرم ۱۰۹۲ھ / ۱۶۸۱ء میں وفات پائی اور اپنے والد کے پہلو میں بائیں جانب

دفن ہوئے، لوحِ مزار پر یہ قطعہ کندہ ہے :-

بست و نہ از محرم داد — نقدِ جاں شیخِ عصر اسمٰعیل
گفتہ شد، شیخِ کاملِ اکمل — از پئے یادگار سالِ رحیل

۱۰۹۲ھ

بندگی محمد اسمٰعیل کے فرزند سید محمد عارفؒ اور اُن کے فرزند سید وجیہ الدینؒ کی نسبت عہد عالمگیری کے پروانے میں تحریر ہے کہ :-

دریں ولا شیخ وجیہ الدین پسر غفران پناہ — شیخ وجیہ الدین بن غفران پناہ
معارف آگاہ شیخ محمد عارف، ولد — معارف آگاہ شیخ محمد عارف بن
مغفرت پناہ بندگی شیخ محمد اسمٰعیل — مغفرت پناہ بندگی شیخ محمد اسمٰعیل
کہ بصلاح و تقویٰ آراستہ لیاقت تمام — جو صلاح و تقویٰ سے آراستہ اور
دارد و بجائے پدر خود در خانقاہ — صاحب فضل و کمال ہیں وہ اپنے
بتدریس و تذکیر با جماعتِ طالب علماں — والد کی جگہ پر خانقاہ میں طلبا اور
و فقرا، و صوفیا، مشغول است[۵۱] — صوفیاء کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہیں

اسی طرح کا ایک دوسرا فرمان امرائے عالم گیری میں محمد عرب
محمد خسرو کی جانب سے ۳۰ سنہ ۱۰۹۷ھ جلوس عالم گیری میں سید محمد صابر کے نام
صادر ہوا ہے[۵۲]۔ ان سب حضرات کی قبریں اپنے جدِ بزرگوار کے مزار کے

---

۵۱ و ۵۲ پہلا فرمان ۹ شوال سنہ ۲۴ جلوس عالم گیری میں غضنفر خاں صوبہ دار
دوآبہ کے دستخط سے، اور دوسرا سنہ ۳۰ جلوس میں محمد عرب کے دستخط سے جاری
ہوا ہے، یہ دونوں فرمان خاندانی کاغذات میں موجود ہیں۔

احاطے میں ہیں۔

اس خاندان کے بزرگوں کے حالات کا بیشتر ذخیرہ دیوبند کے قزاقانہ حملوں میں تاخت وتاراج اور آتش زنی کی نذر ہوگیا ہے اور اس دور کے بہت کم حالات دست یاب ہوسکے ہیں، اس لئے صرف آخری دور کے چند حضرات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حاجی سید محمد عابدؒ:۔ (وفات ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ء) اولیائے کاملین میں تھے، مختلف بزرگوں سے خلافت واجازت حاصل تھی، اوراد واعمال کے زبردست عامل تھے، آپ کے روحانی کمالات کے باعث عام وخاص ہر طبقے کے لوگ آپ کو اپنے لئے باعث خیر وبرکت سمجھتے تھے اور آپ کی فیض رساں خدمت میں حاضر ہوکر اپنے اپنے درد کا درماں پاتے تھے، آپ کی زندگی "جام شریعت" اور "سندانِ عشق ومعرفت" کی جامع تھی، دارالعلوم کے بانیوں میں سے تھے، اس کے سب سے پہلے مہتمم رہے، دیوبند میں عظیم الشان جامع مسجد کی تعمیر آپ ہی کی جدوجہد سے ہوئی، تذکرۃ العابدین میں آپ کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ حضرت حاجی محمد عابد صاحب قوتِ فیصلہ اور اصابتِ رائے میں نسبتِ مرتضوی رکھتے تھے، ایک مرتبہ آپ کو بہت رنجیدہ دیکھا گیا، لوگوں کے اصرار پر بتایا کہ ۲۸ سال کے بعد آج صبح کی تکبیر تحریمہ فوت ہوگئی [۱]

---

[۱] سوانح قاسمی جلد دوم ص ۲۸۲ و ۲۴۱ و ۲۳۹ و ۲۴۰

دیوبند کے لوگوں کو آپ سے کمال درجے عقیدت تھی، دیوبند کے
وں میں شاید ہی کوئی بچہ ہوگا جس کے گلے میں آپ کا تعویذ نہ ہوتا ہو
ہب والے بھی آپ کے تعویذوں کے معتقد تھے [۱]

حضرت تھانویؒ نے مثنوی زیر دیم میں لکھا ہے [۲]:-

، کامل ، ولی ، مردِ خدا پائے او ریائے فخرِ انبیاء
الی ، ہم جلالی شانِ او کانِ حلم و مخزنِ خلقِ نکو
وتعویذش ، مثالِ نقشِ قدر فیضِ او بر خاص و عامی مثلِ بدر

قبرستان قاسمی کے شمال میں آپ کا خام مزار واقع ہے، یہ قبرستان
ہی کے نام سے موسوم ہے۔

حاجی سید محمد انورؒ :- (وفات ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء) ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء میں
نا انجینرنگ کالج رڑکی سے انجینرنگ کا امتحان پاس کیا، بہار اور
ب میں انجینر رہے، ذکر و شغل اور ریاضت و مجاہدات ملازمت کے
ن ہی میں شروع کر دیئے تھے، حضرت حاجی سید محمد عابدؒ سے
ت حاصل تھی، ملفوظاتِ انوری میں آپ کے حالات و ملفوظات
ن کیے گئے ہیں، سرائے پیرزادگان میں آپ کا مزار ہے۔

حکیم سیّد برکت علی :- حکیم شریف خاں دہلوی کے پوتے حکیم
ر خاں سے طب کی تحصیل کی، اجوبہ سوالات طب کے نام سے فنِ طب میں

---

[۱] سوانح قاسمی جلد دوم ص ۸۲ و ۲۴۱ و ۲۳۹ و ۲۴۰
[۲] مثنوی زیر دیم بحوالہ القاسم دار العلوم نمبر محرم ۱۳۴۷ھ ص ۱۹

ایک منظوم قرابادین اور ایک رسالہ لکھا ہے، تحصیل نوح (ہریانہ) میں سرکاری وکیل تھے، ان کے فرزند سید جمعیت علی شاعرانہ ذوق رکھتے تھے اور نہایت پُرگو شاعر تھے، کئی غیر مطبوعہ مثنویاں اُن کی یادگار ہیں ایک مثنوی میں جو ۶۳۰۳، اشعار پر مشتمل ہے اس میں جامع مسجد دیوبند کی تعمیر کے حالات بڑے بسط و تفصیل سے لکھے ہیں۔

منشی فضل حق :۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے اولین اراکین میں سے تھے، ابتداً حاجی محمد عابدؒ کے زمانۂ اہتمام میں سربراہ کی حیثیت سے دارالعلوم کی خدمات انجام دیں۔ سنہ ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۳ء میں حاجی صاحبؒ کے مستعفی ہوجانے پر مہتمم مقرر ہوئے اور تقریباً ایک سال اس خدمت کو انجام دے کر مستعفی ہوگئے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے بیعت تھے، حضرت نانوتوی کی ایک سوانح حیات لکھی تھی، افسوس ہے کہ اس کے شروع اور آخر کے اوراق ضائع ہوگئے ہیں، جو حصہ باقی بچا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سوانح حیات کے اصول پر نہایت جامع اور مکمل سوانح ہوگی اسی کے ساتھ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں تحریری صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان کے انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہوسکی۔

حکیم سید جعفر حسین :۔ ادیب شہیر ابوالفضل محمد عباس شروانی (وفات سنہ ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء) ابن احمد شروانی مصنف نفحۃ الیمن کے شاگرد تھے، مرزا غالب سے بھی تلمذ حاصل تھا، فقہ اور قانون سے

ھی مناسبت تھی، ریاست بھوپال میں مشیرِ قانون تھے، ان کے فارسی
خطوط کا ایک مجموعہ مکتوباتِ جعفری کے نام سے ہے، ان خطوط کا
رازِ نگارش انشائے ابوالفضل کی یاد تازہ کرتا ہے، انھوں نے
بر غلام علی آزاد بلگرامی کی مشہور کتاب سروِ آزاد کا خلاصہ بھی کیا ہے
رزا غالب کی وفات پر انھوں نے جو خط اپنے ایک عزیز کو لکھا تھا وہ
راچی کے رسالہ سہ ماہی اردو میں چھپا ہے [۵]
حکیم جعفر حسین کے والد حکیم سید غلام عباس بھوپال میں پولیس
سپکٹر تھے، ملازمت کے ساتھ ساتھ بطورِ خدمتِ خلق گھر پر
طب بھی کرتے تھے۔

حاجی آل حسن :- (۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء) حاجی سید محمد عابدؒ کے
زند تھے، اور اوراد و اعمال میں کامل دست گاہ تھی، نیک اور صالح
نسان تھے۔

مولانا سید محمد میاں :- علم و عمل کا پیکر اور مشہور عالم ہیں
ہارا در مراد آباد میں عرصے تک درس و تدریس کا مشغلہ رہا، پھر مرکزی
ہیئۃ علماء کی نظامت کے فرائض انجام دیتے رہے، علماء کی سیاسی

---

[۵] مکتوباتِ جعفری اور سروِ آزاد کا خلاصہ، یہ دونوں مخطوطے ہمارے فاضل دوست
محمد ایوب قادری ایم اے لکچرار اردو کالج کراچی کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہیں، اس
موضوع پر قادری صاحب کا فاضلانہ مقالہ مجلہ "سہ ماہی اردو" کراچی کے شمارہ
۱۹۶۹ء میں چھپا ہے، حکیم جعفر حسین کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو مجلۂ مذکور ص ۱۷۱ و ۱۷۲

خدمات سے عوام کو روشناس کرانے میں آپ نے زبردست تصنیفی کارنامہ انجام دیا ہے، جمعیۃ علماء کی سیاسی تاریخ اور اس کے ریکارڈ کے آپ تنہا مصنف ہیں۔ تاریخ اسلام، علمائے ہند کا شاندار ماضی، علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے، ان کی گراں قدر تصانیف ہیں۔

جمعیۃ علماء ہند کا تعلیمی نصاب بھی آپ ہی کے قلم کا رہین منت ہے بچوں کے لئے نصابی کتابیں ان کی نفسیات کے مطابق لکھنے کا ان کو خاص ملکہ ہے، ان کی تصانیف کو قبول عام حاصل ہے۔ اس وقت مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث اور ادارۂ مباحثِ فقہیہ کے معتمد ہیں۔

مولانا آل حسن :۔ دارالعلوم کے فاضل ہیں، نہایت عابد و زاہد، علم و عمل اور صلاح و تقویٰ کا پیکر ہیں، بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا خاص ملکہ ہے، نام و نمود سے بہت بچتے ہیں مگر اس کے باوجود ضرورت مندوں کا ان کے گرد ہر وقت ہجوم رہتا ہے۔

مولانا سید حامد میاں :۔ دارالعلوم کے فاضل ہیں، لاہور میں جامعہ مدنیہ کے نام سے بڑے پیمانے پر ایک درس گاہ قائم کی ہے جسے کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ "انوارِ مدینہ" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ بھی ان کی ادارت میں نکلتا ہے۔

ابوسعید بزمی :۔ بھوپال میں پیدا ہوئے، اس لئے عام طور پر بھوپالی سمجھے جاتے تھے، مگر درحقیقت ان کا خاندانی تعلق دیوبند

کے ساداتِ رضویہ سے تھا۔

بھوپال میں اپنے نانا سے عربی و فارسی پڑھی اور انگریزی میں ایم، اے کیا۔ اپنے دور کے باکمال اور نامور صحافی تھے "مدینہ" بجنور اور "زمزم" لاہور اور روزنامہ "احسان" لاہور وغیرہ اخبارات کے ایڈیٹر رہے۔ پاکستان کے مدیران جرائد کے ساتھ امریکہ کے دورے پر گئے ہوئے تھے، وہیں ۱۵ ستمبر ۱۹۵۱ء کو انتقال ہوا، جنازہ لاہور لایا گیا اور وہیں سپردِ خاک کیا گیا۔

ابو سعید بزمی صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب مصنف بھی تھے، "تاریخ انقلاباتِ عالم ان کی معرکۃ الآرا تاریخی تصنیف ہے، جس میں ابتدائے آفرینش سے عہد حاضر تک کے تمام سیاسی، تمدنی مذہبی اور معاشرتی انقلابات کی تاریخ بیان کی گئی ہے، یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی ۔ ان کی ایک کتاب کا نام ہے "مولانا آزاد تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں" اس کتاب میں انھوں نے بڑی دیدہ دری اور ژرف نگاہی سے مولانا آزاد کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے، ان کی ایک اور کتاب بھی بہت مشہور ہے، جس کا نام ہے "اور جب خون بہہ رہا تھا"۔

سید ابو العاصم :۔ منشی سید فضل حق مرحوم کے پوتے ہیں انگریزی میں ایم، اے ہیں، دہلی کے محکمۂ تعلیم میں استاد ہیں، بچوں کیلئے تاریخ اور جغرافیہ کی کئی مفید اور دلچسپ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ابھی

نوجوان ہیں۔ آثار بتاتے ہیں کہ مستقبل میں نامور مصنّف ثابت ہونگے

مولانا سید زاھد قیصر:- دارالعلوم کے نوجوان ممتاز فضلاء میں سے ہیں، صحافت میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں، کئی اخبارات اور رسائل کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، اور اپنا ایک خاص اسلوبِ نگارش رکھتے ہیں۔

بدنام کنندۂ اسلاف راقم سطور بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتا ہے، اور "گرچہ خوردیم نسبتے..... ست بزرگ" کا مصداق ہے، راقم سطور کا سلسلۂ نسب یہ ہے:-

سید محبوب رضوی بن سید ظہور الحسن[1] (وفات ۱۳۷۰ھ) بن سید نوازش علی بن سید وارث علی بن سید فضل علی شہید بن سید غلام احمد بن سید محمد ابراہیم، بن سید محمد وارث بن سید وجیہ الدین بن سید محمد عارف بن بندگی سید محمد اسمٰعیل[2] بن سید محمد ابراہیم۔

---

[1] سید ظہور الحسن ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے، دارالعلوم میں تعلیم پائی، بچپن میں کچھ عرصے اپنے نانا حکیم سید غلام عباس مرحوم کے پاس بھوپال میں قیام رہا، محکمۂ نہر میں ملازم رہے، اور ادو اعمال میں کامل دست گاہ رکھتے تھے، فنِّ طب سے بھی مناسبت تھی، چھوٹے بچوں کے علاج کا خاص ملکہ حاصل تھا، ۱۸ رمضان ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء کو انتقال ہوا، متصل عیدگاہ قبرستانِ انوری میں مدفون ہیں۔ قطعۂ تاریخ وفات یہ ہے:-

وہ شمع سیادت ظہور الحسن — ضیا بخش ہر محفل و انجمن
جب اس بزم فانی سے رخصت ہوئے — ہوا عالم خلد ان کا وطن
کیا عرض میں نے یہ سال وفات — گئے آہ! سید ظہور الحسن
۱۳۷۰ھ

شاہ رمز الدینؒ

دیوبند کی سرزمین میں سلسلۂ قادریہ کے ایک بزرگ شاہ رمز الدین بغدادیؒ (وفات ۱۱۲۲ھ / ۱۷۱۰ء) آسودۂ خواب ہیں، آپ کے حالات کا پتہ نہیں چلتا، آپ کی جانب ایک کتاب شواہد رمزی منسوب ہے جو اوراد و وظائف پر مشتمل ہے، اس کا اردو ترجمہ مجربات مشائخ کے نام سے ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء میں مطبع فیض احمدی لکھنؤ میں طبع ہوا ہے کتاب پر مترجم کا نام درج نہیں ہے، اس ترجمے کے سرورق پر آپ کو شہنشاہ اورنگ زیب (۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۸ء - ۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۷ء) کا معاصر اور حضرت شاہ محب اللہ[1] الہ آبادی کا خلیفہ بتلایا گیا ہے، آپ کے زمانے کی مسجد موجود ہے، مسجد کے شرقی گوشے میں آپ کا مزار ہے۔ یہ جگہ محلہ شاہ رمز الدین کے نام سے موسوم ہے۔

شاہ رمز الدین کی اولاد میں ایک صاحب مولوی عبد القدیر رمزی گزرے ہیں، انھوں نے ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں دار العلوم سے فراغت حاصل کی لکھنؤ کے نول کشور پریس میں مصحح تھے، علم الحیوانات میں علامہ کمال الدین دمیری کی مشہور ضخیم کتاب حیوٰۃ الحیوان کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جو نول کشور لکھنؤ سے ۔۔۔ء میں شائع ہوا ہے۔ ۱۳۴۷ھ / ۱۹۱۸ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا، اور وہیں مدفون ہیں۔

---

[1] شاہ محب اللہ الہ آبادیؒ کو شیخ ابو سعید گنگوہیؒ (۱۰۴۰ھ / ۱۶۳۰ء) نبیرہ شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ سے خلافت حاصل تھی، اپنے زمانے کے بڑے اولیاء اللہ میں ان کا شمار تھا، علوم ظاہری میں بھی اپنے دور کے علماء میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، فصوص الحکم کی ایک شرح لکھی ہے، نواح الہ آباد میں عظیم قبول عام حاصل تھا ۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء میں الہ باد میں وفات پائی۔ (تذکرۃ العابدین ص ۹۲)

سید غلام رسول

بارھویں صدی اپنا دور پورا کر چکی تھی کہ یہاں ایک بزرگ سید غلام رسولؒ بغداد سے تشریف لائے، ان کے پوتے سید محمد حسن ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے، دیوبند کے مشہور بزرگ سید محمد عبداللہ عرف میاں جی منےؒ شاہ صاحبؒ ان کے ماموں ہوتے تھے۔

میاں جی منےؒ شاہؒ کے خاندانی حالات اور شجرۂ نسب کا پتہ نہیں چل سکا، یہ بزرگ اولیائے کاملین میں سے تھے، ان کے زمانے کے تمام بزرگ ان کی درویشی اور بزرگی کا بہت لحاظ رکھتے تھے، چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے دارالعلوم کی موجودہ عمارت کا سنگِ بنیاد جن حضرات سے رکھوایا اُن میں میاں جیؒ بھی شامل تھے فارسی کے نہایت باکمال استاد تھے۔ قلعہ کی مسجد میں ان کا مکتب جاری تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کی تعلیم میں بڑی برکت دی تھی، شاگردوں میں ہندو مسلمان سب شامل تھے۔

میاں جی منےؒ شاہ نے ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۲ء میں وفات پائی، بندگی شاہ محمد عمرؒ کے قبرستان میں مزار ہے۔

سید محمد حسنؒ نے اپنے ماموں میاں جی منےؒ شاہ صاحبؒ کے بعد ان کے مکتب کو سنبھالا، یہ مکتب بعد میں مصرّ بحال سنگھ کے مکان پر منتقل ہو گیا، نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی ان کی تعلیم و تربیت اور فیض صحبت کے گرویدہ تھے، ساری عمر بچوں کو فارسی اور ریاضی کی تعلیم دیتے رہے

۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں وفات پائی۔

سید محمد حسنؒ کے نامور فرزند مولانا میاں سید اصغر حسینؒ (۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء - ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء) اپنے زمانے کے ایک بافیض بزرگ تھے، حضرت شیخ الہندؒ سے حدیث و تفسیر پڑھی، دارالعلوم میں حدیث و تفسیر کا درس دیتے تھے، اسی کے ساتھ عملیات اور تعویذات وغیرہ کے ذریعے سے خدمتِ خلق فرماتے تھے، تعویذات کے فن میں آپ کو مہارتِ تامہ حاصل تھی، ہندو مسلمان سب آپ کے تعویذات سے فیض یاب ہوتے تھے، اپنے بزرگ ماموں اور والد کے مدرسے کو جو بند پڑا ہوا تھا، دوبارہ جاری کیا، اور دارالمسافرین کے نام سے ایک مسافر خانہ کی تعمیر کرائی، اردو زبان میں تقریباً ۳۵ کتابیں ان کی تصنیف و تالیف ہیں، یہ کتابیں عوام و خواص میں بہت مقبول ہیں۔ راقم سطور پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ آپ کی سوانح حیات شائع ہو چکی ہے،

گجرات کے علاقے راندیر میں ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء میں وفات پائی، اور وہیں مدفون ہیں۔

حضرت میاں صاحبؒ کے فرزندوں میں مولانا میاں اختر حسین صاحب دارالعلوم میں طبقۂ علیا کے مدرس ہیں، شعبۂ تعلیمات کی نظامت بھی آپ کے سپرد ہے، نہایت نیک اور مرنجاں مرنج بزرگ ہیں۔ میاں صاحبؒ کے دوسرے فرزند حاجی بلال حسین صاحب اپنے والد کی طرح تعویذات کرتے ہیں، ان کے ایک فرزند مولانا خلیل حسین صاحب

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

حضرت نانوتویؒ کا خاندان اصلاً[1] نانوتہ کا رہنے والا ہے، خود انھوں نے نیرھویں صدی ہجری کے اواخر میں دیوبند کی سکونت اختیار فرمائی یہاں سسرال ہونے کے علاوہ دوسری قرابتیں بھی تھیں، ان کے مورث اعلیٰ قاضی مظہر الدین (وفات ۸۷۸ھ / ۱۴۷۳ء) سلطان بہلول لودھی (۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء - ۸۹۴ھ / ۱۴۸۸ء) کے عہدِ حکومت میں خراسان سے ہندوستان آئے اور یہاں قضاء کے عہدے پر سرفراز ہوئے، ان کے فرزند قاضی میراں بڑے بلند پایہ عالم تھے، سلطان بہلول نے ان کو جاگیر اور نانوتہ کا منصب قضا عطا کیا۔ عہدِ شاہجہاں (۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء - ۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۷ء) میں قاضی میراں بڑے کی اولاد میں ایک بزرگ مولوی محمد ہاشم ہوئے جو دربارِ شاہی میں مقرّب تھے، نانوتہ میں قاضی میراں بڑے کی اولاد خوب پھلی پھولی۔

---

[1] نانوتہ دیوبند سے بجانب مغرب ۱۶ میل ایک قدیم قصبہ ہے جو سہارنپور شاہدرہ لائٹ ریلوے لائن .... پر واقع ہے، اس کی وجہ تسمیہ کی نسبت تاریخ سہارنپور میں لکھا ہے کہ یہ قصبہ نانو نامی گوجر یا راجپوت کے نام پر موسوم ہے نانوتہ کی قدیم تاریخ سے صرفِ نظر کرکے اگر صرف آخری دو صدیوں کی علمی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سرزمین نے جو لعل و جواہر پیدا کئے ہیں وہ قیامت تک نظروں کو خیرہ کرتے رہیں گے

اس خاندان کا تفصیلی شجرہ جو مفتی محمود احمد نانوتویؒ کا مرتبہ ہے نسب نامہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس میں قاضی میراں بڑے کی نسبت مرقوم ہے کہ "اُن کے معارف علمیہ کی خبر پاکر ۸۶۴ھ/۱۴۵۹ء میں سلطان بہلول لودھی نے مراحم خسروانہ سے نوازتے ہوئے فرمانِ قضا وجاگیر کے ساتھ نانوتہ کی قضاء وخطابت اس تصریح کے ساتھ عطا فرمائی کہ قصبۂ مذکور میں متوطن ہو جائیں۔ قاضی صاحب کا سالِ ولادت ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء ہے اور وفات ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء میں بعہد سلطان سکندر لودھی ہوئی [1]

حکیم امیر احمد عشرتی نے مکتوبات یعقوبی کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "سلطان سکندر لودھی نے قاضی مظہر الدین کو جن کا مزار جہاں آباد (دہلی) میں ہے سمرقند سے طلب فرما کر شرف حضوری بخشا، علاوہ دیگر اعزازہائے فراواں کے عہدۂ قضا جہاں آباد ارزانی فرمایا۔"

حکیم عشرتی کا یہ بیان صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ ۸۷۸ھ/۱۴۷۳ء بہلول لودھی کا عہدِ سلطنت ہے، سکندر لودھی ۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کا شجرۂ نسب یہ ہے:-

مولانا محمد قاسمؒ بن شیخ اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش بن علاء الدین بن ابو الفتح بن محمد مفتی[2] بن عبد السمیع

---

[1] نسب نامہ مرتبہ مفتی محمود احمد نانوتوی ص ۲ مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی

[2] نسب نامہ میں یہ نام محمد معین لکھا ہوا ہے مگر صحیح نام محمد مفتی ہے

(باقی حاشیہ ۱۲۲ پر)

بن مولوی محمد ہاشم بن شاہ محمد بن قاضی طہٰ بن مفتی مبارک بن شیخ امان اللہ بن شیخ جمال الدین بن قاضی میراں بڑے، بن قاضی مظہر الدین بن نجم الدین ثانی بن نور الدین رابع بن قیام الدین بن ضیاء الدین بن نور الدین ثالث بن نجم الدین بن نور الدین ثانی بن رکن الدین بن رفیع الدین بن بہاء الدین بن شہاب الدین بن خواجہ یوسف بن خلیل بن صدر الدین بن رکن الدین السمرقندی بن صدر الدین الحاج بن اسمٰعیل شہید بن نور الدین القتّال بن محمود بن بہاء الدین بن عبد اللہ بن زکریا بن نور الدین سراج بن شادی الصدیقی بن وحید الدین بن مسعود بن عبد الرزاق بن قاسم بن محمد بن سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ

اس خاندان کے لوگوں کو وقتاً فوقتاً حکومت سے جاگیریں ملتی رہیں شاہجہاں کے عہد میں جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے مولوی محمد ہاشم ایک جلیل القدر عالم گزرے ہیں، اسی زمانے میں حافظ غلام حسین بھی بڑی شخصیت کے مالک تھے، نسب نامہ میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب کو جب دارا شکوہ کے مقابلے میں کامیابی ہوئی تو رمضان کی ۲۸ تاریخ تھی، اورنگ زیب نے کہا کہ "طوی میں سفر اور جنگ کی وجہ سے تراویح میں ختم قرآن نہ ہو سکا، اگر ہمارے لشکر میں کوئی ایسا حافظ ہو جو آج شب میں پورا قرآن شریف سنا سکے تو پیش کیا جائے"۔ اس پر حافظ غلام حسین نے شبینہ میں قرآن سنا کر شاہزادے کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جیسا کہ مکتوبات حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، سوانح قاسمی صفحہ ۳ اور شجرہ شیخ زادگان نانوتہ مرتبہ منشی ظفر احمد نانوتوی میں محمد مفتی تحریر ہے

۱؎ نسب نامہ مرتبہ مفتی محمود احمد نانوتوی ص ۵ و ۶

خوشنودی حاصل کی، حکم ہوا کہ کوئی ضرورت ہو تو عرض کرو، بتلایا گیا کہ نانوتہ میں وہاں کے مناسب حال جامع مسجد نہیں ہے، فوراً احکام جاری ہو گئے اور خوبصورت جامع مسجد مع کنویں کے تیار ہو گئی، اورنگ زیب نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ جامع مسجد کے قریب حافظ غلام حسین کے لئے ایک حویلی بھی تعمیر کی جائے۔

اس خانوادۂ صدیقی کے اراکین علم و امارت کے ساتھ ساتھ دینداری اتباع شریعت کے اوصافِ حسنہ سے متصف رہے ہیں۔

مولانا مفتی محمود احمد صاحب نے اس خاندان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شروع سے آج تک علوم شرعیہ کے ساتھ ساتھ طبابت وغیرہ فنون میں اس خاندان کے لوگ باکمال رہے ہیں، ان علوم کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا، حسبۃً للہ مخلوق کی خدمت انجام دیتے رہے تصوف و طریقت سے غیر معمولی دلچسپی کے ساتھ مروجہ بدعات کے نام سے یہاں کے مشائخ اور شیخزادگان کبھی آشنا نہیں ہوئے۔ یہاں بڑے بڑے اولیاء اللہ کے مزارات ہیں مگر عرس دردشنی کا نام نہیں ہے، زیارت قبور کا مسنون طریقہ ہی معمول رہا ہے، خرافات و بدعات سے کبھی دور کا تعلق بھی نہیں رہا، سوم اور چہلم وغیرہ کا رواج کبھی نہیں ہے، بس ساری دوڑ ختم قرآن کی ہے، مروجہ مجالس میلاد سے بھی شیخزادگان بالکل الگ تھلگ رہے مگر سنت سے بہت زیادہ دلچسپی رہی ہے [1]

---

[1] نسب نامہ ص ۵

اپنے علم وفضل اور صلاح وتقویٰ کے لحاظ سے صدیقی شیوخ کا یہ خاندان ممتاز حیثیت کا مالک رہا ہے، استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے، جنھوں نے دہلی میں مولانا رشید الدین خاں سے تحصیل علم کی تھی اور پھر دہلی کالج میں شعبۂ عربی کے صدر مدرس مقرر ہو گئے تھے، ان کے فیض تعلیم وتربیت سے نانوتہ میں علماء کی ایک بڑی جماعت تیار ہو گئی، جس کا ہر ہر فرد آسمانِ علم وفضل کا درخشندہ ستارہ کہے جانے کا بجا طور پر مستحق ہے، اس جماعت میں حضرت مولانا محمد قاسمؒ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ، مولانا محمد مظہرؒ، مولانا محمد احسنؒ اور مولانا محمد منیرؒ خاص طور پر مشہور ومعروف ہیں۔

قاضی میراں بڑے کی چودھویں پشت میں شیخ اسد علی تھے، جن کے نامور فرزند حضرت مولانا محمد قاسمؒ ہوئے۔ ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء سالِ ولادت ہے، تاریخی نام خورشید حسین ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی تعلیم کا آغاز وطن میں ہوا، قرآن شریف اور کچھ مکتبی تعلیم کے بعد ان کو دیوبند بھیج دیا گیا، یہاں کچھ دنوں مولوی مہتاب علی کے مکتب میں پڑھا، پھر اپنے نانا کے پاس سہارنپور چلے گئے جو وہاں وکیل تھے، سہارنپور میں مولوی محمد نواز سے عربی صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء کے آخر میں حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ اپنے ہمراہ دہلی لے گئے، وہاں کافیہ شروع کیا، اور بعد ازاں انھیں دلی کالج میں داخل کرا دیا گیا، مگر حضرت نانوتویؒ نے سالانہ امتحان

میں شرکت نہیں کی، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ لکھتے ہیں:۔

"والد مرحوم نے مولوی صاحب کو مدرسہ عربی سرکاری میں داخل کیا اور فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعد حساب کی مشق کر لو۔ چند روز میں چرچا ہوا کہ مولوی صاحب سب معمولی مقالے دیکھ چکے ہیں اور حساب پورا کر لیا ہے، منشی ذکاراللہ صاحب چند سوالات لائے وہ نہایت مشکل تھے، ان کے حل کر لینے سے مولانا کی نہایت شہرت ہوئی، جب امتحان سالانہ کے دن ہوئے، مولوی صاحب امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا، سب اہل مدرسہ کو علی الخصوص ہیڈ ماسٹر صاحب کو کہ مدرس اول انگریزی تھے نہایت افسوس ہوا۔" [1]

دلی کالج میں داخلے سے پہلے مولانا مملوک علیؒ سے منطق و فلسفہ و کلام کی کتابیں میر زاہد، قاضی مبارک، صدرا، شمس بازغہ وغیرہ پڑھ چکے تھے، آخیر میں اس درس گاہ میں حاضر ہوئے، جو علوم قرآن و حدیث میں سارے ہندوستان میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مسندِ علم پر حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ رونق افروز تھے، ان سے علم حدیث کی تحصیل کی، زمانہ طالب علمی میں ہی ان کی ذہانت علم و فضل اور فہم و فراست کی شہرت عام ہو گئی تھی، ان کے نامور ہم عصر سرسید مرحوم نے لکھا ہے:۔

---

[1] سوانح عمری ص ۷، و ۸ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۶۴ء ۱۳۱۱ھ۔

"لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحٰق صاحب کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے مگر مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ مولوی محمد اسحٰق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے، بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ، بہت لوگ زندہ ہیں، جنھوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمر میں دلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے، ابتدا ہی سے آثار تقویٰ ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کے اوضاع واطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا ؎

بالائے سرش زہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

زمانۂ تحصیلِ علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم وفراست میں معروف ومشہور تھے، ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل وکمال تھے، اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے، ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلوماتِ علمی میں شاہ عبدالعزیزؒ سے کچھ کم ہو، الاّ اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا، مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحٰق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا، درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے[1]

---

[1] علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء ص ۴۶۷ و ۴۶۸

تحصیل علم سے فراغت کے بعد مولانا نانوتویؒ نے ذریعۂ معاش کے لئے مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے مطبع احمدی دہلی میں تصحیح کتب کا کام اختیار فرمایا، اور آخر تک یہی ذریعۂ معاش رہا۔ تصحیح کتب کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی ہمیشہ جاری رہا۔ صحاح ستہ کے علاوہ مثنوی مولانا رومؒ اور دوسری کتابیں بھی پڑھائے مگر درس کسی مدرسے کے بجائے بالعموم مطابع کی چہار دیواری، مسجد اور مکان پر ہوتا تھا جہاں صرف خاص خاص تلامذہ زانوئے تلمذ طے کرتے تھے، ان کے فیض تعلیم سے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا احمد حسن امروہیؒ اور مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ جیسے باکمال اور نامور علماء کی جماعت پیدا ہوئی

مولانا نانوتویؒ نے مطبع احمدی[۵۱] دہلی سے تعلق کے زمانے میں صحیح بخاری کی تصحیح کے ساتھ آخر کے چند سیپاروں کا حاشیہ بھی تحریر فرمایا مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ لکھتے ہیں :-

"جناب مولوی احمد علی صاحب سہارنپوری نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کہ پانچ چھ سیپارے آخر کے باقی تھے مولوی صاحب کے سپرد کیا

---

۵۱ مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ نے ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء میں دہلی میں ایک پریس مطبع احمدی کے نام سے قائم کیا تھا، اس مطبع سے کتب حدیث کی اشاعت کا بڑا کام ہوا، مطبع احمدی سے ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں جامع ترمذی، ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں صحیح بخاری اور ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں مشکوۃ المصابیح نہایت اہتمام سے ہندوستان میں پہلی بار شائع ہوئیں (حیات شبلی ص ۸۵)

مولوی صاحب نے اس کو ایسا لکھا ہے کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے، اس زمانے میں بعض لوگوں نے کہ مولوی صاحب کے کمال سے آگاہ نہ تھے، جناب مولوی احمد علی صاحب کو بطور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا، آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کیا، اس پر مولوی احمد علی صاحب نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدون سمجھے بوجھے ایسا کروں، اور پھر مولوی صاحب کا تحشیہ دکھلایا، جب لوگوں نے جانا، اور وہ جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے، علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا جو اول سے التزام ہے اور اس جگہ پر امام بخاری نے اعتراض مذہبِ حنفیہ پر کئے ہیں اور ان کے جواب لکھنے معلوم ہے کہ کتنے مشکل ہیں، اب جس کا جی چاہے اس جگہ کو دیکھ لے اور سمجھ لے کہ کیسا حاشیہ لکھا ہے اور اس حاشیہ میں یہ بھی التزام تھا کہ کوئی بات بے سند کتاب کے محض اپنے فہم سے نہ لکھی جائے [1]"

درس حدیث میں حنفیہ کے اثبات و ترجیح اور تنقیحات و تشریحات کا جو انداز دارالعلوم اور دوسرے بہت سے مدارس میں جاری ہے اس کی ابتدا حضرت نانوتویؒ ہی سے ہوتی ہے، ان سے پہلے درس حدیث میں محض حدیث کا ترجمہ اور الگ الگ مذاہب بیان کر دینے کافی سمجھے جاتے تھے، حنفیہ کے اثبات و ترجیح کا طریقہ مروج نہ تھا،

---

[1] سوانح قاسمی ص ۹ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۱ھ ۱۸۹۸ء۔

حضرت نانوتویؒ کے بعد ان کے تلامذہ میں حضرت شیخ الہندؒ وغیرہ حضرات نے اس طریقے کو جاری رکھا، مولانا نانوتویؒ کی ذہانت وذکاوت، بالغ نظری اور قوتِ استدلال کے متعلق مولانا حکیم منصور علی خاں مرادآبادی جو حضرت نانوتویؒ کے شاگرد تھے، اپنی تصنیف مذہب منصور میں لکھتے ہیں :-

"یہ حقیقت ہے کہ حضرت نانوتویؒ جب کسی اہم اور مشکل مسئلہ کو جمہور کے تصوّرات کے خلاف ثابت کرتے تھے تو اہلِ علم حیران رہ جاتے تھے، جو حکم ظاہر میں قطعاً بے دلیل وبرہان معلوم ہوتا وہ تقریر کے بعد عقل کے مطابق معلوم ہونے لگتا تھا، آپ کے پیش کردہ دلائل کے خلاف بڑے بڑے اربابِ علم وفضل کو جرأت نہ ہوتی تھی" [1]

ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے دوش بدوش عیسائیت نے بھی بڑا فروغ حاصل کیا، اور ہر ممکن صورت سے ہندوستان کے لوگوں خصوصاً مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی گئی، اسی کے ساتھ انگریزوں نے ایک خطرناک سازش یہ کی کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابلے میں مناظرے کے لئے لا کھڑا کیا، مولانا نانوتویؒ نے نہایت ہمّت وجرأت سے کام لے کر اس سازش کو ناکام بنا دینے کی زبردست خدمت انجام دی۔ چاندپور ضلع شاہجہاں پور میں ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں خدا شناسی کے نام سے بڑے پیمانے پر ایک میلہ لگایا گیا، جس میں

---

[1] مذہب منصور جلد دوم ص ۱۷۸

عیسائی، ہندو اور مسلمان تینوں مذہب کے نمائندوں کو بذریعۂ اشتہارات دعوت دی گئی کہ وہ اپنے اپنے مذاہب کی حقّانیت کو ثابت کریں، حضرت نانوتویؒ اپنے چند تلامذہ کے ساتھ شریک جلسہ ہوئے اور ابطالِ تثلیث و شرک اور اثباتِ توحید میں ایسی معرکۃ الآرا تقریر فرمائی کہ حاضرینِ جلسہ موافق و مخالف سب مان گئے۔

دوسرے سال ۱۲۹۴ھ ۱۸۷۷ء میں پھر یہ میلہ منعقد ہوا، مولانا نانوتویؒ نے اس مرتبہ بھی ایسی زبردست تقریر فرمائی کہ کسی سے اس کا جواب بن نہ آیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی حضرت نانوتویؒ نے مردانہ وار حصہ لیا، مگر اس وقت کے بگڑے ہوئے سیاسی حالات کے باعث کامیابی سے ہم کنار ہونے کا موقع میسّر نہ آسکا۔

مزاج میں استغنا اور عجز و انکسار اس درجے کا تھا کہ علماء کی مخصوص وضع جبّہ و دستار وغیرہ کا کبھی استعمال نہیں کیا، تعظیم سے بہت گھبراتے تھے، فرمایا کرتے کہ "علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسی خاک میں ملاتا کہ کوئی کبھی نہ جانتا"

جن امور میں نمایاں ہونے کا موقع ہوتا اس سے عموماً گھبراتے تھے، ۱۲۷۷ھ ۱۸۶۰ء میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے، حج سے واپسی کے بعد مطبع مجتبائی میرٹھ میں تصحیح کتب کے سلسلے میں ملازمت کرلی، ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء تک اس مطبع سے وابستہ رہے، اسی زمانے میں دوسری

مرتبہ حج کے لئے جانا ہوا، واپسی کے بعد مطبع ہاشمی میرٹھ سے تعلق قائم ہوگیا، درس وتدریس کا مشغلہ اگرچہ ہمیشہ جاری رہا مگر کسی مدرسے کی ملازمت کبھی پسند نہیں کی۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف لکھتے ہیں :۔

"یہ سب کو معلوم ہے کہ مدرسہ اسلامی دیوبند آپ ہی کا ساختہ پرداختہ ہے اور کیا کچھ اس کا کارخانہ کہ چھوٹی سی سرکار مگر ہرگز اسکی کسی چیز سے نفع نہیں اٹھایا، اوائل میں اہل شوریٰ نے درخواست کی کہ آپ بھی اس مدرسے کی مدرسی قبول فرمائیے اور اس کے عوض کسی قدر تنخواہ، مگر قبول نہ فرمایا، اور کبھی کسی طور یا ڈھنگ سے ایک حبّہ تک کے مدرسے سے روادار نہ ہوئے، حالانکہ رات دن مدرسے کی خوش اسلوبی میں مصروف رہتے اور تعلیم میں مشغول، اگر کبھی بضرورت مدرسہ کے قلم دوات سے اپنا کوئی خط لکھ لیتے تو فوراً ایک آنہ مدرسے کے خزانے میں داخل کر دیتے"۔ [1]

حضرت نانوتویؒ کی دو درجن سے زیادہ تصانیف ان کی یادگار ہیں انھوں نے اپنے زمانے کے ان مسائل پر قلم اٹھایا ہے جو اس وقت زیادہ تر زیر بحث تھے، ان کی تمام تصانیف کسی نہ کسی استفسار کے جواب میں لکھی گئی ہیں، مسائل شرعیہ کو دلائل عقلی سے ثابت کرنے اور فلاسفہ کے مسائل کو دلائل عقلیہ سے رد کرنے میں ان کو زبردست کمال حاصل تھا۔

---

[1] سوانح مخطوط بجواد سوانح قاسمی جلد اول ص ۵۳۶

وفات ۷۹ سال کی عمر میں ۴ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء پنج شنبہ کے دن علم وعمل کا یہ آفتابِ عالم تاب دیوبند کی سرزمین میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا [1]

دارالعلوم کی شمالی جانب آپ کا مزار پُر انوار ہے، یہ مزار قبرستان قاسمی کے نام سے موسوم ہے، یہاں بے شمار علماء وطلباء اور دوسرے لوگ آسودۂ خواب ہیں۔

مولانا نانوتویؒ کے تفصیلی حالات کے لئے ان کی حسبِ ذیل سوانح عمریوں سے مراجعت کی جائے :-

(۱) سوانح عمری مولانا محمد قاسمؒ مصنفہ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ

(۲) سوانح قاسمی مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی

(۳) انوار قاسمی مصنفہ مولانا انوار الحسن شیرکوٹیؒ

مولانا نانوتویؒ نے دو صاحبزادے مولانا حافظ محمد احمد اور محمد ہاشم یادگار چھوڑے، مؤخر الذکر کا جوانی میں مکہ معظمہ میں انتقال ہوگیا،

---

[1] مولانا نانوتویؒ کی تاریخ وفات کے متعلق یہ عجیب بات ہے کہ روداد دارالعلوم ۱۲۹۷ھ میں وفات کا مہینہ جمادی الاخریٰ لکھا ہے، حضرت نانوتویؒ کے تلمیذ مولانا حکیم منصور علی خاں مرادآبادی نے بھی مذہب منصور میں یہی مہینہ لکھا ہے مگر ازروئے تقویم یہ صحیح نہیں ہے، سرسید مرحوم نے اپنے تعزیتی مضمون مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی اشاعت مؤرخہ ۲۴ر اپریل ۱۸۸۰ء میں تاریخ وفات ۱۵ر اپریل ۱۸۸۰ء لکھی ہے، ازروئے تقویم ۴ر جمادی الاولیٰ کی مطابقت ۱۵ر اپریل سے ہوتی ہے، اس کے علاوہ حضرت نانوتویؒ کے معاصر مولانا فضل الرحمٰنؒ نے بھی اپنے قطعۂ تاریخ وفات میں ۴ر جمادی الاولیٰ ہی لکھا ہے، سوانح قاسمی میں بھی جمادی الاولیٰ ہی لکھا ہے، اس لئے اوّل الذکر دونوں تحریروں میں جمادی الاخریٰ لکھنے میں تسامح ہوا ہے۔

حافظ صاحب تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء میں دارالعلوم کے مدرس مقرر ہوئے[۱]، ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں دارالعلوم کے مہتمم بنائے گئے آپ کے دورِ اہتمام میں مدرسہ عربی سے دارالعلوم بنا اور اس کا حلقۂ اثر بہت وسیع ہوگیا، انتظام و انصرام کا خاص ملکہ تھا۔ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں دارالعلوم کا عظیم الشان جلسۂ دستار بندی اُن ہی کے دورِ اہتمام میں ہوا تھا، اہتمام کی مصروفیتوں کے ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ بھی تھا، تفہیم مضامین میں کمال حاصل تھا، آخر میں سابق ریاست حیدرآباد دکن میں مفتیٔ عدالت مقرر ہوئے۔ ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

حافظ صاحب کے خلف الصدق مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ مدت دارالعلوم میں مدرس رہے۔ ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۵ء میں دارالعلوم کے نائب مہتمم اور پھر ۱۳۴۸ھ/۱۹۳۰ء میں مہتمم مقرر ہوئے، آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم نے بڑی ترقی کی ہے، اہتمام کے ساتھ تعلیمی سلسلہ بھی جاری ہے، تفسیر و حدیث کی اکثر کتابیں زیرِ درس رہتی ہیں، آج کل حجۃ اللہ البالغہ کا درس ہوتا ہے۔ جماعتِ علماء میں آپ کی خطابت معروف و مسلم ہے مختلف ممالک کا سفر کر چکے ہیں، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

---

[۱] حضرت حافظ صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب کے تفصیلی حالات دارالعلوم کی تاریخ کے سلسلے میں پیش کئے جائیں گے۔

شعروسخن کا ذوق بھی رکھتے ہیں، ہندوستان کے متعدد علمی اداروں کے رکن ہیں، آپ کے تین صاحبزادے ہیں۔

مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دارالعلوم کے مدرس، مجلس معارف القرآن کے معتمد، اور جامعۂ دینیات اردو کے صدر ہیں، تقریر وخطابت میں اپنے والد بزرگوار کے قدم بقدم ہیں، مذہبی حلقوں میں ان کی تقریریں بہت پسند کی جاتی ہیں۔

دوسرے صاحبزادے مولوی محمد اسلم صاحب رمزی ہیں، دارالعلوم میں نظامتِ برقیات کے منصب پر فائز ہیں، سیرتِ حلبیہ کے مترجم ہیں، انگریزی زبان میں بھی اچھی استعداد کے مالک ہیں، تیسرے فرزند محمد اعظم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔

حافظ صاحب کے دوسرے فرزند مولانا محمد طاہر مرحوم (وفات ۱۳ محرم ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۲ء) تھے، شروع میں دارالعلوم کے مدرس رہے پھر مدتوں دارالعلوم کے کتب خانے اور دارالصنائع کی نظامت کے منصب پر فائز رہے، آخر عمر میں مولانا مرحوم کو قرآن شریف کی تفسیر سے بڑا شغف ہوگیا تھا، ان کے تفسیری مسودات میں سے صرف موذتین کی تفسیر شائع ہوئی ہے، علم عقائد میں انھوں نے ایک کتاب عقائد قاسمی کے نام سے بڑے عام فہم انداز میں لکھی ہے، ان کے فرزندوں میں قاری محمد زاہر قاسمی پہلے آل انڈیا ریڈیو پر قرآن شریف کی تلاوت کرتے تھے پھر پاکستان چلے گئے، ان کے چھوٹے بھائی قاری شاکر قاسمی

ریڈیو پاکستان سے قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں، خوش الحان قاری ہیں، ان کی تلاوت عام طور پر پسند کی جاتی ہے، مولانا محمد طاہر مرحوم کے ایک صاحبزادے مولانا آصف قاسمی ہیں، یہ دارالعلوم کے فاضل ہیں کراچی میں انھوں نے ایک دینی مدرسہ قائم کیا ہوا ہے جو وہاں کے دینی مدارس میں ایک امتیازی درس گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیریؒ

حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ کے ساداتِ عظام میں سے تھے، کشمیر میں ان کا خاندان اپنے علم و فضل اور بزرگی کے لحاظ سے ممتاز حیثیت کا مالک رہا ہے، اُن کے اجداد میں اولاً شیخ مسعودؒ زوریؒ بغداد سے ملتان وارد ہوئے اور وہاں سے لاہور ہوتے ہوئے آخر میں کشمیر میں اقامت گزیں ہو گئے [1]، کہا جاتا ہے کہ ان کو کشمیر کے مشہور بزرگ امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ [2] کے فرزند سید میر محمد ہمدانیؒ سے شرفِ خلافت حاصل تھا، شیخ مسعودؒ نے سلطان زین العابدین، (۸۲۶ھ - ۸۷۹ھ / ۱۴۲۲ء - ۱۴۷۴ء) کے عہد میں وفات پائی، سری نگر کے محلہ زوورہ میں ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔

---

[1] نفحۃ العنبر مصنفہ مولانا محمد یوسف بنوری ص اول

[2] سید علی ہمدانیؒ سلسلۂ قادریہ کے اکابرین میں سے تھے، ۷۸۱ھ / ۱۳۷۹ء میں بعہد والیٔ کشمیر سلطان قطب الدین (۷۷۸ھ / ۱۳۷۶ء - ۷۹۶ھ / ۱۳۹۴ء) کشمیر تشریف لائے کشمیر میں ان کے ذریعے سے اسلام کی بڑی اشاعت ہوئی (بقیہ حاشیہ ص ۱۳۶ پر)

شاہ صاحبؒ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:-

محمد انور شاہ بن معظم شاہ بن شاہ عبدالکبیر بن شاہ عبدالخالق بن شاہ محمد اکبر بن شاہ محمد عارف بن شاہ حیدر بن شاہ علی بن شیخ عبداللہ بن شیخ بابا مسعود نردری [1]

شیخ مسعودؒ سے اوپر کا شجرہ دست یاب نہیں ہے۔

(بقیہ حاشیہ صـ ۱۳۵) اور بہت سے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، ۸۸۶ھ / ۱۴۸۴ء میں وفات پائی (نگارستان کشمیر ص ۲۷۶ و ۲۷۷) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ان کا مادۂ تاریخ وفات ہے — ان کے فرزند سید میر محمد ہمدانیؒ محدث و فقیہ اور صاحب عرفان بزرگ تھے، اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد ۸۸۶ھ / ۱۴۸۱ء میں وارد کشمیر ہوئے، ان کے کشف و کرامات اور اخلاق و عادات کو دیکھ کر اس کثرت سے لوگ مشرف باسلام ہوئے کہ کشمیر کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، اُنھوں نے اسلام کی دعوت و تبلیغ کے علاوہ مسلمانوں کی اصلاح بھی فرمائی، کشمیر میں جو بدعات رائج ہو گئی تھیں ان کو بند کرایا اور سنّت کو رواج دیا، سلطان سکندر (۷۹۶ھ / ۱۳۹۳ء — ۸۳۰ھ / ۱۴۱۷ء) جو اس زمانے میں والیٔ کشمیر تھا سید میر محمد ہمدانیؒ کے حلقۂ بیعت میں داخل تھا۔ ۸۱۸ھ / ۱۴۱۵ء میں کشمیر میں وفات پائی۔

نگارستان کشمیر ۲۷۶ - ۲۷۹۔ مصنفہ قاضی ظہور الحسن ناظم مطبوعہ جید پریس دہلی ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء۔)

[1] نفحۃ العنبر ص اول

شاہ صاحبؒ ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء کو کشمیر کے موضع دُودوان میں پیدا ہوئے، ابتدائی کتابیں اپنے والد بزرگوار اور کشمیر کے دوسرے علماء سے پڑھیں، بعد ازاں ہزارہ (مغربی پاکستان) کے علماء سے منطق و فلسفہ اور بعض دوسرے علوم میں دست گاہ حاصل کی [1]

۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء میں دار العلوم کی شہرت سن کر دیوبند تشریف لائے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اس وقت درسِ حدیث کی مسندِ صدارت پر رونق افروز تھے، ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء میں تفسیر و حدیث کی تعلیم سے فارغ ہو کر کچھ عرصے تک مدرسہ امینیہ دہلی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء میں آپ کشمیر چلے گئے اور وہاں اپنے وطن میں ایک مدرسہ فیض عام کے نام سے قائم کیا ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں آپ نے حج بیت اللہ کیا، ایک مدت تک حجاز میں قیام رہا، اور بالآخر ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء میں دار العلوم کی کشش نے ان کو اپنے دامن میں کھینچ لیا، ۱۳۳۶ھ / ۱۹۵۵ء میں گنگوہ میں عقد کیا اور پھر دیوبند میں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے، خانقاہ کے محلے میں شاہ صاحبؒ کا مکان ایک عرصے تک اہلِ علم کا مرجع رہا ہے۔

۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء میں وفات پائی، عیدگاہ کے جنوب میں مزار پُر انوار ہے گزشتہ سال صدیق مکرم سید محمد انظر شاہ صاحب نے قبرستان کے گرد پختہ چہار دیواری بنوادی ہے۔ شاہ صاحبؒ کے تفصیلی حالات دار العلوم کے

---

[1] مقدمہ فیض الباری ص ۱۸ مطبوعہ دمشق

ضمن میں بیان کیے جائیں گے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے بڑے صاحبزادے صدیق مکرّم سید محمد ازہر شاہ قیصر ہیں، موصوف ایک کہنہ مشق صحافی اور مضمون نگار ہیں، مختلف رسائل واخبارات کے مدیر رہ چکے ہیں، مدّت سے مجلہ "دارالعلوم" کی ادارت کے فرائض بحسن اسلوب انجام دے رہے ہیں۔

دوسرے صاحبزادے مولانا محمد انظر شاہ ہیں، دارالعلوم کے اساتذہ میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں، اُن کے طرزِ تحریر کا ایک خاص انداز ہے جو مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے طرزِ نگارش سے ماخوذ ہے، تذکرۃ الاعزاز اور اسمار حسنیٰ وغیرہ کے مصنف ہیں۔ اسی کے ساتھ تقریر وخطابت میں بھی ان کی شعلہ بیانی معروف ومسلّم ہے۔

مختلف بزرگ

ان بزرگوں کے علاوہ دیوبند میں اور بھی بہت سے بزرگ گزرے ہیں مگر ان کے حالات کا پتہ نہیں چلتا، صرف قبروں کے نشانات ملتے ہیں قبروں پر کتبے بھی لگے ہوئے نہیں ہیں۔

تذکرۃ العابدین کے آخر میں مشائخ کی چند فہرستیں دی ہوئی ہیں، ان میں صرف نام اور تاریخ وفات درج ہے، کچھ مشہور

بزرگوں کے نام یہ ہیں :-

۱۔ شاہ جلال الدین قادری، وفات ۸۸۶ھ / ۱۴۸۱ء دیوبند کی آبادی کے جنوب مشرق میں ان کا مزار ہے جس پر گنبد بنا ہوا ہے، یہ جگہ محلہ شاہ جلال کے نام سے موسوم ہے۔

۲۔ بندگی محمد عمر، وفات ۱۰۰۰ھ / ۱۵۹۱ء حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ (وفات ۹۴۴ھ / ۱۵۳۷ء) اور حضرت شیخ عبد الرزاق جھنجھانوی (وفات ۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء) سے مستفیض تھے، آبادی کے جنوب مغرب میں بھاپلہ روڈ پر ریلوے لائن کے شمال میں ان کا مزار ہے (تذکرۃ العابدین ص ۲۵۴)

۳۔ شاہ ماہ رُو (وفات ۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۲ء) محلہ شاہ ماہ رو میں مزار واقع ہے مزار کے متصل مسجد ہے (تذکرۃ العابدین ص ۲۸۲)

۴۔ سید حسام الدین، جامع مسجد قلعہ کے جنوبی گوشے میں مزار ہے جامع مسجد قلعہ کی امامت و خطابت کے لئے حضرت سید محمد ابراہیمؒ (وفات ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء) نے ان کو جلال آباد لوہاری سے طلب کر کے مقرر کیا تھا، عرصے تک ان کی اولاد میں مسجد کی امامت کا منصب باقی رہا (تاریخ دیوبند، ص ۱۰۶)

۵۔ شاہ شہیدا، سہارنپور، مظفر نگر روڈ کے متصل جانب جنوب ان کا مزار ہے۔

۶۔ شاہ بخاری۔ پورا نام معلوم نہیں ہو سکا، بازار میں ایک اونچے

ٹیلے پر مزار ہے، اس کے متصل جو مسجد ہے وہ مسجد شاہ بخاری کے نام سے موسوم ہے، مسجد بعد کی تعمیر ہے، مسجد میں جو کتبہ لگا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ تعمیر دوبارہ ہوئی ہے کتبے میں لکھا ہے:- تبیض مسجد اد ، آمدہ بروے امید

۲۶ ۱۳ھ

۷۔ قادر شاہ ابدالؒ، گوجر واڑہ کی مسجد کے متصل مزار واقع ہے جس پر گنبد بنا ہوا ہے۔

۸۔ شاہ محمد فریدؒ۔ ان کا مزار بھی گوجر واڑہ میں ہے، نقش بندی سلسلے کے بزرگ ہیں، سنہ ۱۱۰۲ھ / ۱۶۹۰ء میں وفات پائی۔

۹۔ میاں جی نور علی قطب الوقت۔ وفات سنہ ۱۲۰۳ھ (تذکرۃ العابدین ص ۲۵۷ و ۲۶۰)۔

۱۰۔ نصر شہیدؒ۔ ان کا مزار راقم سطور کے مکان تعلیم منزل کے شمال میں ہے۔

۱۱۔ شاہ قطب الدین (وفات سنہ ۱۲۹۰ھ (تذکرۃ العابدین ص ۲۵۸)

۱۲۔ ملّا شہاب الدین کابلی، سنہ ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء محلہ شاہ جلال میں مدفون ہیں۔

ان بزرگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے خاندان یہاں آکر آباد ہوئے، مگر نہ تو ان خاندانوں کے حالات کا پتہ چلتا ہے، اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کب اور کہاں سے آکر آباد ہوئے ہیں۔ ؎

رحمۃ اللہ علیٰ مقابرھم
من اکابرالیٰ اصاغرھم

دیوبند کی سرزمین میں بہت سے اولیاء اللہ اور مشائخ عظام اور علمائے کرام آسودۂ خواب ہیں، ان حضرات کی برکت سے اس سرزمین کو یہ شرف حاصل رہا ہے کہ مسلمانوں میں قدیم زمانے سے دین داری اور اتباعِ شریعت کا جذبہ دوسرے مقامات سے کہیں زیادہ یہاں پایا جاتا ہے۔

یہاں کے مسلمانوں نے آخرت کے نام پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو ہمیشہ اپنا مقصدِ زندگی سمجھا ہے، دینی خدمات کی بیشتر تحریکوں میں یہاں کے مسلمانوں نے دل کھول کر حصّہ لیا ہے، اور اس مبارک فرض کے انجام دینے میں وہ ہمیشہ دوسروں سے آگے رہے ہیں غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ دیوبند کو دینی سرگرمیوں کا مرکز بننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

دیوبند اور سہارنپور کے مسلمانوں کی دینی حالت کی نسبت مولانا حکیم عبدالحیؒ لکھنویؒ اپنے سفرنامہ دہلی اور اس کے اطراف میں لکھتے ہیں:۔

"اس طرف کی مساجد عموماً آباد ہیں، ہر مسجد میں حمام گرم ہو رہے ہیں، ہر مسلمان کم از کم نماز و تلاوت کا ضرور شائق ہے، میرے گمان میں ضلع سہارنپور کے اشرار ہماری طرف کے اخیار سے اچھے ہیں اور اخیار کا کیا پوچھنا ہے،

ان کی تظیر تو اس طرف نہیں ملتی، کسی رنگ میں ہیں مگر خدا کی لو لگی ہوئی ہے، بے تکلف اور سچے دین دار مسلمان ہیں مجلسِ وعظ معمور رہتی ہے، ابتدا سے انتہا تک نہایت شوق و رغبت کے ساتھ سنتے ہیں، ہماری طرف (اودھ) کے مسلمانوں کی طرح نہیں کہ سو میں ایک مجلسِ وعظ میں بیٹھتا ہے اور دل میں یہی خیال رہتا ہے کہ اب اٹھوں تب اٹھوں[1]"

دارالعلوم کی ایک روداد میں یہاں کے مسلمانوں کی دینداری کی نسبت لکھا ہے:-

"یہاں مدرسہ دارالعلوم جاری ہوتے ہی ہر گھر میں علم کا چرچا ہو گیا، اور وہ خاندان جن میں علم کا نشان تک نہ تھا، اُن میں عالم باعمل پیدا ہو گئے، کوئی خاندان بلکہ کوئی گھرانا ایسا نہ رہا جس میں علم کا دخل نہ ہوا ہو، یا جس میں کتبِ دینیہ کا مشغلہ اور مطالعہ نہ ہوتا ہو، اہلِ دیوبند جس مستعدی سے طلبار اور مدرسہ کی خدمت کے لئے کھڑے ہوئے اور جس سرعت و قابلیت کے ساتھ علم کے اثر کو قبول کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ اس جگہ سے بہتر کوئی دوسری جگہ تھی اور نہ اہلِ دیوبند سے زیادہ دوسرے اس کام کے قابل تھے، دیوبند میں مدرسہ کی بدولت

---

[1] دہلی اور اس کے اطراف ص ۱۵۳

علم کا جس قدر گھر گھر چرچا ہوا، اور جو جو فوائد دینی و
دنیوی مدرسہ اور بزرگانِ دین کی صحبت و خدمت سے
ان کو حاصل ہوئے اور جیسی کچھ برکات ظاہری و باطنی
سے معمور ہو کر دولتِ علم و عمل سے وہ مالا مال ہوئے
اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے مدرسہ سے
قبل یہاں کی حالت دیکھی ہو، اور اب موجودہ حالات
کو دیکھ کر موازنہ کریں۔" [۱]

اشرف السوانح میں دیوبند اور اس کے قرب و جوار کی دینی حالت
کے متعلق لکھا ہے کہ :-

"جیسے اس گرد و نواح میں مسلمان شرفاء کے بڑے بڑے
قصبے ہیں مثلاً دیوبند، گنگوہ، کیرانہ، جھنجھانہ، کاندھلہ
اور پانی پت وغیرہ ویسے ہندوستان میں کہیں اور نہیں
پائے جاتے، اور جتنی دین داری اور جتنا علم کا چرچا
ان اطراف میں ہے اتنا اور کہیں نہیں دیکھا گیا، اور جس کثرت
سے بڑے بڑے علماء و فضلاء و مشائخ اس حصۂ ملک
میں گزرے ہیں اور موجود ہیں اتنے اور کہیں نہیں۔" [۲]

---

[۱] روداد دارالعلوم بابت سنہ ۱۳۲۰ھ ص ۲
[۲] اشرف السوانح جلد اول ص ۱۵ طبع دل

اس بارے میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ تاثر ہے جس کا مشاہدہ مولانا اسحٰق سنبھلی کو مظفر نگر کی جیل میں ہوا۔ مولانا موصوف زرعی زمینوں پر قبضے کی کمیونسٹ تحریک میں گرفتار ہو کر کچھ عرصہ مظفر نگر جیل میں قید رہے ہیں، وہ جیل سے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہاں عصر کے بعد دینی اجتماع ہوتا ہے، اس میں پہلے تو صرف مسلمان قیدی اور اسٹاف کے مسلمان شریک ہوتے تھے، اب غیر مسلم قیدی اور اسٹاف کے افراد بھی شرکت کرتے ہیں، نماز بھی پانچوں وقت باجماعت ہوتی ہے، صبح سویرے بیرکیں کھول دی جاتی ہیں تاکہ لوگ جماعت میں شریک ہو سکیں، جمعہ کی نماز بھی باجماعت ہوتی تھی، کافی تعداد میں قیدیوں نے نماز پڑھی تھی۔ یہاں کے قیدیوں میں دینی ذوق اور نماز روزے کا شوق ہے، بعض قیدی جمعرات و جمعہ کو روزہ رکھتے ہیں" [۵]

---

[۵] روزنامہ الجمعیۃ دہلی مؤرخہ ۲۶ اگست ۱۹۷۰ء ص ۴ کالم ۶ و ۷

نظامِ حکومت

"تاریخ سہارنپور کے بیان کے مطابق یہ علاقہ جس میں دیوبند واقع ہے قدیم زمانے میں "مدہ دیش" کہلاتا تھا۔ شمالی ہند کے راجگان کی راج دھانی جب تک ہستناپور (ضلع میرٹھ) رہی یہ علاقہ اس کے ماتحت رہا، مہابھارت کی جنگ میں گورو کی شکست کے بعد اندرپرست (دہلی) کے مہاراجگان کی مملکت میں شامل ہوگیا، گویا ابتدائے آبادی سے بارھویں صدی عیسوی کے اختتام تک ہندو آرین اس علاقے پر حکمراں رہے [1]

دہلی کے راٹھور خاندان کے راجہ پرتھوی راج کی شکست کے بعد ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء میں سلطان شہاب الدین غوری کی شمالی مغربی ہندوستان کی فتوحات کے بعد سلطان غوری اور اس کے جانشینوں کے ممالک محروسہ میں شامل رہا، اور پھر تقریباً ۶۰۰ سال تک دہلی کے مرکزی پایۂ تخت سے وابستہ رہا۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں احمد شاہ (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء - ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء) دہلی کے تخت پر متمکن ہوا، یہ بہت ہی ناکارہ اور نااہل ثابت ہوا، اس کے عہد میں مغلوں کی عظیم سلطنت کا قریب قریب خاتمہ ہوگیا، احمد شاہ نے آصف جاہ اول کے پوتے غازی الدین خاں عماد الملک

---

[1] تاریخ سہارنپور ص ۲۹

کو امیر الامراء کے منصب پر فائز کیا، اہلِ دربار نے ہر طرف سازشوں کا جال بچھا رکھا تھا، غازی الدین خاں احمد شاہ سے بدظن ہوگیا اور اس نے بادشاہ کو گرفتار کرکے اس کی آنکھیں نکلوا دیں، اور جہاندار شاہ کے ایک بیٹے کو عالم گیر ثانی کے نام سے تخت پر بٹھا دیا اور کچھ عرصے کے بعد اسے بھی قتل کرا دیا[1]

اس زمانے میں پایۂ تخت دہلی میں خانہ جنگی کا بازار گرم تھا، ہندوستان کے مختلف صوبے یکے بعد دیگرے خود مختار ہونے لگے تھے بنگال، بہار اور اڑیسہ کے ناظم علی وردی خاں نے دہلی کی مرکزی حکومت سے اپنا تعلق منقطع کرلیا۔ حیدرآباد میں نظام الملک کی حکومت قائم ہوگئی، جنوبی ہند پر مرہٹوں کا تسلط ہوگیا، اودھ کے علاقے پر شجاع الدولہ قابض ہوگیا، پنجاب میں سکھوں نے سیاسی اہمیت حاصل کرلی، دہلی کے قریب جنوب میں جاٹوں کی طاقت ابھر آئی، جس کا مرکز بھرت پور تھا، پایۂ تخت دہلی کے شمال میں روہیلوں کی حکومت قائم ہوگئی، اور یہ علاقہ دہلی کی مرکزی حکومت کے بجائے نواب نجیب الدولہ کی قلمرو میں شامل ہوگیا۔

اس زمانے میں روہیل کھنڈ کے ایک نامور سردار نجیب خاں کو سلطنتِ مغلیہ کی شاہی افواج کی سپہ سالاری کا عہدہ تفویض

---

[1] تاریخ ہند مؤلفہ ہاشمی فرید آبادی حصہ دوم ص ۲۷۹

کیا گیا[۱]، اور اس خدمت کے معاوضے میں نواب نجیب الدولہ کے خطاب

---

[۱] شاہ عالم بہادر شاہ اول (۱۱۱۹ھ - ۱۱۲۴ھ / ۱۷۰۷ء - ۱۷۱۲ء) کے عہد میں پشاور کے علاقے کا ایک شخص داؤد خاں دہلی کے شمال مشرق کے اس علاقے میں آکر آباد ہوا جو بعد میں روہیل کھنڈ کے نام سے موسوم ہوا، داؤد خاں کا آبائی مسکن روہ تھا، اسی کی نسبت سے یہ علاقہ روہیل کھنڈ کہلایا۔

داؤد خاں ایک بہادر سپاہی تھا، کچھ مدت تک مختلف ریاستوں میں ملازم رہا، اس کے انتقال کے بعد اس کا متبنیٰ علی محمد خاں، داؤد خان کا جانشین ہوا، اس نے تھوڑے ہی عرصے میں آنولہ (ضلع بریلی) میں ایک چھوٹی سی ریاست قائم کرلی، جو رفتہ رفتہ بڑھ کر ایک بڑی ریاست بن گئی، روہ کے قرب وجوار کے پٹھانوں کا ایک بڑا گروہ علی محمد خاں کے گرد جمع ہوگیا، یہ لوگ پوری ریاست میں پھیل گئے اور علی محمد خاں کی ریاست روہیل کھنڈ کے نام سے موسوم ہوگئی، علی محمد خاں کے انتقال کے بعد یہ ریاست تین حصّوں میں تقسیم ہوگئی، اس کا ایک حصّہ دوندے خاں کو ملا، اس نے بجنور کے علاقے پر اپنے داماد نجیب خاں کو حاکم مقرر کیا۔

احمد شاہ (۱۱۶۱ھ - ۱۱۶۷ھ / ۱۷۴۸ء - ۱۷۵۳ء) کے عہد میں غازی الدین خاں عماد الملک نے صفدر جنگ کے مقابلے کے لئے نجیب خان کو دہلی بلایا، یہ اپنی ۱۵ ہزار فوج کے ساتھ دہلی پہنچا صفدر جنگ دارالحکومت کا محاصرہ چھوڑ کر چلا گیا، اس خدمت کے صلے میں سہارنپور کے ۵۲ محال نجیب خاں کو جاگیر میں ملے احمد شاہ ابدالی ۱۱۶۹ھ / ۱۷۵۶ء میں جب ہندوستان آیا تو اس نے دیکھا کہ دارالحکومت دہلی امرائے دربار کی سازشوں کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے، اس وقت ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو امرائے دربار کی سازشوں پر قابو پا سکے (باقی حاشیہ صـ۱۴۸ پر)

کے ساتھ دہرہ دون سے علی گڑھ تک کا علاقہ جاگیر میں عطا ہوا۔[1]

نجیب الدولہ نے روہیل کھنڈ میں اپنے نام پر ایک شہر نجیب آباد بسا کر اسے اپنا دارالحکومت بنایا، نجیب الدولہ ایک بہادر سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ علم دوست بھی تھا۔ ملفوظاتِ عزیزی میں لکھا ہے کہ نجیب الدولہ کی سرکار میں نو سو عالم رہتے تھے، جن کے وظائف مقرر تھے۔[2]

راقم سطور کے خاندان میں ایک بزرگ سید نور الحق کا وظیفہ مقرر تھا۔[3] نجیب الدولہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک عظیم الشان شخصیت کا مالک گزرا ہے بہادری، دور اندیشی اور اولوالعزمی میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۷) احمد شاہ ابدالی نے امیر الامراء کے منصب کے لئے نجیب خاں کا انتخاب کیا، اور نواب نجیب الدولہ خاں کے خطاب سے سرفراز کیا اور دہرہ دون سے علی گڑھ تک کا علاقہ جاگیر میں دیا گیا۔

[1] تاریخ سہارنپور ص ۴۳ [2] ملفوظات عزیزی مطبوعہ مطبع مجتبائی میرٹھ، ص ۸۱۔

[3] اس وظیفے کے جاری ہونے کا پروانہ راقم سطور کے خاندان میں محفوظ ہے پروانے پر نواب نجیب الدولہ کی مذور مہر ثبت ہے جس میں یہ عبارت منقوش ہے۔ "بخشی الممالک امیر الامراء نجیب الدولہ نجیب خان بہادر ثابت جنگ فدوی عالمگیر بادشاہ غازی"

پروانے پر غرہ رمضان سنہ ۴ جلوس عالمگیری تحریر ہے۔

احمد شاہ ابدالی نے سلطنت مغلیہ کے چراغ کو گل ہونے سے بچانے کے لئے جس شخصیت کا انتخاب کیا تھا وہ یہی نجیب الدولہ تھا، ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء میں نجیب الدولہ کے انتقال کے بعد ضابطہ خاں اپنے نامور باپ کا جانشین ہوا، اس کے دور کی متعدد یادگاریں اب تک اس نواح میں پائی جاتی ہیں، سہارنپور کا مشہور کمپنی باغ نواب ضابطہ خاں کا لگوایا ہوا ہے، اس باغ کا نام اس نے فرحت بخش رکھا تھا، قلعہ احمد گڑھ جو برطانوی عہد میں جیل خانے میں تبدیل کر دیا گیا اور اب تک موجود ہے وہ نواب ضابطہ خاں کے فرزند نواب غلام قادر خاں کا بنوایا ہوا ہے[1] دیوبند کے محلہ کوٹلہ میں ایک کنواں اور مسجد بھی اسی دور کی یادگاریں ہیں

مرہٹوں نے پانی پت کی جنگ کے دس سال بعد پھر سنبھالا لیا اور اپنے کھوئے ہوئے اثر و اقتدار کو از سر نو حاصل کرنے کے لئے ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء میں شمالی ہند کی دوبارہ تسخیر پر متوجہ ہوئے، اسی زمانے میں شاہ عالم ثانی (۱۱۷۳ھ - ۱۲۲۱ھ/۱۷۵۹ء - ۱۸۰۶ء) ہندوستان کے مشرقی صوبوں بنگال اور بہار کے دیوانی اختیارات انگریزوں کے حوالے کر کے الہ آباد سے ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء میں پایۂ تخت دہلی میں آیا، اس وقت سلطنتِ مغلیہ اپنی انتہائی کمزوری کو پہنچ چکی تھی اور صرف دہلی کے گرد و نواح تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، دارالسلطنت جاٹوں، سکھوں اور روہیلوں کے حملوں کا جولان گاہ بنا ہوا تھا، شاہ عالم کو اپنے مختصر

---

[1] تاریخ سہارنپور ص ۱۸

اور محدود علاقے کو بچانے کے لئے مرہٹوں سے امداد لینی پڑی [1]

---

[1] شاہ عالم بہادر شاہ (۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء - ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء) کے عہد میں مرہٹوں کی طاقت دوبارہ ابھرنی شروع ہوئی، دکن کی مہم میں ایک مرہٹہ سردار سندھیا نے شاہ عالم کا ساتھ دیا تھا، اس کے صلے میں بادشاہ سے کئی پرگنے سندھیا کو جاگیر میں ملے، محمد شاہ کے زمانے میں دکن کے صوبیدار حسین علی خاں کی پشت پناہی سے مرہٹوں نے جنوبی ہند میں زبردست سیاسی اہمیت حاصل کر لی۔ جنوبی ہند میں ان کی چار بڑی ریاستیں قائم ہو گئیں، مرہٹہ سرداروں میں ملہار راؤ ہلکر اور رانوجی سندھیا کو مالوہ کے صوبے میں بڑا فروغ ہوا، آگے چل کر مالوہ میں اندور اور گوالیار کی ریاستوں کی بنیاد رکھنے والے یہی تھے۔

۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء میں شاہ عالم ثانی، الہ آباد سے مادھوجی سندھیا کی امداد کے بھروسے پر دہلی آیا تھا، سندھیا نے شاہ عالم کو ایک گراں قدر نذرانہ پیش کر کے امیر الامراء کا منصب حاصل کر لیا، اور تمام امور سلطنت میں دخیل ہو گیا اور پھر رفتہ رفتہ شاہ عالم کے تمام مقبوضات سندھیا کی تحویل میں آ گئے ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء میں مادھوجی سندھیا کے انتقال کے بعد دولت راؤ سندھیا کا جانشین ہوا، روہیلوں کی شکست کے بعد ان کا علاقہ بھی سندھیا کے ممالک محروسہ میں شامل ہو گیا۔

۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں انگریزی کمانڈر جنرل لیک نے دولت راؤ سندھیا کی فوج کو علی گڑھ، دہلی اور آگرہ میں پے در پے شکستیں دے کر سندھیا کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا، فریقین میں معاہدے کی رو سے سندھیا کے بہت سے مقبوضات پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہو گیا۔

اس دور میں جنوبی ہند سے آگرہ تک مرہٹوں کی حکومت قائم تھی مرہٹوں نے شاہ عالم پر اپنا اثر و رسوخ حاصل کرنے کے بعد اُسے روہیلوں پر حملے کے لئے آمادہ کیا۔ مرہٹوں کے حملہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ پانی پت کی جنگ میں روہیلوں نے مرہٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دیا تھا، مرہٹے اس شکست کا ان سے انتقام لینا چاہتے تھے، بادشاہ بے بس اور مرہٹوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا، مرہٹوں نے شاہ عالم کو لے کر ایک جرار لشکر کے ساتھ نجیب الدولہ کے جانشین ضابطہ خاں پر حملہ کیا، جنگ میں ضابطہ خان کو شکست ہوئی اور روہیلوں کا سارا علاقہ جس میں دیوبند بھی شامل تھا مغل سلطنت کے ممالکِ محروسہ میں شامل ہو گیا، شاہ عالم پر مادھوراؤ سندھیا چھایا ہوا تھا، اس نے ۶۵ ہزار روپے ماہوار شاہ عالم کی پنشن مقرر کر دی اور اس سارے علاقے پر قبضہ کر لیا جو اب تک مغل شہنشاہ کے زیرِ اثر تھا، گویا سلطنتِ مغلیہ کا چراغ گل ہو گیا

اس زمانے میں جس طرح ہندوستان کے جنوبی صوبوں میں مرہٹے حکمراں تھے اسی طرح ہندوستان کے مشرقی صوبوں میں انگریز ایک عظیم طاقت حاصل کر چکے تھے۔

ہندوستان میں انگریزی عہد کی ابتدا اولاً تجارت سے ہوئی ۱۰۲۱ھ / ۱۶۱۲ء میں جہانگیر کا عہد سلطنت تھا، انگریزوں کی پہلی تجارتی کوٹھی سورت میں قائم ہوئی پھر رفتہ رفتہ اس کی شاخیں برہانپور، احمد آباد،

اجمیر اور آگرہ میں کھل گئیں، یہ مقامات اس زمانے کے بڑے تجارتی مرکز تھے، بعد ازاں بمبئی اور کلکتہ میں بھی انگریزوں نے کوٹھیاں بنا لیں جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، احمد شاہ (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء - ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء) کے عہدِ سلطنت میں ہندوستان کی مرکزی حکومت کا شیرازہ بکھر چکا تھا صوبے خود مختار ہو گئے تھے، بنگال میں علی وردی خاں ناظمِ بنگال نے مرکزی حکومت سے انحراف کر کے مرشد آباد میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی تھی، ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶ء میں علی وردی خاں کے انتقال پر اس کا نواسہ سراج الدولہ اپنے نانا کا جانشین ہوا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی جو اب تک صرف تجارتی کاروبار کر رہی تھی ہندوستان کی طوائف الملوکی کو دیکھ کر اس کے کارپردازوں کے دل میں بھی ملک گیری کا شوق پیدا ہوا، انھوں نے کلکتہ میں ایک قلعہ تعمیر کر لیا، اور رفتہ رفتہ اپنی طاقت بڑھانی شروع کر دی۔

سراج الدولہ کو گو علی وردی خاں نے اپنی زندگی ہی میں ولی عہد بنا لیا تھا مگر خود اس کے اہلِ خاندان اور بعض امرا کو یہ بات پسند نہ تھی وہ علانیہ سراج الدولہ کے خلاف تھے، یہ لوگ مرشد آباد سے بھاگ کر کلکتہ میں انگریزوں کے پاس پناہ گزیں ہو گئے، سراج الدولہ نے جب انگریزوں سے ان کو طلب کیا تو انگریزوں نے دینے سے انکار کر دیا سراج الدولہ نے طیش میں آ کر کلکتہ پر حملہ کر دیا، انگریز مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور بھاگ کھڑے ہوئے، کلکتہ پر سراج الدولہ کا قبضہ

ہو گیا، مگر انگریزوں نے مدراس سے کمک لیکر اور میر جعفر کی سازش سے
جو علی وردی خاں کا داماد اور حکومتِ بنگال کا رکنِ رکین تھا، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ صرف
کلکتہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا بلکہ انھوں نے میر جعفر کی شہ پر پایۂ تخت
مرشد آباد پر بھی حملہ کر دیا۔ سنہ ۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں دونوں
فوجوں کا مقابلہ ہوا، سراج الدولہ کے اکثر افراد جو اس کی جانشینی کے
خلاف تھے اس جنگ میں اپنی اپنی جگہ کھڑے لڑائی کا تماشہ دیکھتے
رہے، میر جعفر نے بھی غدّاری کی، اس صورتِ حال سے سراج الدولہ کا
دل ٹوٹ گیا، اس نے راہِ فرار اختیار کی، مگر راستے میں گرفتار ہوا اور
قتل کر دیا گیا، سراج الدولہ کے بعد میر جعفر بنگال کا ناظم بن گیا [۱]

اس کامیابی سے انگریزوں کے حوصلے بڑھ گئے اور اس کے بعد
چند ہی سالوں میں میر جعفر اور اس کے داماد میر قاسم کو انگریزوں نے
یکے بعد دیگرے بے دخل کر کے بنگال اور بہار پر قبضہ کر لیا، اور اودھ
تک ان کی حکومت قائم ہو گئی [۲]

شاہ عالم نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی سندِ دیوانی دے کر
انگریزوں کے قبضے کی توثیق کر دی، اس سلسلے میں شاہ عالم اور انگریزوں
کے مابین جو معاہدہ ہوا وہ "عہدنامہ الہ آباد" کے نام سے موسوم ہے
عہدنامے کی رو سے طے ہوا کہ چھبیس لاکھ روپے سالانہ زرِ مال گزاری

---

[۱] تاریخ ہند سید ہاشمی فرید آبادی ص ۳۱۳
[۲] ایضاً " " ص ۳۱۸

انگریز شاہ عالم کو ادا کیا کریں گے، اس عہدنامے کی رُو سے انگریزوں کو صرف مال گزاری وصول کرنے کے اختیارات دیئے گئے تھے، انتظامی معاملات سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا، مگر بعد میں رفتہ رفتہ تمام اختیارات انگریزوں کے ہاتھ میں آگئے، اور اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو ایک تجارتی ادارہ تھا ہندوستان میں ایک بہت بڑی سلطنت کی بنیاد رکھ دی، اور ایک صدی کی مسلسل جدوجہد کے بعد وہ پورے ہندوستان کی حکمراں بن گئی، تجارت کرتے کرتے کسی سلطنت پر قابض ہونے کی دنیا میں یہ پہلی مثال ہے۔ اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی ایک ایسی طاقت بن گئی تھی جس کی حمائت اور مخالفت پر ہندوستان کی سیاست منحصر ہو چکی تھی۔

شاہ عالم اپنے والد احمد شاہ کے انتقال کے وقت الہ آباد میں تھا، الہ آباد میں بادشاہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح سے مشرقی صوبوں کو واپس لیا جائے، مگر جب اس میں کامیابی نہ ہو سکی اور انگریزوں نے ۱۷۶۵ء میں ۲۶ لاکھ روپے سالانہ زرِ مال گزاری کی ادائیگی پر بنگال اور بہار اڑیسہ کی دیوانی کی سند بادشاہ سے حاصل کر لی [1] تو ادھر سے مایوس ہو کر بادشاہ نے دہلی کا رُخ کیا، اس کا مقصد یہ تھا کہ مرہٹوں کی مدد سے انگریزوں پر قابو پایا جائے ادھر مرہٹے بھی اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو واپس لینے کی فکر میں تھے، ان کے لئے

---

[1] تاریخ ہند سید ہاشمی فرید آبادی ص ۳۱۳

یہ موقعہ غنیمت تھا، انھوں نے فوراً بادشاہ کو اپنی حمایت میں لے لیا مرہٹہ سردار مادھوجی راؤ سندھیا نے شاہ عالم کی پنشن مقرر کردی، اور حکومت کے تمام اختیارات خود سنبھال لیے، اب بادشاہ کی حیثیت ایک نظر بند قیدی کی ہوگئی۔

ضابطہ خاں کے انتقال کے بعد غلام قادر باپ کا جانشین ہوا، منظور علی خاں ناظر قلعۂ معلیٰ نے جو مرہٹوں کی سخت گیری سے تنگ آچکا تھا غلام قادر سے مشورہ کرکے طے کیا کہ مادھوراؤ سندھیا کو دہلی سے نکال دیا جائے، اس وقت سندھیا گوالیار گیا ہوا تھا، غلام قادر موقع پا کر ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء میں دہلی پر قابض ہوگیا اور شاہ عالم سے اپنا آبائی منصب امیر الامرائی حاصل کرلیا، مگر بادشاہ اور غلام قادر میں موافقت نہ ہوسکی بادشاہ نے امداد کے لئے سندھیا کو طلب کیا، غلام قادر نے بادشاہ سے کہا جو خزانہ آپ کے پاس ہے مجھے دیجئے تاکہ اس روپے سے فوج تیار کرکے سلطنتِ مغلیہ کے کھوئے مقبوضات کو مرہٹوں سے واپس لیا جائے، شاہ عالم کے انکار کرنے پر غلام قادر نے مشتعل ہوکر بادشاہ کی آنکھیں نکلوادیں، غلام قادر کی اس حرکت پر تمام امرائے سلطنت بگڑ گئے، اس عرصے میں سندھیا کی فوج دہلی کے قریب پہنچ گئی، غلام قادر دہلی سے نکل کر میرٹھ چلا گیا، راستے میں اتفاق سے گھوڑے سے گر پڑا سندھیا کی فوج جو تعاقب میں تھی اس نے گرفتار کرکے اپنے آقا کے سامنے پیش کیا، جہاں اسے قتل کردیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۲۰۳ھ / ۱۷۸۸ء

کا ہے [1]

اب پھر مادھوراؤ سندھیا دہلی پر قابض ہو گیا، اور دوآبہ کے علاقے ہمیشہ کے لئے روہیلوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، بادشاہ بالکل بے بس اور بے اختیار تھا، صرف لال قلعہ کا مالک رہ گیا تھا سلطنت کے سارے اختیارات سندھیا کے ہاتھ میں تھے، زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ شاہ عالم سندھیا کی سخت گیریوں سے بھی عاجز آگیا انگریز اس موقع کی تاک میں تھے، دسمبر ۱۸۰۳ء میں انگریزی فوج کا کمانڈر جنرل لیک اپنی فوجوں کو لے کر دہلی کی طرف بڑھا، جنگ میں مرہٹوں کو شکست ہوئی [2] دہلی میں سندھیا کی جانب سے ایک فرانسیسی جنرل مامور تھا، وہ پسپا ہو کر آگرہ چلا گیا، جنرل لیک آگرہ کی طرف بڑھا اور اسے بھی فتح کر لیا، بالآخر سندھیا نے انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور صلح کی پیش کش کی، فریقین میں دسمبر ۱۸۰۳ء ۱۲۱۳ھ میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے سندھیا کے دوآبہ کے مقبوضات پر انگریزوں کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا [3]

سہارنپور میں سندھیا کے ناظم کے بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے جی، ڈی گیتھری کو ضلع کا کلکٹر بنایا گیا [4]

۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ سے اگست ۱۸۵۵ء ۱۲۷۵ھ تک اس علاقے پر ایسٹ انڈیا کمپنی

---

[1] تاریخ سہارنپور ص ۵۲-۵۴ - [2] تاریخ سہارنپور ص ۵۸
[3] تاریخ سہارنپور ص ۵۸ [4] تاریخ سہارنپور ص ۶۷

کی حکومت رہی اور اس کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء / ۱۳۶۶ھ تک پورے ہندوستان کی طرح برطانوی حکومت اس علاقے پر حکمراں رہی۔

اب اتر پردیش کا یہ علاقہ آزاد ہندوستان کا ایک جزو ہے۔

جہاں تک تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں سے معلوم ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ دیوبند کی انتظامی حیثیت موجودہ نوعیت کے لحاظ سے ضلع کے تحت تحصیل جیسی رہی ہے۔

عہد اکبری میں ضلع سہارنپور چار دستور اور ۳۶ محال پر منقسم تھا، آئین اکبری میں ایک دستور اور ۲۶ پرگنوں کی یہ تفصیل درج ہے:-

سہارنپور[۱]، دیوبند[۲]، ملہی پور[۳]، بہٹ[۴]، کھجناور[۵]، منگلور[۶]، نانوتہ[۷]، رامپور[۸]، سروٹ[۹]، پور چھپار[۱۰]، جورالسی[۱۱]، کرنی کھیڑی[۱۲]، سرساوہ[۱۳]، چرتھاول[۱۴]، رڑکی[۱۵]، بگھرا[۱۶]، تھانہ بھیم (تھانہ بھون)[۱۷]، مظفرآباد[۱۸]، رائے پور[۱۹]، تاتارپور[۲۰]، امبیٹھ[۲۱]، بھوگ پور[۲۲]، سنبلہیڑا[۲۳]، کھودی[۲۴]، گنگوہ[۲۵]، تغلق آباد[۲۶]، لکھنوتی۔

آئین اکبری میں ضلع سہارنپور کی نسبت لکھا ہے کہ سرکار سہارنپور میں ۳۶ محال ہیں، اس سرکار کا رقبہ ۳۵۳۰۳۷۰ بیگھے ہے۔[۱]

---

[۱] اکبر کے عہد میں بیگھہ ۶۰ مربع گز کا ہوتا تھا، گز الٰہی جسے اکبر نے جاری کیا تھا ۴۱ انگشت کا قرار دیا گیا تھا، موجودہ پیمائش کے لحاظ سے گز الٰہی کو ۳۳ انچ کے برابر سمجھنا چاہیے (ترجمہ آئین اکبری جلد اول حصہ دوم ص ۶۰۴)

سالانہ مال گزاری ۸۷۸۳۹۶۵۹ دام[1] ہیں، سیورغال[2] کے دام ۴۸۵، ۹۹۴ ہوتے ہیں، ۳۹۵۵ سوار اور ۲۲۲۷۰ پیادے یہاں کی

---

[1] دام، تانبے کے سکے کو کہتے تھے، دام کا وزن ایک تولہ آٹھ ماشے سات سرخ کا تھا۔ (آئین اکبری، آئین ۱۰) دام سے کم قیمت کے سکے بھی رائج تھے، ادھیلہ یہ نصف دام کا ہوتا تھا، پاؤلی، یہ سکہ دام کا چوتھائی ہوتا تھا، دمڑی، یہ سکہ دام کا آٹھواں حصہ ہوتا تھا (ترجمہ آئین اکبری جلد اول مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد ص ۵۱)

[2] سیورغال، ترکی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں "مدد معاش" یہ نقد وظیفے کے بجائے ہوتا تھا، حکومت کی جانب سے نقد عطیے کو "وظیفہ" اور زمین کے عطیے کو "سیورغال" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، جن وجوہ سے سیورغال یا وظیفہ دیا جاتا تھا، ابو الفضل نے ان کو تفصیل سے بیان کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) وہ علماء اور مشائخ جو تمام عالم سے بے نیاز ہو کر شبانہ روز درس و تدریس اور رشد و ہدایت میں اپنے آپ کو مصروف رکھتے تھے۔

(۲) وہ معزز اور بزرگ زادے جو علم و فراست کی کمی کی وجہ سے حصولِ معاش کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے تھے۔

(۳) ایسے لوگ جو اپنی کسی فطری کمزوری کی وجہ سے معاش حاصل کرنے سے مجبور اور عاجز ہوں۔

سیورغال اور وظائف کے لئے چونکہ حاجت مندوں کی تشخیص اور ان کی ضرورت کا اندازہ کرنا ہوتا تھا اس لئے اس کے واسطے ایک مستقل محکمہ قائم تھا، نہایت راست باز اور دیانت دار اشخاص اس محکمے کے لئے منتخب کئے جاتے تھے (باقی ص ۱۵۹ پر)

مقامی فوج ہے [۱]، اس سرکار میں مختلف قومیں آباد ہیں۔

برطانوی عہدِ حکومت میں ۱۸۳۴ء / ۱۲۵۰ھ کے بندوبست میں ضلع سہارنپور کے تحت دیوبند کو تحصیل مقرر کر کے اس کے تحت ۳ پرگنے دیوبند، ناگل اور رام پور قائم کر دئے گئے جو تاحال قائم ہیں۔

ضلع سہارنپور کا موجودہ رقبہ ۲۱۲۶ مربع میل ہے، اس میں ۱۶۲۶ دیہات ۱۶ قصبے اور ۴ تحصیل ہیں، اس ضلع کی کل آبادی ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۳۵۳۶۳۶ ہے، اس میں ۹۱۵۱۱۴ ہندو ۴۱۱۵۶۲ مسلمان، ۱۸۴۰۱ سکھ اور ۸۵۵۹ دوسری قومیں آباد ہیں۔

تحصیل دیوبند کا رقبہ ابوالفضل نے عہد اکبری میں ۳۳۵۸۶۱ بیگھے لکھا ہے، سالانہ مال گزاری کی تعداد ۶۴۷۷۹۷۷ دام تھی یعنی موجود

(بقیہ حاشیہ ص۱۵۸) ان کے لئے ضروری تھا کہ اس نوع کے لوگوں کے حالات سے ہر وقت باخبر رہیں، اس محکمے کا افسرِ اعلیٰ "صدر" کہلاتا تھا، قاضی اور میرعدل اس کے ماتحت ہوتے تھے، صدر کے کاموں میں مدد دینے کے لئے ایک عہدہ "دیوانِ سعادت" کا بھی ہوتا تھا۔

(ترجمہ آئینِ اکبری، جلد اول مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ص ۴۰۲ و ۴۰۳)

[۱] ترجمہ آئین اکبری جلد اول حصہ دوم مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ص ۹۹۸

حساب سے ۱۶۱۹۴۹ روپے ۱۷ دام، سیورغال کی رقم ۶۴۱۹۴۶ دام تھی [۵۲]

۱۳۴۹ھ فصلی میں یعنی ہندوستان کی آزادی کے بعد تحصیل دیوبند کی سالانہ مال گزاری ۲۵۷۶۴۶ روپے ۱۲ آنے تھی [۵۳]

۱۸۶۶ء میں تحصیل دیوبند میں ۳۷۹ مواضعات تھے، مال گزاری ۲۷۷۰۵۵ روپے تھی [۵۴]

خاتمۂ زمینداری کے بعد اب (۱۳۷۶ھ فصلی) میں تحصیل دیوبند کا مالیانہ ۹،۳۳،۵۵۹ روپے سالانہ ہے [۵۵]

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے قبل کے ملکی اور عدالتی نظم و نسق کے متعلق اس سے زیادہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ دیوبند میں دیوانی اور فوجداری کی دو عدالتیں قائم تھیں، اول الذکر منصفی کے نام سے موسوم تھی اور مؤخر الذکر قاضی کی عدالت کہلاتی تھی، ان عدالتوں کی زبان پہلے فارسی تھی، ۱۸۳۶ء / ۱۲۵۲ھ میں فارسی کے بجائے اردو عدالتوں کی زبان قرار دی گئی [۵۶]

---

[۵۱] ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں برطانوی گورنمنٹ نے سیورغال کی اراضیات کے بڑے حصے کو ضبط کر لیا۔

[۵۲] ترجمہ آئین اکبری جلد اول حصہ دوم مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ص ۹۹۹

[۵۳ و ۵۵] ماخوذ کاغذات سرکاری تحصیل دیوبند [۵۴] جغرافیہ ضلع سہارنپور ص ۶ مطبوعہ ۱۸۶۸ء

[۵۶] تاریخ سہارنپور ص ۹۲

حفاظتی انتظام کے لئے پولیس کے بجائے فوج رہتی تھی جو ضرورت کے وقت باہر بھی بھیجی جاتی تھی، ابوالفضل نے دیوبند کی مقامی فوج کی تعداد ۶۰ سوار اور ۳۰۰ پیادے بیان کی ہے، فوج کے قیام کے لئے قلعہ بنا ہوا تھا [۱]

موجودہ پولیس کا عملہ ایک کوتوال ۲ سب انسپکٹروں، ۶ ہیڈ کانسٹبل اور ۵۴ کانسٹبلوں پر مشتمل ہے، پولیس اسٹیشن کے علاوہ جو تحصیل میں ہے۔ شہر میں پولیس کی تین چوکیاں بھی ہیں، ایک ریلوے اسٹیشن کی سڑک پر، دوسری منگلور کی سڑک پر اور تیسری تھانہ میں قائم ہے۔ عدالتی نظم کے لئے جو ۱۸۰۵ء / ۱۲۲۰ھ سے جاری ہے وصولِ مال گزاری اور فوجداری مقدمات کے لئے ایک تحصیل دار رہتا ہے جس کے ماتحت متعدد نائب تحصیلدار مقرر ہیں۔

دیوانی کے مقدمات کے لئے منصفی قائم ہے۔

امپیریل گزیٹر آف انڈیا میں دیوبند کے متعلق حسبِ ذیل ملکی، جغرافی عمرانی اور تمدنی معلومات درج ہیں :-

دیوبند، یو، پی میں سہارنپور کی جنوبی تحصیل ہے، جو ۲۹ - ۳۴ اور ۲۹ - ۵۳ عرض البلد اور ۷۷ - ۲۱، اور ۷۷ - ۴۹ طول البلد پر واقع ہے، جنوب میں ضلع مظفر نگر کی سرحد کے ساتھ یہ تحصیل پھیلی ہوئی ہے، یہ سرحد مصنوعی ہے، اس تحصیل میں تین پرگنے رام پور، ناگل

---

[۱] آئین اکبری، مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۹۳ء ص ۱۴۲

اور دیوبند ہیں۔ تحصیل دیوبند کا رقبہ ۳۸۵ مربع میل ہے، جس میں ۳۲۰ مربع میل ۱۹۰۳ء میں زیرِ کاشت تھا۔ آبادی ۱۸۹۱ء میں ۲۰۵,۶۲۷ سے بڑھ کر ۱۹۰۱ء میں ۲۲۰,۱۵۲ ہوگئی، تحصیل میں تین قصبات ہیں، ان میں رام پور سب سے بڑا ہے، اس تحصیل میں ۳۱۱ مواضعات ہیں، ۱۹۰۳ء میں زرِ مال گزاری ۳۸۵,۰۰۰ روپے تھا، ابواب کی رقم ۶۴,۰۰۰ روپے تھی۔ تحصیل کا مغربی حصہ نہرِ جمن شرقی سے سیراب ہوتا ہے، اور مشرقی حصہ میں نہر گنگ کی شاخ دیوبند سے آب پاشی ہوتی ہے، نہر شاخ دیوبند ۱۸۸۰ء میں جاری ہوئی تھی، ۱۹۰۳ء میں آب پاشی کا رقبہ ۱۱۲ مربع میل تھا۔

دیوبند اپنی ہم نام تحصیل کا صدر مقام ہے، اس کی جائے وقوع ۲۹-۴۲ عرض البلد اور ۷۷-۴۱ طول البلد ہے، مشرقی دوآب سے پنجاب جانے والی پرانی سڑک پر واقع ہے، آبادی ۱۹۰۱ء میں ۲۰,۱۶۷ تھی جس میں نصف سے زائد ۱۱۸۲۵ مسلمان تھے۔

غیر مصدقہ روایات کے مطابق قصبہ کا نام ایک مقدس جنگل دیوی بن کی وجہ سے پڑا ہے، یہاں ایک سالانہ مذہبی میلہ دیوی کے مندر پر ہوتا ہے۔ مقامی روایات ہیں کہ پانڈوؤں نے ملک بدر ہونے کی پہلی مدت یہیں گزاری تھی، یہاں کا قلعہ سالار مسعود غازی کے اوّلین مفتوحہ قلعوں میں سے تھا، غدر کے زمانے میں کئی واقعات ہوئے، جن پر آسانی سے قابو پالیا گیا۔

دیوبند، کالی ندی سے جانب مغرب ۲½ میل کے فاصلے پر واقع ہے، پانی کے نکاس کے قدرتی ذرائع ریلوے اور نہروں کی تعمیر کی وجہ سے تبدیل ہو گئے ہیں، سرحدی مقامات میں پانی کا نکاس بہت اچھا ہے۔

یہاں کا عربی کالج شمالی ہند میں اپنی اہمیت کا واحد ادارہ ہے یہ ۱۸۶۷ء کے قریب قائم ہوا تھا، افغانستان، بخارا، اور سمرقند تک سے یہاں طلباء آتے ہیں، یہاں پر اسلامی دینیات کی تعلیم مشرقی طرز پر دی جاتی ہے، اس ادارہ کا حکومت سے کوئی مالی تعلق نہیں ہے۔

دیوبند میں ایک انگریزی اور ایک ورناکیولر اسکول جاری ہے تحصیل اور منصفی کے علاوہ یہاں ایک اسپتال بھی ہے۔

میونسپلٹی کا قیام ۱۸۶۸ء میں ہوا، ۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۱ء تک آمد و صرف کا سالانہ اوسط تیرہ ہزار روپے تھا۔

دیوبند غلّے کی برآمد کی بڑی منڈی ہے، فصل کے موقع پر کلکتہ کی مختلف فرموں کے نمائندے یہاں سے گیہوں خریدتے ہیں، صاف شدہ شکر اور تلہن بھی یہاں سے برآمد ہوتی ہے، دیوبند کپڑے اور دیہی کمبلوں کی صنعت کے لئے بھی مشہور ہے [1]

---

[1] امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد ۱۱ ص ۲۴۲ و ۲۴۳ مطبوعہ ۱۹۰۸ء

IMPERIAL GAZE TTEER OF INDIA
VOL. XI PAGEES 242-3. 1908. A.D

میونسپلٹی

دیوبند میں میونسپلٹی قائم ہے، جس کا نظم عوام کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہے، رفاہِ عام کے جملہ امور میونسپلٹی سے متعلق ہیں، یہ میونسپلٹی جون ۱۸۶۸ء/۱۲۸۵ھ سے قائم ہے، اس سے پہلے چوکیداری ٹیکس کے نام سے ۴۴۹ روپے ماہانہ شہر سے وصول کئے جاتے تھے، چنگی کا محصول وصول کرنے کے لئے شہر کے اطراف میں ۸ چوکیاں مقرر تھیں جن کے ذریعے سے تقریباً ۶۰۰ روپے ماہانہ کی آمدنی تھی، ۹ محرر ۲۰ چپراسی چنگی کے کام پر مامور تھے، صفائی کے لئے ۲۵ خاکروب تھے، جن کی مجموعی تنخواہ ۲۴۳ روپے ماہانہ دی جاتی تھی، چنگی کے محصول ہی سے ۳۰۳ روپے ماہوار پولیس کو تنخواہ ملتی تھی، بقیہ روپیہ سڑکوں کی مرمت و تیاری، نالیوں وغیرہ کے بنانے پر صرف ہوتا تھا[1]۔ ۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۱ء تک آمد و صرف کا سالانہ اوسط تیرہ ہزار روپے رہا[2]، اب چنگی کی بارہ چوکیاں قائم ہیں۔

باہر سے آنے والی اشیاء جو تجارت کی غرض سے لائی جائیں ان پر چنگی کا محصول لیا جاتا ہے، چنگی کے قوانین کی رو سے ایسی اشیاء پر بھی محصول مقرر ہے جو اگرچہ فروختگی کے لئے نہ لائی جائیں مگر مقدار کے لحاظ سے اس قدر ہوں کہ ان کی خرید و فروخت کی جا سکے۔

---

[1] تاریخ سہارنپور ص ۱۶۲

[2] امپیریل گزیٹیر آف انڈیا جلد ۱۱ ص ۲۴۳

سنہ ۴۹-۱۹۵۰ء میں دیوبند میونسپلٹی کی آمدنی ۱۵۴۸۰۱ روپے تھی سنہ ۶۹-۱۹۷۰ء میں یہ آمدنی ۶۱۵۴۵۰ ہو گئی ہے۔

آمدنی کے بڑے ذرائع چنگی اور مکانوں کا ٹیکس ہے میونسپل بورڈ کے ممبران کی تعداد ۱۷ ہے، میونسپل بورڈ کا صدر چیرمین ہوتا ہے، جو ممبران کے مشورے سے متعلقہ امور انجام دیتا ہے۔

دیوبند پر قزاقانہ حملے

سنہ ۱۱۲۰ھ میں شاہ عالم بہادر شاہ اوّل (سنہ ۱۱۱۸ھ ۱۷۰۷ء - سنہ ۱۱۲۴ھ ۱۷۱۲ء) کے عہد میں سکھوں نے جو اس سے پہلے صرف ایک مذہبی تحریک تھی، گرد گوبند سنگھ کی سرکردگی میں ملک کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا، تھوڑی سی مدت میں تیس چالیس ہزار کا جتھا گرو گوبند سنگھ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گیا، اس جتھے نے پنجاب میں لوٹ مار شروع کر دی، اور سرہند پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا، سرہند سے یہ جتھا سہارنپور کی طرف بڑھا اور اسے "تاخت و تاراج کر ڈالا۔ اس موقع پر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ہندوستان کے سیاسی حالات کا واضح نقشہ پیش نظر رہے۔

دسویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) میں بابر اور اس کے اولوالعزم جانشینوں نے ہندوستان میں جو متحدہ سلطنت قائم کی تھی وہ اٹھارویں صدی عیسوی میں اپنے نقطۂ عروج سے پہنچ کر زوال ہونے لگی تھی، نادر شاہ درّانی کے حملے (سنہ ۱۱۵۱ھ ۱۷۳۸ء) نے مغل بادشاہوں کی

کمزوری اور نا اہلی کو عالم آشکارا کر دیا تھا، تاہم اندرونی طور پر مغل سلطنت کا شیرازہ بندھا ہوا تھا، ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے خاندانوں کی تاریخ میں سب سے زیادہ طویل دور مغلوں کا رہا ہے، ۹۳۳ھ / ۱۵۲۶ء سے ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء تک یعنی تین سو سال سے زیادہ حکومت ایک ہی گھرانے میں رہی، اس لیے وہ تمام ذہنی و فکری اور اجتماعی و سیاسی اور مدنی خرابیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھیں جو ہمیشہ امتدادِ سلطنت اور عروجِ تمدن کے لازمی نتائج رہے ہیں۔ بہادر شاہ اول کے بعد شاہانِ مغلیہ میں عزم و ہمت کا فقدان ہو چکا تھا، اُولوالعزمی جو اس خاندان کا سب سے بڑا جوہر تھا بعد میں آنے والے بادشاہ اس سے محروم ہو گئے تھے، مسلسل خانہ جنگیوں نے مرکزی سلطنت کو کمزور کر دیا تھا، غرض کہ اس عہد میں مغل بادشاہوں میں حکمرانی کی صلاحیت مفقود ہو گئی تھی اور امن و امان کا قیام جو حکمرانی کی پہلی شرط ہے وہ مغلوں کے اس دور میں رخصت ہو چکی تھی، تاہم اندرونی طور پر مغل سلطنت کا شیرازہ بندھا ہوا تھا، اور محمد شاہ بادشاہ کے انتقال ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء تک سلطنتِ مغلیہ کے سرداروں اور صوبیداروں کو علانیہ مرکز سے انحراف یا خود مختاری کا دعویٰ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی تھی، محمد شاہ کے بعد احمد شاہ ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء میں تختِ حکومت پر متمکن ہوا، یہ اپنے پیشرو سے زیادہ نا اہل و ناکارہ نکلا، اس کے عہد میں مغلوں کی مرکزیت کا خاتمہ ہو گیا، اور اب ہندوستان میں مختلف قومیں اور صوبہ دار خود مختار ہونے لگے، ۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۱ء میں

پانی پت کے آخری معرکے کے بعد روہیل کھنڈ کے ایک بہادر سردار نواب نجیب الدولہ کو سپہ سالاری کا عہدہ تفویض ہوا، نجیب الدولہ نے روہیل کھنڈ میں نجیب آباد کو اپنا دارالحکومت قرار دے کر دہلی کے شمالی علاقے میں اپنا اقتدار قائم کر لیا، جنوب میں مرہٹوں کی قوت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی، یہی حالت ملک کے دوسرے حصوں کی تھی، ایک طرف تو صوبوں کی خود مختاری اور خود مغل سلاطین کی کمزوری نے مرکزی حکومت کی بنیادیں ہلا ڈالی تھیں، دوسری طرف خود پایۂ تخت کا یہ حال تھا کہ درباری امرا بادشاہوں پر قابو یافتہ ہو گئے تھے، ان کی خود غرضی کا مقتضا یہ تھا کہ زمامِ حکومت ایسے کمزور ہاتھوں میں رہے تاکہ انھیں اپنی جگہ پر بے غل و غش حکمرانی کرنے کا موقع ہاتھ آ جائے، عمائدِ سلطنت اور فوجی سرداروں کی خود غرضانہ روش اور تنگ نظری نے اندرونی سازشوں کا ایک ایسا جال بچھا دیا تھا، جس سے بچ کر نکل جانا بڑا مشکل بن گیا تھا، بادشاہ کمزور اور عیش پرست ہو گئے تھے، ان میں جہاں بانی اور کشور کشائی کی قابلیت ختم ہو چکی تھی، ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر صوبہ دار اور امرا اپنی اپنی خود مختاری کی فکر میں پڑ گئے، پایۂ تخت دہلی میں سنّی، شیعہ اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے اور ہر طرف خانہ جنگی کا بازار گرم ہو گیا، ان طاقتوں کا آپس میں تصادم ہندوستان کو میدانِ جنگ بنائے ہوئے تھا، جب یہ

یہ طاقتیں برسرِ پیکار ہوتیں تو کوئی اپنے بل بوتے پر دوسرے کو نیچا دکھاتا اور کوئی باہر سے اپنا ہمدرد بلاتا، آپس کے اختلاف اور اندرونی جھگڑوں نے بیرونی طاقتوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی جرأت پیدا کردی، خود پایۂ تخت دہلی میں حکمرانوں کی آئے دن کی تبدیلی کا یہ عالم تھا کہ ۴۷ سال کی مدت میں ۸ حکمراں تبدیل ہوئے، جن میں صرف تین اپنی طبعی موت مرے، چار قتل کئے گئے اور ایک کو اندھا کیا گیا، آگے بڑھنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ اس عہد کی طوائف الملوکی کا ایک اجمالی نقشہ نظر کے سامنے رہے۔

اورنگ زیب عالم گیر (۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۷ء - ۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۶ء) کے جانشین شاہ عالم بہادر شاہ اول (۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۶ء - ۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء) کے انتقال کے بعد ۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء تک ہندوستان کے تختِ حکومت پر جو بادشاہ متمکن ہوئے ان کی تفصیل یہ ہے:-

۱۔ معزالدین جہاں دار شاہ (۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء) بہادر شاہ اول کے انتقال کے بعد اس کے چار بیٹوں میں دہلی کے تاج و تخت کے لئے خوں ریز جنگ ہوئی، معزالدین نے اپنے بھائیوں کو تہہ تیغ کرکے جہاں دار شاہ کے لقب سے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا، مگر یہ صرف ۱۱ ماہ ۵ یوم بادشاہت کرسکا، اپنے بھتیجے فرخ سیر بن عظیم الشان سے شکست کھاکر مارا گیا، جہاں دار شاہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کی گویا پہلی علامت ہے۔

۲ــ جلال الدین فرّخ سیر (۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء - ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء) اس کا زمانۂ سلطنت ۶ سال سے کچھ زیادہ رہا، قابو یافتہ امرا سے ناچاتی ہوجانے پر انھوں نے اسے معزول کر کے قید کر دیا اور پھر قتل کرا دیا گیا۔

۳ــ ابوالبرکات رفیع الدرجات (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء) سید عبداللہ اور سید حسین علی ساداتِ بارہہ نے فرخ سیر کی گرفتاری کے بعد رفیع الدرجات کو تختِ حکومت پر بٹھایا، یہ تپ دق کا مریض تھا، حکومت کا بارِ گراں اٹھا نہ سکا اور صرف تین ماہ گیارہ دن کی سلطنت کے بعد راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔

۴ــ شمس الدین رفیع الدولہ (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء) یہ بھی اپنے بھائی رفیع الدرجات کی طرح کمزور اور بیمار تھا، تین مہینے اٹھائیس دن کے بعد اس نے بھی سفرِ آخرت اختیار کیا۔

۵ــ روشن اختر ابوالفتح محمد شاہ (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء - ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کو اپنے پیشروؤں کے مقابلے میں طویل مدت تک (۳۰ سال کے قریب) حکومت کرنے کا موقع ملا، اس نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر ساداتِ بارہہ کا زور توڑ دیا جو سلطنت کے در و بست پر قابض ہو گئے تھے، مگر چند ہی سال میں عشرت پسندی نے اسے معاملاتِ سلطنت سے بے خبر کر دیا۔ ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء میں نادر شاہ درّانی کا خوں چکاں واقعہ اسی محمد شاہ کے زمانے میں پیش آیا نادر شاہ سے معمولی سی جھڑپ کے بعد محمد شاہ نے اس سے

مصالحت کرلی، مگر نادرشاہ واپس جانے کے بجائے دہلی میں داخل ہوگیا، اور لال قلعہ میں جس قدر زر و جواہر، قیمتی ساز و سامان، تختِ طاؤس، کوہِ نور ہیرا، اور دوسری بیش بہا اشیا جو صدیوں میں جمع ہوئی تھیں ان سب پر قبضہ کرلیا، نادرشاہی فوج کو دہلی میں آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دہلی میں نادرشاہ کے قتل کی خبر مشہور ہوگئی، اس افواہ کا پھیلنا تھا کہ دہلی کے باشندوں نے ایرانیوں کو قتل کرنا شروع کردیا، جب نادرشاہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے طیش میں آکر فوج کو باشندگانِ دہلی کے قتلِ عام کا حکم دے دیا، ایرانی فوج نے دہلی میں خون کی ندیاں بہادیں، بڑی مشکل سے آصف جاہ اول نے نادرشاہ سے غرض معروض کرکے قتلِ عام کو بند کرایا۔

نادرشاہ کے حملے نے مرکزی سلطنت کے رہے سہے اقتدار کو بھی ختم کردیا، سلطنتِ مغلیہ جو پورے ہندوستان پر حکمراں تھی لاشۂ بے جان ہوگئی۔ مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر صوبے یکے بعد دیگرے خود مختار ہوگئے اور بادشاہ کا اقتدار صرف رسمی رہ گیا۔

۶— ابوالنصر احمد شاہ (۱۷۲۸ء - ۱۷۵۳ء / ۱۱۶۱ھ - ۱۱۶۷ھ) یہ بادشاہ تخت نشین ہوتے ہی خانہ جنگی اور اہلِ دربار کی سازشوں میں الجھ گیا، اور بالآخر عماد الملک غازی الدین خاں نے اسے گرفتار کرکے

اور آنکھیں نکلوا کر تختِ سلطنت سے محروم کر دیا۔

۷ — عزیز الدین عالم گیر ثانی (سنہ ۱۱۶۷ھ - ۱۷۵۳ء سنہ ۱۱۷۳ھ - ۱۷۵۹ء) یہ جہاں دار شاہ کا فرزند تھا عماد الملک نے پہلے تختِ سلطنت پر بٹھایا اور کچھ مدت کے بعد خود ہی اسے قتل کرا دیا۔

۸ — عالی گوہر شاہ عالم ثانی (سنہ ۱۱۷۳ھ - ۱۷۵۹ء سنہ ۱۲۲۱ھ - ۱۸۰۶ء) پانی پت کی خوں ریز جنگ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کی بادشاہت کا اعلان کیا، جوان دنوں بنگال اور بہار میں قسمت آزمائی کر رہا تھا، یہ وہی بادشاہ ہے جس نے معاہدۂ الہ آباد کی رُو سے بنگال اور بہار کی دیوانی ۲۶ لاکھ روپے سالانہ کے معاوضے پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کے حوالے کر دی تھی، یہ غلام قادر روہیلہ کے ظلم و ستم کا شکار ہو کر بینائی سے محروم ہو گیا، اور بالآخر مجبور ہو کر سنہ ۱۲۱۹ھ - ۱۸۰۴ء میں اس نے اپنے آپ کو انگریزوں کی حمایت میں دے دیا، اس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے [۱]

---

[۱] شاہانِ مغلیہ کے یہ حالات تاریخ ہند مؤلفہ ہاشمی فرید آبادی باب ۱۳ و ۱۴ مطبوعہ جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد سے ماخوذ ہیں، سنین کے سلسلے میں سلسلۃ الملوک مصنفہ سید احمد خاں ص ۶۴ تا ۶۸ مطبوعہ اشرف المطابع دہلی سنہ ۱۲۶۸ھ - ۱۸۵۲ء اور انوار القلوب مصنفہ شاہزادہ مرزا محمد منعم بن شاہ عالم ثانی سے استفادہ کیا گیا ہے، انوار القلوب کا مخطوطہ راقم سطور کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے جو سنہ ۱۲۵۶ھ - ۱۸۴۰ء کا لکھا ہوا ہے۔

شاہ عالم کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا اکبر شاہ ثانی اور بعد ازاں بہادر شاہ ... ظفر تخت نشین ہوئے، لیکن یہ دونوں انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے، اور صرف لال قلعہ تک ان کی حکومت تھی، پورا ہندوستان برطانوی اقتدار کے تحت آچکا تھا، ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی سربراہی کے الزام میں انگریزوں نے بہادر شاہ کو گرفتار کر کے رنگون میں جلاوطن کر دیا، اور چند سال کے بعد وہیں ہندوستان کا یہ آخری "تاجدار" ۷ نومبر ۱۸۶۲ء / ۱۲۷۹ھ کو عالم غربت میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

شاہان دہلی کے مذکورۂ بالا حالات سے یہ بتانا مقصود تھا کہ مغل بادشاہ اس زمانے میں حکمرانی کی جملہ خصوصیات سے یکسر عاری ہو چکے تھے، اس عہد میں طاقت کا سرچشمہ درحقیقت درباری امراء اور صوبے دار بن گئے تھے، اور یہ امراء بھی چونکہ آپس میں نبرد آزما رہتے تھے اس لئے آئے دن یہ بھی اداتے بدلتے رہتے تھے۔

عماد الملک غازی الدین خاں جس نے ۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء میں عالم گیر ثانی کو قتل کرایا تھا اس کی سازش سے مرہٹوں کو پایۂ تخت دہلی پر قابض ہونے کا موقع مل گیا، مرہٹے اس زمانے میں جنوبی ہند کی زبردست طاقت بن چکے تھے، وہ عماد الملک کی مدد سے لاہور تک پہنچ گئے، ہندوستان کے بڑے حصّے پر ان کا تسلّط ہو چکا تھا، ان کا ارادہ تھا کہ مرہٹہ سردار بالاجی راؤ کے لڑکے بسواس راؤ کو دہلی کے تخت پر بٹھایا جائے، ابھی یہ منصوبہ عملی جامہ پہننے نہ پایا تھا کہ

احمدشاہ ابدالی کے پنجاب میں پہنچنے اور دہلی کی طرف بڑھنے کی اطلاع ملی مرہٹہ سردار بھاؤ جو اس وقت پایۂ تخت دہلی پر قابض تھا ابدالی کی پنجاب میں آمد سن کر اس کو روکنے کے لئے تین لاکھ پیادوں اور سواروں کے ساتھ کرنال کی طرف بڑھا، ادھر احمدشاہ ابدالی ایک لاکھ فوج کے ساتھ پانی پت پہنچ گیا، جہاں دونوں فوجوں کے درمیان زبردست اور فیصلہ کن جنگ ہوئی، جو تاریخ کے اوراق میں پانی پت کی تیسری جنگ کے نام سے موسوم ہے، اس جنگ میں مرہٹوں کو فوج کی کثرت کے باوجود شکست کا منہ دیکھنا پڑا، ایک عام تاریخی اندازے کے مطابق اس جنگ میں کم وبیش دو لاکھ مرہٹے مارے گئے، مرہٹوں کو اس سے پہلے ایسی فاش شکست کبھی نہ اٹھانی پڑی تھی، یہ جنگ ۶ جمادی الثانی ۱۱۷۴ھ (۷ جنوری ۱۷۶۱ء) کو واقع ہوئی [1]

احمدشاہ ابدالی کا مقصد اس جنگ سے ہندوستان کی حکومت حاصل کرنا نہ تھا بلکہ وہ سلطنتِ مغلیہ کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو سنبھالنا چاہتا تھا، عالم گیر ثانی کی خواہش پر اس نے روہیلہ سردار نواب نجیب الدولہ کو پایۂ تخت دہلی میں سپہ سالار بنایا اور خود افغانستان واپس چلا گیا اس زمانے میں روہیلے ایک ابھرتی ہوئی طاقت تھے، اور مستقبل میں ان پر بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔ مگر عماد الملک کی زبردست سازشوں کے سامنے نجیب الدولہ کی ایک نہ چلی، عماد الملک نے مرہٹوں سے ساز باز

---

[1] تاریخ ہند ہاشمی فرید آبادی ص ۲۸۵

کرکے روہیلوں کو شکست دے کر دہلی سے نکال دیا، نجیب الدولہ کو بمشکل روہیل کھنڈ میں پناہ لینی پڑی [1]

آخری دور میں مغلوں کی بربادی کا سب سے بڑا عامل یہی عماد الملک تھا، اس نے ذاتی اغراض کو بروئے کار لانے کے لئے مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کو سہارا دے کر کھڑا کیا، ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں پر کاری ضرب لگائی اور ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۲ء میں سکھوں کو سخت سزا دی مگر خانہ جنگی کی جس آگ کو ابدالی نے بجھا دیا تھا وہ ابدالی کے ہندوستان سے واپس جاتے ہی پھر بھڑک اٹھی، دہلی کی مرکزی حکومت اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ وہ ان پیہم بغاوتوں پر قابو نہ پا سکی، پنجاب میں سکھوں کی اور جنوب میں مرہٹوں کی طاقت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔

۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء میں جب شاہ عالم ہندوستان کے مشرقی صوبوں سے مایوس ہو کر دہلی آیا تو اسے مرہٹوں سے مدد لینی پڑی تھی، مرہٹے پانی پت کی جنگ کے تقریباً دس سال بعد پھر سنبھل گئے تھے اور وہ دوبارہ شمالی ہند کی تسخیر پر متوجہ تھے، شاہ عالم کے ذریعے سے ان کو رفتہ رفتہ پھر پایۂ تخت دہلی میں عروج حاصل ہو گیا، اور آخر میں سندھیا کے ذریعے مرہٹوں کے پیشوا کو تمام ہندوستان میں بادشاہ کی نیابت حاصل ہو گئی، ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں شاہ عالم کی سلطنت میں صرف مغربی دوآبہ، روہیل کھنڈ اور شمالی مشرقی راجپوتانہ کا علاقہ رہ گیا تھا، اور ہندوستان کی

---

[1] تاریخ ہند، ہاشمی فرید آبادی ص ۲۷۹

یہ مرکزی حکومت دہلی کے قرب وجوار تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔
جنوب میں دریائے چنبل سلطنتِ مغلیہ کی آخری سرحد تھی، اس سے آگے مرہٹوں کا راج تھا، پنجاب میں سکھوں کی خود مختار حکومت تھی، مشرقی دوآبہ اور اودھ میں شجاع الدولہ کے جانشین اپنی آزاد حکومت قائم کر چکے تھے۔ پایۂ تخت کے تنازعات میں مرہٹوں کو مدد کے لئے بلایا جاتا تھا۔

مرہٹوں کا صدر مقام پونا تھا، پونا کے حکمران باجی راؤ نے چوتھ وصول کرنے کے لئے جو مرہٹہ سردار مقرر کئے تھے ان ہی میں ایک سردار مادھوجی سندھیا تھا، یہ اگرچہ اپنے آپ کو پونا کے حکمراں کا ماتحت ظاہر کرتا تھا، مگر درحقیقت پونا سے اس کا تعلق محض ذاتی اغراض پر مبنی تھا، شمالی مالوہ اور نواحِ دہلی میں جو مرہٹہ حاکم اور فوجی دستے متعین تھے وہ براہِ راست سندھیا کے ملازم تھے، رفتہ رفتہ مادھوجی سندھیا نے مرہٹوں میں سب سے زیادہ قوت حاصل کر لی

مادھوراؤ سندھیا کو ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۵ء میں شاہ عالم نے امیر الامراء کے عہدے پر مقرر کیا، شاہ عالم برائے نام بادشاہ تھا، سارے اختیارات سندھیا کے ہاتھ میں تھے، دہلی، آگرہ اور دوآبہ کھنڈ کے سارے علاقے پر سندھیا کا قبضہ تھا[۱]

---

[۱] تاریخ سہارنپور ص ۱۵

اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہندوستان پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے چار قوتیں نبرد آزما تھیں، پنجاب میں سکھ، شمال مشرق میں روہیلے، جنوب میں مرہٹے، اور مشرق میں انگریز، ان میں مرہٹے سب سے زیادہ طاقتور تھے، اور اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی حکومت صرف مرہٹوں کے حصے میں آئے گی اور یہی سلطنتِ مغلیہ کے جانشین ہوں گے، چنانچہ ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء میں جب مرہٹوں نے دہلی کو فتح کر لیا تو کوئی ان کا مقابلہ کرنے والا نہ تھا، اور یہ نظر آنے لگا تھا کہ ہندوستان کے اقتدار کے مالک مرہٹے ہی ہوں گے مگر پانی پت کی جنگ میں مرہٹوں کی شکست نے حالات کا رُخ بدل دیا، ہندوستان کے مشرقی صوبوں میں انگریزوں کا اقتدار دن بدن بڑھ رہا تھا، اور یہ ایک ایسی زبردست طاقت تھی جس کے سامنے بالآخر ہندوستان کی تمام طاقتوں کو سرنگوں ہونا پڑا۔

غرض کہ اس زمانے میں دہلی کی سلطنت کی کمزوری سے ملک میں طوائف الملوکی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، کسی مستحکم حکومت کے نہ ہونے سے امن و امان ختم ہو چکا تھا اور لوٹ مار کرنے والوں کی بن آئی تھی، شمال مغرب میں سکھوں کا زور تھا، انھوں نے منظم جتھے بنا کر غارت گری کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، سکھ پنجاب سے نکل کر دوآبہ کے علاقے پر تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ شاہ عالم بہادر شاہ اول کے عہد میں سکھوں نے

سرہند پر یورش کے بعد سہارنپور پر حملہ کیا، وہاں کا فوجدار علی محمد خاں سکھوں کے خوف سے قلعہ چھوڑ کر دہلی چلا گیا، ہر چند شہر کے لوگوں نے مورچہ بندی کر کے حملہ آوروں کا بہادری سے مقابلہ کیا مگر وہ حملہ آوروں کے سیلِ رواں کو نہ روک سکے، سکھوں نے سہارنپور پر قبضہ کر کے خوب لوٹ مار کی، سہارنپور کے بعد سکھوں نے قلعۂ جلال آباد (مظفر نگر) پر حملہ کیا، وہاں کے قلعہ دار جلال خاں[1] نے بڑی بے جگری کے ساتھ حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور انھیں واپس لوٹ جانے پر مجبور کر دیا، دو تین مرتبہ سکھوں کی جانب سے حملے کئے گئے مگر ہر مرتبہ انھیں ہزیمت اٹھا کر لوٹنا پڑا۔

خافی خاں کے بیان کے مطابق آخری مرتبہ ستّر اسّی ہزار فوج کے ساتھ سکھوں نے حملہ کیا، اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا، دورانِ محاصرے میں ایک مرتبہ چار پانچ سو آدمی کدالیں اور پھاوڑے لئے ہوئے قلعہ کی فصیل

---

[1] شہنشاہِ جہانگیر (۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء + ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء) کے عہدِ حکومت میں مغربی افغانستان کے دو نامور سردار میر ہزار خاں اور جان محمد خاں وارد ہندوستان ہوئے، میر ہزار خاں کے فرزند جلال خاں کو تھانہ بھون اور لوہاری کا علاقہ جاگیر میں ملا، جلال خاں نے اپنی جاگیر میں ایک مستحکم قلعہ تعمیر کرا کر جلال آباد نام رکھا، جان محمد خاں کے پوتے دوست محمد خاں نے مالوے میں ریاستِ بھوپال کی داغ بیل ڈالی، جہاں دو سو سال تک ان کی اولاد نے حکومت کی، مگر جلال خاں کو دارالسلطنت کے قریب ہونے کی وجہ سے ملک گیری کا موقع نہ مل سکا۔

گرانے کے لئے بڑھے، مگر بہادر پٹھان تلواریں سونت کر اچانک قلعہ سے باہر نکل آئے اور ایسی بے جگری سے جوابی حملہ کیا کہ محاصرین کو پیچھے ہٹنا پڑا، بیس دن تک محاصرہ جاری رہا، پٹھانوں نے رات کی تاریکی میں سکھ فوج پر کئی مرتبہ کامیاب شب خون مارے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بالآخر سکھوں کو ناکام و نامراد ہو کر لیٹ پا ہونا پڑا [۱]

اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر میں سکھوں کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ برسات ختم ہو جانے پر دوآبہ میں ان کی لوٹ مار کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو جاتا تھا، سکھوں کی یہ مسلح جماعت ان کی اصطلاح میں "دل" کہلاتی تھی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء میں سردار غریب سنگھ نے ضلع سہارنپور اور مظفر نگر کے متمول قصبات و دیہات میں لوٹ مار کی، ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء میں قصبہ تھانہ بھون، اور ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء میں مظفر نگر کو لوٹا، ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں تارا سنگھ نے دیوبند پر حملہ کیا، یہاں ضابطہ خاں کی جانب سے جو حاکم مقرر تھا وہ سکھوں سے لڑتا ہوا مارا گیا سکھوں نے خوب لوٹ مار کی، یہاں سے مظفر نگر کے دیہات کی طرف بڑھے اور تاخت و تاراج کرتے ہوئے مراد آباد کی جانب چلے گئے، اور چند دن کو جا لوٹا، ان پیہم یورشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف ویرانی اور بدنظمی پھیل گئی، تاریخ سہارنپور کے مصنف کے بیان کے مطابق سکھوں کے ان حملوں سے دوآبہ کا علاقہ ویران اور بے چراغ ہو گیا [۲]

---

[۱] خافی خاں ترجمہ اردو جلد چہارم حالات شاہ عالم بہادر شاہ اول ص ۱۰۶، ۱۰۷

[۲] تاریخ سہارنپور ص ۶۱ و ۶۲

سکھوں کی یہ جمعیت جو ایک لاکھ سواروں اور پیادوں پر مشتمل تھی ۱۱۸۹ھ ۱۷۷۵ء میں دیوبند پر حملہ آور ہوئی، یہاں لوٹ مار، تاخت وتاراج، قتل وغارت گری اور آتش زدگی کا اتنا بڑا حادثہ اب تک پیش نہ آیا تھا، اس ظلم وتعدی کے حالات بیان کرنے سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ جن لوگوں نے مزاحمت کی سکھوں نے قابو پاکر ان سے شدید انتقام لیا اور کئی محلوں کو جلاکر خاکستر کر دیا گیا، اس حادثۂ عظیم کی تفصیلات ایک پرانی دستاویز میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ دستاویز ۱۲۱۸ھ ۱۸۰۳ء میں جبکہ دوآبہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہو چکی تھی، سہارنپور کی عدالت میں پیش کی گئی تھی، دستاویز میں لکھا ہے :-

"اضعف العباد، مسمیون حافظ مقبول عالم وجانِ عالم وعلی بخش وکریم الدین وبدرالدین وغلام حسن وملا الٰہی بخش وسراج الدین واللہ دیا ونجابت علی ساکنون قصبۂ دیوبند از ساداتِ عظام ومشائخ کرام وقانون گویان راسخ الکلام وزمینداران وغیرہ سکنہ جمہور انام پرگنہ مرقوم برایں معنیٰ کہ احوالِ حادثات تاخت وتاراج وغارت گری وسوختگی قصبہ مسکنِ ما سائیلون از زیادتی وتعدی زمرۂ سکھاں بدمآل از شوامتِ قسمت مسکنِ ما سائیلون کرۃً بعد اولیٰ ومرۃً بعد اُخریٰ بر جمیع صغار وکبار ایں دیار ہویدا وآشکار خصوصاً ایں دفعۂ اُخریٰ کہ بتاریخ نہم شہر ربیع الاول ۱۱۸۹ھ تارا سنگھ وگھٹیک سنگھ ودادھو سنگھ وجیت سنگھ وصاحب سنگھ وکھنڈا وغیرہ بجمعیت یک لکھ سوار وپیادہ از مقام قصبہ

اندری[1] کہ تخمیناً مفاصلہ چہل کروہ[2] خواہد بود، شباشب تاختہ محاصرہ مسکن ماسائیلون شدہ بغارتے وسوختگی اماکن ومساکن ماسائیلون پرداختہ ہیچ اشیائے از قسم کواغذ وزیور وظروف وغیرہ بخانہ ہیچیک ازمباشندگان قصبۂ ماسائیلون نگزاشتہ تاہیچدہ یوم قیام ورزیدہ بخاطر جمع تمام از نقود وعروض واثاث البیوت خانہ ردبی کردہ کوچیدہ رفتند، بروں رفت ادبار آں مقاہیر نابکار لشہر سوختہ خودہا داخل شدہ بعد انفراغ تجہیز وتکفین مقتولان وانقضائے مکانات آتش شدہ بتوقع یافتگی کواغذ وغیرہ واسناد عزیز تر از ہمہ اثاث البیوت ہرچند تجسس وتلاش نمودیم اصلا ازاں اثرے ونشانے نیافتہ محروم ومضطرب ماندند۔

---

[1] اندری دریائے جمنا کے مغرب میں کرنال کے ضلع میں واقع ہے، عہد اکبری میں یہ ایک بڑا اور پُر رونق قصبہ تھا، یہاں ایک قلعہ بھی تھا مگر اب اس کی حیثیت گاؤں سے زیادہ نہیں ہے۔

[2] کُروہ (بہر دو پیش) کوس کو کہتے ہیں، اس کا فاصلہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں مختلف تھا اور اب بھی مختلف ہے، شمالی ہندوستان اور پنجاب میں کوس سوا میل کا ہوتا تھا، گنگا کے کنارے کے علاقے میں کوس سوا دو میل کا شمار ہوتا تھا، اور بندھیل کھنڈ میں چار میل کا ہوتا تھا، (واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم حاشیہ ص ۶۵۴)

ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ کُروہ کا فاصلہ مختلف مقامات پر مختلف ہوتا تھا، اکبر بادشاہ نے فاصلوں کی پیمائش کے لئے سوطنابوں کا ایک کوس

(باقی صـ۱۸۱ پر)

.....ع۵، ہر کس بر صحتِ ایں
حال و صدق ایں مقال آگہی و اطلاعے داشتہ باشد، حسبۃً للہ مہر و
گواہی خود ہا برایں وثیقہ ثبت نمائند۔"

ترجمہ:- ہم لوگ حافظ مقبول عالم و جان عالم و علی بخش و کریم الدین و
ملا الٰہی بخش و سراج الدین و اللہ دیا و نجابت علی جو قصبہ دیوبند کے سادات
و شیوخ و قانون گو، راسخ الکلام اور زمیندار وغیرہ، ہم پرگنہ دیوبند کے
باشندے ہیں۔ سب یہ بات جانتے ہیں کہ بدقسمتی سے ہمارے وطن قصبہ
دیوبند میں تاخت و تاراج کے واقعات سکھوں کی عاقبت نااندیشی کی وجہ
سے بار بار ہوتے رہے ہیں، جن کو ان اطراف کا ہر چھوٹا بڑا خوب جانتا ہے،
خاص طور پر آخری مرتبہ ۹ ربیع الاول ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء کو تاخت و تاراج کا جو
واقعہ پیش آیا اسے سب بخوبی جانتے ہیں کہ تارا سنگھ، کھٹیک سنگھ، مادھو سنگھ
چیت سنگھ، صاحب سنگھ اور کھنڈا وغیرہ نے ایک لاکھ سوار اور پیادوں

(بقیہ ص۱۸۰) مقرر کیا جسے کردہ کہتے ہیں، ہر طناب میں پچاس گز الٰہی ہوتے تھے،
ابوالفضل کے بیان کے مطابق اکبر نے گز الٰہی ۴۱ انگشت کا جاری کیا تھا (آئینِ
اکبری ابوالفضل ص ۶۰۴ و ۱۱۱۸ مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)
موجودہ حساب سے گز آلٰہی ۳۰۔ انچ کے برابر قرار پاتا ہے اور کروہ ۱۲۵۰۰ فیٹ
کے مساوی سمجھنا چاہیئے، جبکہ موجودہ میل کی مسافت ۵۲۸۰ فیٹ ہوتی ہے، اس حساب
سے کروہ کو ڈھائی میل سے کچھ کم کا سمجھنا چاہیئے۔
ع۵ اس کے بعد کی عبارت اس قدر کرم خوردہ ہے کہ پڑھی نہیں جاتی۔

کے ساتھ قصبہ اندری سے جو دیوبند سے ۴ کوس کے فاصلے پر واقع ہے راتوں رات ہماری بستی پر حملہ کیا اور ہماری آبادی کا محاصرہ کرکے ہمارے مکانوں کو لوٹ کر آگ لگادی، انھوں نے ہمارے گھروں میں نقد، زیور اور برتن وغیرہ کوئی چیز نہیں چھوڑی، یہ غارت گر ۱۸ دن تک یہاں ٹھہرے رہے اور نہایت اطمینان کے ساتھ انھوں نے گھروں کو لوٹا اور پھر نذرِ آتش کر دیا۔

اِن ظالم غارت گروں کے چلے جانے کے بعد ہم اپنے خاکستر گھروں میں داخل ہوئے، اپنے مقتولوں کی تجہیز و تکفین کی اور اپنے سوختہ مکانوں پر متوجہ ہوئے تو کاغذ اور شاہی اسناد و فرامین وغیرہ جو گھر کی تمام چیزوں سے زیادہ قیمتی تھے ان کو ہر چند تلاش کیا مگر سوائے محرومی و ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ آیا، پس جن لوگوں نے اس واقعہ کو دیکھا یا سنا ہے وہ حسبۃً للہ اس درخواست پر اپنی مہر اور گواہی ثبت کر دیں [۱]

---

[۱] اس دستاویز کی نقل درخواست دہندہ سید نجابت علی مرحوم کے خاندان میں محفوظ ہے، تقریباً اسی مضمون کی ایک درخواست شیوخ ٹانک کی جانب سے بھی پیش کی گئی تھی۔

اس میں بھی یہی حالات مرقوم ہیں، اس درخواست کی نقل حاجی محمد طیب مالک قاسمی کلاتھ اسٹور کی خاندانی دستاویزات میں موجود ہے۔

۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء میں رائے سنگھ اور شیر سنگھ دو سکھ سرداروں نے سہارنپور میں قلعۂ احمد آباد کا محاصرہ کر لیا، جی، ڈی گیتھری جو اس زمانے میں ضلع سہارنپور کا کلکٹر تھا قلعہ میں محصور ہو گیا اور قریب تھا کہ وہ سکھوں کے آگے ہتھیار ڈال دے، مگر عین وقت پر سردھنہ کی بیگم شمرو[1] اور کرنل برن انگریزی فوج لے کر پہنچ گئے، اس کمک سے خوف زدہ ہو کر سکھ بھاگ گئے، کرنل برن نے تعاقب کیا اور دیوبند کے قریب ہنڈن ندی پر سکھوں کو زبردست شکست دی، ان کے اکثر سردار مارے گئے، یہ واقعہ نومبر ۱۸۰۴ء / ۱۲۱۹ھ کا ہے۔

مارچ ۱۸۰۵ء / ۱۲۲۰ھ میں سکھوں نے کاندھلہ، تھنجھانہ اور کھانہ بھون میں (جو ضلع مظفر نگر کے متمول قصبات ہیں) لوٹ مار کی مگر جلد ہی انگریزی

---

[1] یہ بیگم میرٹھ کے ایک نواب خاندان کی لڑکی تھی، زیب النساء نام تھا، مگر بیگم شمرو کے نام سے مشہور ہے، ۱۷۵۱ء / ۱۱۶۵ھ میں پیدا ہوئی، اس نے ایک فرانسیسی فوج کے افسر ربن ہارڈٹ سے شادی کر لی تھی، یہ شخص شمرو کے نام سے موسوم تھا، شمرو کے پاس اپنی ایک فوج تھی، اس نے سردھنہ (میرٹھ) میں ایک ریاست قائم کر لی تھی، شمرو کا انتقال ۱۷۷۸ء / ۱۱۹۲ھ میں ہو گیا، بیگم ریاست کی مالک قرار پائی، ۱۷۸۱ء / ۱۱۹۵ھ میں بیگم نے رومن کیتھولک مذہب اختیار کر لیا اور سردھنہ میں ایک عظیم الشان گرجا تعمیر کرایا، ۱۸۳۶ء / ۱۲۵۱ھ میں بیگم شمرو کا انتقال ہو گیا۔

(واقعات دار الحکومت دہلی جلد دوم ص ۲۰۹ و تاریخ سہارنپور ص ۶۵)

فوج کے پہنچ جانے پر سکھوں کو فرار ہونا پڑا، سکھوں کا یہ آخری حملہ تھا، اس کے بعد پھر کبھی ان کو دوآبہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی [۱]

۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ کے ہنگامے کے زمانے میں ایک مرتبہ دیوبند کے قرب وجوار کے جرائم پیشہ دیہات جو کاٹھ کے نام سے موسوم ہیں دیوبند پر چڑھ آئے، ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے مامور عیسائی کوتوال اے بی نال اُن کے خوف سے بھاگ کر سہارنپور چلا گیا، اس زمانے میں ہندوؤں کے سربرآوردہ رئیس پنڈت بھگون سنگھ مصر[۲] تھے، ان کے پاس مسلح سپاہیوں کی کافی تعداد تھی، کاٹھ کے ڈاکوؤں نے پنڈت جی کے مکان پر حملہ کیا، اُن کے سپاہی حملے کی تاب نہ لا سکے، خود پنڈت جی کو اس معرکے میں شدید زخم پہنچے، ڈاکوؤں نے مکان میں داخل ہو کر تمام نقد و جنس لوٹ لی۔

اس دوران میں مسلمانوں کو تیار ہونے کا موقع مل گیا تھا، انھوں نے ڈاکوؤں کو چاروں طرف سے گھیر کر مارنا شروع کیا، مسلمانوں کے حملے

---

[۱] تاریخ سہارنپور ص ۶۲ و ۶۳

[۲] پنڈت بھگوان سنگھ مصر اس زمانے میں دیوبند کے آنریری مجسٹریٹ تھے انکے باپ طبابت کرتے تھے، پنڈت جی کی شادی مہاراجہ رنجیت سنگھ والیٔ پنجاب کے سپہ سالار سردار خوش حال سنگھ کی لڑکی سے ہوئی تھی اس لیے یہ خاندان اس زمانے میں بڑا معزز سمجھا جاتا تھا۔ (تاریخ سہارنپور ص ۱۴ و ۱۶۳)

سے ڈاکو حواس باختہ ہوکر بھاگ کھڑے ہوئے مگر وہ بھگوان سنگھ کے لڑکے کو اغوا کر لینے میں کامیاب ہوگئے، یہ واقعہ ۱۵ر جولائی ۱۸۵۷ء ۱۲۷۴ھ کا ہے

کپتان ڈرمین جو دورے پر تھا اس کو معلوم ہوا کہ ڈاکوؤں نے لڑکے کو اپنے یہاں چھپا رکھا ہے، کپتان ڈرمین نے اپنی سوار فوج سے ڈاکوؤں کا محاصرہ کر لیا، اور لڑکے کو نکال لینے میں کامیابی حاصل کر لی۔

راقم سطور نے یہ واقعہ ایسے لوگوں سے سنا ہے جو اس ہنگامے میں بذاتِ خود شریک تھے، تاریخِ سہارنپور سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے مگر اس میں تفصیلات مذکور نہیں ہیں، صرف حملے اور مسلمانوں کے مقابلے کا مجملاً ذکر ہے [1]۔

غدر کے بعد سزائیں

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی جو عام طور پر "غدر" کے نام سے موسوم ہے، اس میں ہندوستان کے بہت سے مقامات شامل تھے، دیوبند کے لوگوں نے بھی اپنی بساط کے مطابق اس جنگ میں حصہ لیا تھا، بدقسمتی سے جب اس مسلح جنگِ آزادی کو ناکامی اور شکست کا منھ دیکھنا پڑا تو ہر وہ شخص جس نے آزادیٔ وطن کی جنگ میں کوئی حصہ لیا تھا، برطانوی حکومت کا باغی اور مجرم قرار پایا،

انگریزوں نے دوبارہ تسلط حاصل کرنے کے بعد جس غیظ و غضب کے ساتھ اس کا انتقام لیا اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، صرف دیوبند میں ۴۴ اشخاص کو پھانسی پر لٹکایا گیا، آم کے جس درخت پر لوگوں کو پھانسی

---

[1] تاریخ سہارنپور ص ۹۵ ر ۲۷۹ و ۸۰ ۲

دی گئی، اس کو راقمِ سطور نے بھی دیکھا ہے، آم کا یہ درخت "سولی والا" کہلاتا تھا، ۱۹، آدمیوں کو دس دس سال قید اور ۲۰ کو تین تین سال کی سزا دی گئی ۳۴، اشخاص پر جرمانہ عائد کیا گیا اور اسی قدر افراد سے آئندہ پُر امن رہنے کی ضمانت لی گئی، سات آدمی ایسے خوش قسمت تھے کہ ان کو کوڑے مار کر چھوڑ دیا گیا"

مضافات کے تین گاؤں نذرِ آتش کر دئے گئے [1]

۱۸۵۷ء کی اس جنگِ آزادی میں جن مقامات کے لوگوں نے حصہ لیا تھا اُن سب کو کم و بیش انگریزی حکومت کے عقاب و عتاب کا شکار ہونا پڑا دیوبند کے رقبے کا بڑا حصہ سیورغال کے طور پر تھا، آئینِ اکبری میں دیوبند کے رقبے کے دسویں حصے کو سیورغال بتلایا گیا ہے، آئندہ بھی اس میں مغل بادشاہوں کی جانب سے وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہا "غدر" کے بعد قید و بند اور پھانسی کی سنگین سزاؤں کے علاوہ ان سب لوگوں کی معافی و دام زمینوں کو بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔

سیورغال کی ان زمینوں کے ضبط ہو جانے سے شیوخ و سادات کے بہت سے مرفّع حال خاندان نانِ جویں تک کے محتاج ہو گئے، اس وقت انگریز حکام کے غیظ و غضب کا یہ عالم تھا کہ:

جسے دیکھا حاکمِ وقت نے، کہا یہ بھی قابلِ دار ہے!

---

[1] تاریخ سہارنپور ص ۱۶۱، ۲۶۶ و ۲۶۷

سید احمد شہیدؒ کے دیوبندی رفقاء

ہندوستان پر انگریزی تسلّط کی تفصیلات اوپر گزر چکی ہیں، اُس زمانے میں مغلوں کی قوت جس کی عظمت کا ڈنکا کابل و قندھار سے راس کماری اور آسام تک ڈھائی سو برس تک بجتا رہا تھا، مضمحل ہو چکی تھی، اور تمام صوبے ایک ایک کر کے مرکز سے الگ ہو گئے تھے، مغل بادشاہوں نے ہندوستان کے مختلف خطّوں کو باہم جوڑ کر دو سو برس میں جو عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی اس کی سیاسی عظمت اور برتری کا عَلَم سرنگوں ہو رہا تھا، سلطان ٹیپو نے اس کی رگوں میں ہر چند گرم خون دوڑانے کی جدوجہد کی مگر اس کو خود اپنوں کی غدّاری اور کوتاہ اندیشی نے موت کی نیند سلا دیا، غرض کہ اٹھارھویں صدی کے ختم ہوتے ہوئے سلطنت مغلیہ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی عظمت کا آفتاب غروب ہو کر انگریزی اقتدار کی صبحِ صادق نمودار ہو چکی تھی، انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں تقریباً پورا ہندوستان انگریزوں کے زیرِ اقتدار آ چکا تھا، صرف شمال مغرب میں دریائے ستلج کے پار سکھوں کی حکومت باقی رہ گئی تھی، جس سے ۱۸۰۹ء میں انگریزوں نے اتحاد کا معاہدہ کیا ہوا تھا، جو معاہدۂ امرتسر کے نام سے موسوم ہے [۱]

یہ تھے ہندوستان کے سیاسی حالات جن میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی عظیم تحریک عالمِ وجود میں آئی، عوامی سطح پر انگریزوں کے خلاف یہ پہلی تحریک تھی

---

[۱] تاریخ ہند، ہاشمی فرید آبادی ص ۲۷۵

اس کا آغاز انیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں ہوا، اس تحریک کے قائد اپنے زمانے کے مشہور بزرگ اور مجاہد حضرت سیّد احمد شہیدؒ تھے، اس تحریک میں شمال و مغرب اور مشرقی ہندوستان کے بہت سے مجاہدین کے ساتھ دیوبند کے بھی متعدد افراد شریک تھے، جن کا ذکر کرنا یہاں مقصود ہے

ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں جن لوگوں نے ملک کی بہترین خدمات انجام دی ہیں یہ حضرات ان کے ہراول دستے کی حیثیت رکھتے ہیں ہماری ملّی زندگی کو ہلاکت سے بچانے کے لئے یہ پہلا قدم تھا جو اٹھایا گیا، سیّد صاحبؒ اور ان کے رفقاء کی قوت عمل اور ایمان و یقین کی پختگی پر حیرت ہوتی ہے، مجاہدین کا ہر فرد اس نشے میں سرشار تھا اور اپنی اپنی بساط کے مطابق سرگرم عمل، سب ایک ہی دُھن میں لگے رہتے تھے، حوادثِ روزگار سے بے پرواہ ہو کر یہ لوگ جس کٹھن راہ پر گامزن ہوئے اس سے کبھی سرِ مُو انحراف نہ کیا۔ مناسب ہوگا کہ ان افراد کے ذکر سے پہلے تحریک اور اس کے سربراہ کے حالات مختصر طور پر بیان کر دیے جائیں۔

سیّد احمد شہید رح

حضرت سید احمد شہیدؒ مشرقی یوپی میں رائے بریلی کے رہنے والے تھے، یہ اُس خاندان کے چشم و چراغ تھے جو اپنے تقدّس اور بزرگی کے لحاظ سے پورے ہندوستان میں خاص شہرت رکھتا تھا، ان کے مورثِ اعلیٰ شاہ علم اللہؒ کی خانقاہ "تکیہ علم اللہ" کے نام سے مشہور تھی، جس کے فیوض کم و بیش سو سال سے اودھ کے تشنہ لبوں کو سیراب کر رہے تھے، اسی تکیہ شاہ علم اللہ میں ۶ صفر ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء کو

سیّد صاحبؒ پیدا ہوئے، باپ کا سایہ بچپن میں سر سے اٹھ چکا تھا، نوجوانی میں روزگار کی تلاش میں لکھنؤ پہنچے، جو اس وقت اَودھ کا دارالسلطنت تھا، لکھنؤ میں گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آنے پر دہلی کا رُخ کیا، وہاں پہنچ کر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ (وفات ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۳ء) سے بیعت کر کے کمالاتِ روحانی حاصل کیے۔

حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ (۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۳ء) سے کچھ کتابیں پڑھیں مگر جلد ہی ان کی سپاہیانہ طبیعت اور جذبۂ خدمتِ دین نے کشاں کشاں ان کو نواب امیر خاں والیٔ ٹونک سے وابستہ کر دیا[1]

---

[1] نواب امیر الدولہ امیر خاں کا تعلق صوبہ سرحد کے آزاد قبائل سے تھا، امیر خاں کا دادا محمد شاہ (۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء - ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) کے عہد میں ہندوستان آیا، وہ اکثر روہیل کھنڈ کی لڑائیوں میں شریک رہا اور آخر میں وہیں سنبھل (مراد آباد) میں سکونت اختیار کر لی، اس کے بیٹے حیات خاں نے بھی آبائی پیشہ اختیار کیا، اس کے یہاں ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء میں امیر خاں پیدا ہوا، نوجوانی میں چند رفیقوں کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا، اس زمانے کے جاگیرداروں کی حالت یہ تھی کہ جب کوئی مہم پیش آتی تو عارضی طور پر فوج بھرتی کر لیتے تھے، امیر خاں نے راجستھان، گجرات اور دکن کے کئی مقامات میں عارضی ملازمت کی مَن چلا آدمی تھا، روپیہ مل جاتا تو اپنے ساتھیوں کو نہال کر دیتا، رفتہ رفتہ اس کی قوت بڑھتی گئی اور ہندوستان کے سرداروں میں سب سے زیادہ طاقت ور بن گیا، ایک زمانے میں اندور کے مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ بھی رہا، مگر جب ہلکر نے انگریزوں سے صلح کر لی تو امیر خاں دربار اودے پور سے وابستہ ہو گیا (باقی حاشیہ ص۱۹۰ پر)

سیّد صاحب یہ نصب العین لے کر نواب امیر خاں کے پاس گئے تھے کہ اس کی عظیم الشان قوت سے وطن کی آزادی اور احیائے اسلام کا کام لیا جائے اور مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان بنایا جائے، اور جہاد فی سبیل اللہ کی اس روح کو از سرِ نو زندہ کیا جائے جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا طغرائے امتیاز تھی، اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو جو تیزی سے انگریزوں کے قبضے میں جا رہا تھا اُن کی دست بُرد سے بچایا جائے، مگر جب ان کی یہ خوش آئند آرزو پوری نہ ہوئی اور نواب امیر خاں نے سیّد صاحب کے سمجھانے اور روکنے کے باوجود انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا فیصلہ کر لیا تو سید صاحب نواب امیر خاں سے علیٰحدہ ہو کر دہلی چلے گئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۹) ایک موقع پر اس کے پاس چالیس ہزار جاں باز جمع ہو گئے تھے، ایک ہندو مصنف موہن سنہا مہتہ نے لکھا ہے کہ امیر خاں ایک لائق قائد اور بہادر سپاہی تھا اس کی فوج بہت عمدہ تھی، اور ہندوستان کی تمام ریاستی فوجوں میں ساز و سامان کے لحاظ سے بہترین فوج سمجھی جاتی تھی۔

(لارڈ ہیسٹنگز اور ہندوستانی مسلمان مصنفہ موہن سنہا مہتہ صفحہ ۱۱)

اتنی بڑی قوت کو انگریز وسطِ ہند میں آزاد چھوڑ دینے کے روادار نہ ہو سکتے تھے، مگر انھیں یہ حوصلہ بھی نہ تھا کہ امیر خاں سے کھلے میدان میں ٹکر لیں، اس لئے ریشہ دوانیوں کا جال بچھایا گیا، نواب کے ساتھیوں کو توڑا گیا، یہاں تک کہ ۱۸۱۷ء (۱۲۳۳ھ) میں نواب تنہا رہ گیا، انگریزوں نے تین طرف سے پیش قدمی شروع کی، امیر خاں گھر گیا، اور اسے مجبور ہو کر انگریزوں سے صلح کرنی پڑی معاہدہ کی رُو سے صرف ریاست ٹونک کا اقتدار امیر خاں کے پاس باقی رہ گیا۔

(سید احمد شہید صفحہ ۸۶، صفحہ ۸۹)

ٹونک سے واپسی کے بعد سیّد صاحبؒ نے اپنے نصب العین کے لئے دوآبہ کا دورہ شروع کیا، جس میں عقائد و اعمال کی درستگی اور معاشرتی اصلاحات کے کام سے ابتدا کی گئی، مگر ساتھ ہی ساتھ جہاد کی تیاری کے لئے جنگی تربیت دینے کا کام بھی شروع کر دیا گیا، مریدین کو ضبط و تحمل، جفاکشی اور سخت کوشی کا عادی بنایا گیا، دورے کے زمانے میں رائے بریلی میں چند ماہ تک قیام رہا، اس کے متعلق سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ یہ زمانہ عجیب ذوق و شوق، لذت و حلاوت اور جفاکشی کا تھا، جو مہاجرین کے قیامِ مدینہ منوّرہ سے بہت مشابہ تھا، سیّد صاحبؒ اور ان کے رفقا، جن میں ہندوستان کے جلیل القدر علماء اور صاحبِ سلسلہ مشائخ بھی تھے، بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے مشقت کے کام کرتے تھے، لکڑیاں چیرتے، گھاس چھیلتے، انیٹیں تھاپتے، مسجدیں تعمیر کرتے، فاقہ تک کرتے مگر ہر حال میں خوش و خرّم رہتے، ان میں اچھے اچھے عالی خاندان، خوش حال امیر اور رئیس زادے بھی تھے، بہت سے نازک طبع اور ناز پروردہ نوجوان تھے، ان کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی، بعضوں کے سیکڑوں ہزاروں معتقد و مرید تھے، مگر گھر بار، عیش و آرام، مشیخت و مخدومیت سب کچھ چھوڑ کر اس در پر پڑے ہوئے تھے، اور ہزاروں درجے خوش تھے، انھیں میں شاہ عبدالرحیم[1] صاحب بھی تھے، جن کے ہندوستان میں ہزارہا مرید تھے، مگر وہ یہاں مخدوم سے خادم اور مراد سے مرید

---

[1] شاہ عبدالرحیم سہارنپوری (۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء - ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) ساداتِ حسینی سے تھے، طریقۂ چشتیہ میں شاہ عبدالباری امروہی (وفات ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء) سے بیعت تھے (باقی حاشیہ صـ۱۹۲ پر)

بنے ہوئے تھے، انھیں میں مولانا محمد یوسف پھلتی مخدوم جہاں اور خاندانِ ولی اللّٰہی کے چشم وچراغ مولانا عبدالحیؒ اور مولانا محمد اسمٰعیلؒ بھی تھے [1]

اس دورے سے قبل شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنے تمام شاگردوں اور تمام اعزّا واقارب کو ہدایت کردی تھی کہ سیّد صاحبؒ سے باقاعدہ بیعت کرکے کمالاتِ روحانی سے استفاضہ کریں [2]

جیسا کہ ابھی اوپر گزر چکا ہے سید صاحبؒ کے مریدین میں بڑے بڑے علماء ومشائخ اور صاحبِ ثروت لوگ شامل تھے، یہ جماعت قافلے کے نام سے موسوم تھی، قافلہ جہاں جاتا لوگ نہایت عقیدت مندی کے ساتھ پیش آتے اور دعوتیں کرتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۱) پھر سید صاحبؒ سے بیعت ہوئے، سید صاحب سے بیعت کرنے کے وقت خود ان کے ہزاروں مرید تھے، میاں جی نور محمد جھنجھانوی (وفات ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء) نے جو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (وفات ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء) کے پیر ومرشد تھے، شاہ عبدالرحیمؒ سے خلافت حاصل کی تھی، سفرِ جہاد میں سید صاحبؒ کے ہمرکاب تھے ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔

مولانا محمد یوسف پھلتیؒ، مولانا عبدالحیؒ اور مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے تفصیلی حالات کے لئے مہر صاحب کی کتاب جماعتِ مجاہدین ملاحظہ فرمائیے۔

[1] سیرت سید احمد شہید مصنفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ ص ۹۷ و ۹۸ ۱۹۳۹ء

[2] شاندار ماضی جلد ۲ ص ۹۹ مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی۔

سید صاحبؒ اصلاح و تربیت کے سلسلے میں جہاں جہاں گئے وہاں ان کے مریدین و معتقدین کا ایک حلقہ قائم ہو گیا، اور عقائد و اعمال میں بڑی اصلاح ہو گئی، چنانچہ ڈیڑھ سو برس گزر جانے کے باوجود اس کے اثرات آج تک ان مقامات میں پائے جاتے ہیں، جو لوگ جماعتِ مجاہدین میں شامل تھے ان کو عقائد و اعمال کی معمولی لغزش بھی گوارہ نہ تھی، ایک موقع پر کسی مجاہد نے ایک گاؤں کے قیام میں کسی سے چھاچھ مانگ لی تھی تو جماعت کے قائد نے اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے صاف طور پر کہہ دیا کہ ہمارے ساتھ رہنا ہے تو تمام ضابطوں کی پابندی لازم ہو گی، یہ منظور نہیں تو یہاں سے چلے جاؤ۔[1]

جذبۂ اخوت کا یہ حال تھا کہ ہر شخص دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح دیتا تھا، بسا اوقات فاقوں کی نوبت آجاتی تھی، تو جنگل کے پتے اور جڑی بوٹیاں اُبال کر کھا لیتے تھے، مگر حرفِ شکایت زبان پر نہ آتا، راہِ حق میں بڑی سے بڑی تکلیف کو خندہ پیشانی سے انگیز کر لیتے تھے، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ مجاہدین کے اعمال و کردار کو دیکھ کر قرنِ اوّل کے صحابۂ کرامؓ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۱ء میں سیّد صاحبؒ قافلے کے ساتھ حج کے لئے روانہ ہوئے تقریباً سات سو افراد ہمراہ تھے، ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء میں سفرِ حج سے واپسی ہوئی وطن پہنچ کر وہ ہمہ تن جہاد کے سر و سامان میں مشغول ہو گئے، عام خیال یہ ہے کہ سید صاحبؒ کا جہاد سکھوں کے خلاف تھا، اس لئے کہ پنجاب میں سکھ حکومت

---

[1] سیرت سید احمد شہیدؒ ص ۹۷ و ۹۸

مسلمانوں پر بہت ظلم کر رہی تھی، مگر درحقیقت جہاد کا اصل رُخ انگریزوں کی جانب تھا، اس وقت ہندوستان میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جسے انگریزوں کے خلاف مرکز بنا کر جنگ کی جائے، اسی لئے آپ نے صوبہ سرحد کو منتخب کیا وہاں پہنچ کر ان کو افغانستان اور بخارا وغیرہ کی حکومتوں سے امداد ملنے کی توقع تھی، چنانچہ ۱۲۴۱ھ / ۱۸۲۶ء میں قافلے کے ساتھ وطنِ عزیز کو خیرباد کہا، اور آزاد قبائل کا ارادہ کیا، پنجاب کے راستے سے گزرنا مشکل تھا، اس لئے راجستھان کا طویل راستہ تجویز کیا گیا، اس سفر کا یہ واقعہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جب قافلہ گوالیار پہنچا تو مہاراجہ دولت راؤ سندھیا اور ریاستِ گوالیار کے وزیر راجہ ہندو راؤ نے بڑے اہتمام کے ساتھ قافلے کی دعوتیں کیں، مہارانی نے اصرار کیا کہ سید صاحب اتنی مدت گوالیار میں قیام کریں کہ لشکر کے لئے پورا ساز و سامان فراہم کیا جا سکے، مگر سید صاحب نے معذرت کی [1]

گوالیار کے قیام میں سید صاحب نے ہمراہیوں کو باقاعدہ فوجی طریقے پر پانچ حصّوں میں تقسیم کیا، اور ہر جماعت کا ایک مستقل سرعسکر بنایا گیا، قافلہ گوالیار سے روانہ ہو کر سندھ ہوتا ہوا قندھار اور کابل کے راستے سے صوبہ سرحد میں داخل ہوا، آزاد قبائل کے خوانین اور عوام کثرت سے سیّد صاحب کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گئے، صوبہ سرحد میں پہنچنے پر ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء کو بالاتفاق سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر امامت و خلافت کی بیعت کی گئی،

---

[1] سید احمد شہیدؒ جلد اول ص ۲۸۷ و ۲۸۸

سیّد صاحبؒ نے وہاں مرکز قائم کر کے باقاعدہ حکومت کا اعلان کر دیا اور والیٔ کابل، سلطان ہرات، شاہ بخارا، رئیس قلّات اور آزاد قبائل کے سرداروں کو امداد کے لئے خطوط لکھے، ان خطوط میں جہاد کی ضرورت کو واضح کرتے ہوئے بیان کیا گیا تھا کہ جہاد کا مقصد ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا ہے۔

اپنے اعمال و کردار کے لحاظ سے یہ مجاہدین کیا تھے؟ اس کا جواب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زبان سے سنئے:۔

"یہ وہ بے نظیر جماعت تھی جس کی مثال اتنی بڑی تعداد میں اور اس جامعیّت و کاملیّت کے ساتھ خیر القرون کے بعد بہت کم ملتی ہے، ان کی صحیح اور محتاط تعریف یہ ہے کہ وہ تیرھویں صدی میں صحابۂ کرامؓ کا نمونہ تھے، یہ لوگ بلا مبالغہ عقائد، اعمال و اخلاق، توحید، اتباعِ سنت، شریعت کی پابندی عبادت و تقویٰ، سادگی و تواضع، ایثار و خدمتِ خلق، غیرتِ دینی، شوقِ جہاد و شہادت، صبر و استقامت میں مہاجرین و انصار کا نمونہ تھے۔" [1]

اس جماعت کی صحبت سے جو لوگ تیار ہوئے تھے، اُن کی نسبت ڈبلو، ڈبلو ہنٹر نے جسے انگریزی حکومت کی جانب سے مجاہدین کی سرگرمیوں کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا تھا، اس شدید جذباتی عناد کے باوجود جو

---

[1] سیرت سید احمد شہیدؒ ص ۳۴۵، مطبوعہ ناصری پریس لکھنؤ ۱۹۳۹ء ۱۳۵۸ھ۔

ہنٹر کو مجاہدین سے تھا، ایک موقع پر مجاہدین کی بے لوث دینی خدمات اور ان کی روحانی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ہنٹر لکھتا ہے :-

"جہاں تک میرا تجربہ ہے، یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ایک وہابی مبلّغ سب سے زیادہ روحانیت رکھنے والا، سب سے کم خود غرض اور بے لوث ہوگا۔"

پھر آگے چل کر لکھتا ہے :-

"میں وہابی اور غدّار کو ہم معنی سمجھتا ہوں، یہ وہابی سب کے سب پیغمبرِ اسلام کے مذہب سے بدعات کو دور کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہیں۔" [1]

خود یہ مجاہدین جہاد فی سبیل اللہ اور شوقِ شہادت کے جس نشے سے سرشار تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے، مجاہدین کی سب سے پہلی جنگ کے موقع پر ایک مجاہد عبدالمجید خاں جہاں آبادی بیمار تھے، سید صاحبؒ نے لشکر ترتیب دیتے ہوئے ان کا نام خارج کر دیا، انھیں معلوم ہوا تو خود حاضر ہو کر عرض کیا کہ "آپ نے میرا نام کیوں نکال دیا؟" سید صاحبؒ نے فرمایا "تم بیمار ہو"۔ "بولے کہ آج پہلا موقع ہے، جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد قائم ہو رہی ہے آپ مجھے

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان مصنفہ W. W. HUNTOR ترجمہ اردو ڈاکٹر صادق حسین۔ شائع کردہ اقبال اکیڈمی لاہور سنہ ۱۹۴۴ء ۱۳۶۳ھ ص ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۱۲

ضرور شامل رکھیں۔" ان کے اصرار پر سید صاحبؒ نے اجازت دے دی[۱]
یہ معرکہ اکوڑہ میں پیش آیا تھا۔

چھتر بائی کے حملے میں ایک مجاہد نے جامِ شہادت نوش کیا، جب اس کے بھائی شیخ بلند بخت دیوبندی کو اس کی شہادت کی اطلاع ملی تو نہایت صبر و ضبط سے بولے۔ "الحمدللہ! میرا بھائی جو مراد لے کر آیا تھا وہ پوری ہو گئی، ہم سب کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب کرے"[۲]

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے سیرت سید احمد شہید میں لکھا ہے، کہ:-

"مجاہدین کا عجیب عالم تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے فرشتے زمین پر اتر آئے ہیں، یا صحابہ کرامؓ، مہاجرین اولین و انصار کا دور پلٹ آیا ہے، معمولی سپاہی اور لشکری عِبَادُ الرَّحمٰن کا نمونہ تھا، تکبّر، شان، خودی، ننگ و عار کا نام نہ تھا، ایک دوسرے کی خدمت کرتے، ہر کام میں لِلّٰہ فی اللہ شریک ہوتے، دوسرے کا ہاتھ بٹاتے، چکّی پیستے کھانا پکاتے، لکڑی چیرتے، کپڑے دھوتے، گھاس چھیلتے، بیماروں کی خدمت کرتے، اُن کا پیشاب پاخانہ اٹھاتے، پیر دباتے، زمین پر سوتے، پھٹے پرانے کپڑے پہنتے فحش گوئی، بدزبانی، حسد، عداوت کوئی جانتا نہ تھا جہاد نفس

---

[۱] سید احمد شہیدؒ جلد دوم ص ۳۵۱
[۲] ایضاً جلد دوم ص ۱۷۱

اور مجاہدۂ روحانی بھی عام خانقاہوں سے زیادہ ہوتا تھا
اور ان تمام کاموں میں بڑے بڑے مخدوم اور امیرزادے
شریک ہوتے تھے اور اپنی سعادت و عزت سمجھتے تھے"۔[۱]
سنہ ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں پنجاب کی سکھ حکومت سے مجاہدین کی معرکہ آرائیاں
شروع ہو گئیں، جن میں سے اکثر میں ان کو کامیابی ہوتی رہی۔ مجاہدین
کی پہلی جنگ اکوڑہ میں ہوئی جس میں ۳۷ مجاہدین شہید اور ۳۵ زخمی ہوئے
ان کے مقابلے میں سکھ فوج کے ۷۰۰ سپاہی کام آئے[۲]، پہلے ہی
معرکے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سپہ سالار سردار بدھ سنگھ کے
پاؤں اکھڑ گئے، دوسری لڑائی حضرو کے مقام پر ہوئی، اس میں بھی
مجاہدین کو فتح حاصل ہوئی، چوتھی شیدو کے مقام پر ہوئی، جس کے
بعد سید صاحبؒ کو زہر ... دیا گیا، اس موقع پر سید صاحبؒ ہلاک
ہونے سے تو بچ گئے مگر مجاہدین کو شروع میں جو کامیابی ہوئی وہ جلد ہی
شکست میں بدل گئی، مجاہدین کا ساتواں حملہ بچھلی کی گڑھی پر ہوا،
اس میں بھی وہ کامیاب رہے، اسی طرح مختلف مقامات پر ان کو فتح ہوتی
رہی یہاں تک کہ پشاور شہر پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا، پشاور صوبہ سرحد
کا مرکزی مقام تھا، اب صوبہ سرحد کے بڑے حصے پر مجاہدین کا
تسلط قائم ہو گیا، سلطان محمد خان کو سید صاحبؒ نے پشاور کا حاکم

---

[۱] سیرت سید احمد شہید ص ۱۷۴، ۱۷۵

[۲] ایضاً ص ۴۴۷

مقرر کیا، شرعی احکام کا نفاذ کیا گیا، اور باضابطہ اعلان کر کے اسلامی نظام حکومت قائم کر دیا گیا، پولیس اور حکام مقرر کئے گئے، احتساب کا محکمہ قائم کیا گیا، اس کا ایسا اثر ہوا کہ کوسوں تک ڈھونڈے سے بھی کوئی بے نمازی نہ ملتا تھا[1]

اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ سید صاحب کی اس عظیم تحریک کے دو مقصد تھے پہلا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے معاشرے میں شرک و بدعات کی راہ سے جو غیر شرعی رسم و رواج داخل ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ انھوں نے دینی حیثیت حاصل کر لی تھی ان کی بیخ کنی کر کے معاشرے کی اسلامی طور پر اصلاح و تربیت کی جائے، دوسرا مقصد ملک کو اغیار سے آزادی دلانا تھا، چنانچہ جب ایک وسیع علاقے پر ان کو سیاسی تصرف حاصل ہو گیا تو فوراً اس میں شرعی نظام قائم کر دیا گیا اور تمام معاملات کے فیصلے شرعی طور پر کئے جانے لگے، آزاد قبائل کے لوگوں نے سید صاحبؒ سے بیعت کرتے ہوئے یہ سمجھا تھا کہ سید صاحب بھی اس زمانے کے دوسرے اقتدار پسند لوگوں کی طرح اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، انھیں یہ غنیمت نظر آیا کہ سکھ حکومت کے مقابلے میں جو آئے دن تاخت و تاراج کرتی رہتی تھی سید صاحب کے ساتھ رہ کر وہ سکھوں کے مظالم سے محفوظ ہو جائیں گے، مگر ان کی خود سر اور جنگ جو طبیعتیں شرعی نظام کا تحمل نہ کر سکیں، ان کو بعض تصرفات سے دست کش ہونا پڑا، انھوں نے دیکھا کہ ان کی من مانی کارروائیوں

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص ۱۷۰

کے تمام مواقع جدید نظام سے وابستہ رہنے میں اُن کے ہاتھوں سے نہ صرف نکل گئے ہیں بلکہ جرائم کا ارتکاب کرنے والے بلا رُو رعایت سزا کے مستحق قرار دے جاتے ہیں، اس لئے وہ بہت جلد سیّد صاحبؒ سے بیزار ہونے لگے ان کی حیلہ جُو طبیعتوں کے لئے قید و بند کا یہ بہانہ بھی بہت کافی تھا، مگر علانیہ احکامِ اسلامی سے سرتابی کرنا بھی اُن کے لئے مشکل تھا۔

مولانا غلام رسول مہر نے سید احمد شہید میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درباری روزنامچے کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب سید صاحب صوبہ سرحد میں پہنچے تو وہاں کے ایک سردار یار محمد خاں نے رنجیت سنگھ کے ساتھ ربط و اتحاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سید صاحب کو زہر دے دیا تھا، اور اسی شخص کی غدّاری کی وجہ سے ایک مقام پر مجاہدین کو شکست اٹھانی پڑی تھی[1] اہلِ سرحد کو اپنے گرد جمع کر لینے میں سید صاحب کی غیر معمولی کامیابی نے یار محمد خاں کو ارادت مندی پر آمادہ کر دیا تھا، مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ سید صاحبؒ نے حاکمانہ حیثیت حاصل کر لی ہے تو اس کے دل میں وسوسے پیدا ہو گئے، اور اس نے سکھوں کے ساتھ نامہ و پیام شروع کر دیا۔

پشاور پر مجاہدین کا قبضہ ہو جانے کے بعد پنجاب کی سکھ حکومت کے علاوہ انگریزوں کو بھی مجاہدین کے عزائم اور ان کی قوت کا احساس ہوا اور وہ خطرہ محسوس کرنے لگے، انگریزوں کی جانب سے بڑی حکمتِ عملی کے ساتھ دینی سطح پر سیّد صاحبؒ اور جماعتِ مجاہدین کے خلاف ایک مہم شروع کی گئی

---

[1] سید احمد شہید جلد اول ص ۳۹۷ - ۳۹۹

جماعت پر جو الزام لگائے گئے اُن کا حاصل یہ تھا کہ سید صاحب بدعقیدہ ہیں، الحاد و زندقہ میں مبتلا ہیں، ان کا کوئی مذہب و مسلک نہیں ہے، اسلام سے انھیں کوئی تعلق نہیں، ان کے عقائد عام مسلمانوں کے خلاف ہیں، نفسانیت کے پیرو ہیں، ظلم و تعدّی کے خوگر ہیں وغیرہ وغیرہ

بڑے شدّ و مد سے اس الزام کا پروپیگنڈا کیا گیا، آزاد قبائل کی خودسر اور جنگ جو طبیعتوں کے لئے اس الزام نے بغاوت کا راستہ صاف کر دیا، سب سے پہلے سلطان محمد خاں نے بغاوت پر کمر باندھی، یہ وہی شخص تھا جسے سیّد صاحبؒ نے اس کی درخواست پر پشاور کا حاکم مقرر کیا تھا، اس نے اچانک پشاور میں سیّد صاحب کے کارکنوں کو قتل کرا دیا، اس سلسلے میں پہل مولوی مظہر علی عظیم آبادی سے کی گئی، جن کو سیّد صاحبؒ نے صوبہ سرحد کے پورے علاقے کا قاضی مقرر کیا تھا، پھر ایک ایک کارکن کو نہایت بے دردی کے ساتھ ذبح کیا گیا۔

اس صورتِ حال کے بعد مجاہدین کے لئے ضروری ہو گیا کہ مرکز کو صوبہ سرحد سے کسی دوسری جگہ منتقل کیا جائے، چنانچہ سرحد کے چار سالہ قیام کے بعد بادلِ ناخواستہ سیّد صاحب مجاہدین کی جماعت کو لے کر وہاں سے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔

سید صاحب کے ایک فاضل سوانح نگار مولانا غلام رسول مہرؔ نے اس موقع پر اپنے جن جگر خراش تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہیں :-

"افسوس کہ خود مسلمانوں کی کج اندیشی، غرض پرستی، اور ناحق کوشی کے باعث ان امیدوں کی روشنی دیکھتے دیکھتے زائل ہو گئی اور ان کی جگہ اشک ہائے حسرت اور نالہ ہائے غم باقی رہ گئے۔ تین چار برس کی جانفشانیوں سے جو کام سرانجام پہنچے تھے وہ برباد ہو گئے، بہت سے غازی بے خبری کے عالم میں خاک و خون میں تڑپے، حکمرانی کے بعد مسلمانانِ ہند میں سے غیرت و حمیّتِ حق کی جو بہترین اور عزیز ترین متاع جمع کی گئی تھی وہ یوسف زئی کے میدانی علاقے میں جا بجا لٹ گئی، سید صاحب اپنے چار سالہ مرکز کو چھوڑ کر کسی دوسری کارگاہ کی تلاش میں نکلنے پر مجبور ہوئے، ابھی کسی جگہ جم کر بیٹھنے نہ پائے تھے کہ خلعتِ شہادت سے سرفرازی پا کر رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے"[1]

غرض کہ جماعتِ مجاہدین صوبہ سرحد سے روانہ ہو کر دشوار گزار راستوں کو طے کرتی ہوئی بالاکوٹ کے مقام پر پہنچی، جو ضلع ہزارہ کا مشہور قصبہ ہے، یہاں پہنچتے پر برف باری شروع ہو گئی، راستہ مسدود ہو گیا، بالاکوٹ میں قیام کے لئے ایک ایسے میدان کا انتخاب کیا گیا جو چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، بالاکوٹ میں معلوم ہوا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ولی عہد شیر سنگھ مجاہدین کا راستہ روکنے کے لئے یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ڈیرے ڈالے ہوئے پڑا ہے، مگر جغرافیائی طور پر یہ میدان پہاڑوں سے اس طرح گھرا ہوا تھا کہ اس تک کسی بڑی فوج کے پہنچنے کا کوئی خطرہ نہ تھا

---

[1] سید احمد شہید جلد دوم ص ۲۹۰

یہاں تک کہ مئی کا مہینہ آگیا اور برف باری بند ہو گئی، چونکہ مجاہدین پر حملے کیلئے کوئی راستہ نہ تھا اس لئے شیر سنگھ مجبور ہو کر واپس ہونے والا تھا کہ کسی قبائلی غدّار نے ایک مخفی راستے کی نشان دہی کی، مجاہدین بالکل بے خبر تھے کہ اچانک سکھ فوج ان کے سروں پر پہنچ گئی اور دست بدست جنگ شروع ہو گئی، ہر چند سیّد صاحب، مولانا محمد اسمٰعیل اور دوسرے جانباز مجاہدین نے ہمّت و جرأت کے جوہر دکھائے مگر سکھوں کا لشکر اتنا زیادہ تھا کہ سید صاحبؒ، مولانا محمد اسمٰعیلؒ اور سیکڑوں مجاہدین کو جام شہادت نوش کرنا پڑا، بروز جمعہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) کو تاریخ حرّیت کا یہ اندوہناک واقعہ پیش آیا [1]

اس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مجاہدین کی اس ناکامی کا حقیقی فائدہ سکھوں کے بجائے انگریزوں کو پہنچا، سیّد صاحب کی شہادت کے ۱۸ سال بعد ۱۸۴۹ء / ۱۲۶۵ھ میں پنجاب سے سکھوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا لارڈ ڈلہوزی نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مقبوضات کو کمپنی کی حکومت میں شامل کر لیا [2]

جماعتِ مجاہدین کی للّٰہیت، خلوص، جوشِ جہاد، فداکاری، عزم و ہمت اور اپنے مقصد کے حصول کی لگن کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے

---

[1] سید احمد شہید، جلد دوم ص ۴۱۴

[2] تاریخِ ہند ہاشمی فرید آبادی ص ۳۹۸

کہ سید صاحبؒ کی شہادت کے عظیم حادثے کے باوجود مجاہدین کی ہمتیں پست نہیں ہوئیں۔ ڈبلیو ہنٹر کے الفاظ یہ ہیں :-

"یہ تحریک کسی رہنما کی موت وحیات سے بالکل مستغنی ہو گئی تھی، خود سید صاحب کی وفات کو بھی اُن کے پُرجوش حامیوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے ایک مقدّس ذریعہ بنا لیا تھا[1]۔"

جو مجاہدین بچ گئے تھے انھوں نے اپنا نظم دوبارہ قائم کیا، سکھ حکومت تو چند ہی سال میں ختم ہو گئی تھی مگر اس کے جانشین انگریزوں کے لئے یہ تحریک نصف صدی تک وبالِ جان بنی رہی، اس کی تفصیلات کا یہاں موقع نہیں ہے۔[2]

سید صاحبؒ کے دوآبہ کے دورے کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، اس سلسلے میں سید صاحبؒ نے اپنے بابرکت قدوم سے دیوبند کی سرزمین کو بھی سرفراز فرمایا تھا، مولانا حکیم عبدالحئی نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ :-

"جب حضرت سید صاحبؒ کی تشریف آوری کی خبر مشہور ہوئی تو دیوبند کے بڑے بوڑھے لوگ استقبال کو نکلے،

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۳۴

[2] جماعتِ مجاہدین کے تفصیلی حالات کے لئے مولانا غلام رسول مہر کی تصانیف جماعت مجاہدین اور سرگزشت مجاہدین سے مراجعت کی جائے۔

شہر کے باہر ایک بزرگ کا مزار ہے[1]، وہاں تک پہنچے تھے
کہ سید صاحب نظر آئے، ایک ٹانگھن پر سوار تھے اور دونوں
طرف .... دو شخص رکاب تھامے ہوئے چلے آتے تھے
ان لوگوں نے آگے بڑھ کر ملاقات کی، اس وقت ان دونوں
بزرگوں کی ظاہری وضع و ہیئت سے یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ
کہ یہ کون ہیں، سید صاحبؒ نے فرمایا کہ "ان سے ملو! یہ
مولانا محمد اسمٰعیل اور مولانا عبدالحیؒ ہیں۔" [2]

دارالعلوم دیوبند کے متصل جانبِ مشرق قاضی مسجد واقع ہے، اسی
مسجد میں حضرت سید صاحب فروکش ہوئے تھے، یہاں دس روز تک
قیام فرمایا، سید احمد شہید میں لکھا ہے کہ :-

"سید صاحب بھلت سے مظفر نگر ہوتے ہوئے دیوبند پہنچے
دیوبند سے املیا[3] گئے، ان مقامات میں قاضی نجم الدین پندرہ

---

[1] یہ مزار آٹھویں صدی ہجری کے ایک بزرگ شاہ علاء الدین سہروردیؒ جنگل باش
کا ہے، جن کا ذکر تاریخ دیوبند کے شروع میں گزر چکا ہے، یہ مزار مظفر نگر سے آنے
والی سڑک کے کنارے پر ہے، آبادی سے اس کا فاصلہ دو فرلانگ کے
قریب ہے۔

[2] سفرنامہ دہلی اور اس کے اطراف مصنفہ مولانا حکیم عبدالحیؒ ص ۱۱۳
مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۵۸ء۔

[3] املیا دیوبند کے جنوب میں تین میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔

آدمیوں کے ساتھ، سید مقبول، مولوی شمس الدین، قاضی عظیم اللہ، شیخ رجب علی ان کے فرزند منور علی، حافظ عبداللہ ان کے بھائی نظام الدین اور کریم الدین نیز ان کے والد امام بخش، کرامت حسین، محمد ماہ، شیخ چاند، مولوی فریدالدین، مولوی بشیر اللہ، سید محمد حسین وغیرہ اصحاب نے بیعت کی۔"[1]

دیوبند کے شیخ بلند بخت سردھنہ (میرٹھ) میں بیعت کر چکے تھے[2] سید صاحب کی خدمت میں جو لوگ پیش پیش رہے تاریخ میں ان کے نام تو ملتے ہیں مگر حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ سید صاحبؒ کا یہ دورہ ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۸ء میں ہوا تھا۔ جس پر ڈیڑھ سو سال سے زائد گزر چکے ہیں، اتنی طویل مدت کے بعد تفصیلی حالات کا مہیا ہونا بہت مشکل ہے، جن لوگوں کے حالات معلوم ہو سکے وہ درج ذیل ہیں:۔

۱۔ سید مقبول۔ ان کا پورا نام سید مقبول عالم ہے، دیوبند کے خاندان سادات سے تھے، ان کے مورث اعلیٰ بندگی سید محمد ابراہیم ہیں جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، راقم السطور کے ہم جد تھے۔

۲۔ مولوی شمس الدین۔ مولانا عبدالخالق صاحب جنھوں نے دیوبند کی جامع مسجد کی تعمیر میں زبردست خدمات انجام دیں اُن کے والد بزرگوار تھے، جامع مسجد دیوبند کی امامت و خطابت ان ہی کی اولاد میں اب تک

---

[1] و [2] سید احمد شہید جلد اول ص ۱۲۵

چلی آرہی ہے، دیوبند کے مشہور بزرگ شاہ ولایت صاحبؒ کے مزار کے قریب مدفون ہیں، فقہی مسائل میں ایک رسالہ "شریعت کا لٹھ" ان کی تصنیف ہے، مولوی شمس الدین صاحب ابتداءً بدعات کی جانب مائل تھے، دیوبند میں سید صاحب کے ورود کی خبر سُنکر مخالفت کے جوش میں ایک ہجو لکھی جو اُسی وقت بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئی، ایک مرتبہ سید صاحب کے دورانِ قیام میں یہ دیکھنے کے لئے قاضی مسجد میں آئے کہ آخر سید صاحب کی جانب لوگوں کا اس قدر رجوع کیوں ہے، مسجد عقیدت مندوں سے بھری ہوئی تھی، مولوی صاحب مجمع میں ایک طرف بیٹھ گئے، سیّد صاحبؒ نے فوراً ان کی جانب متوجہ ہوکر فرمایا کہ "آپ ہی نے ہماری ہجو میں اشعار لکھے ہیں"؟ سید صاحب نے یہ الفاظ کچھ ایسے انداز میں فرمائے کہ مولوی صاحب تڑپ گئے اور معذرت کے بعد عرض کیا کہ "اس گستاخی پر میں شرمندہ ہوں خدا کے لئے معاف کر دیجئے! اور حلقۂ بیعت میں داخل فرمالیجئے"! سید صاحب نے بیعت کر لیا اور مرید ہوکر بالکل سید صاحبؒ کے رنگ میں ڈوب گئے [۱]

۳۔ شیخ رجب علی۔ ان کے والد کا نام شیخ خرد مند تھا، دیوان لطف اللہ عثمانی جو امرائے شاہجہانی میں سے تھے، ان کی اولاد میں ہیں، دیوان لطف اللہ کے شاندار محل کا بوسیدہ اور شکستہ دروازہ آج بھی

---

[۱] زبانی روایات کے علاوہ یہ واقعہ سفرنامہ دہلی اور اس کے اطراف میں بھی منقول ہے، ص ۹۷ و ۹۸

اپنی عظمتِ رفتہ کی شہادت دے رہا ہے۔

دیوبند کی عیدگاہ کے خطیب مولانا محمد مبین صاحب (وفات ۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۹ء) انہی شیخ رجب علی کے پوتے تھے، مولانا محمد مبین صاحب شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کی انقلابی پارٹی کے مخصوص اراکین میں سے تھے، پارٹی کی سیاسی اور انقلابی سرگرمیوں کے لئے سرمایہ کی فراہمی کا کام ان کے سپرد تھا، مولانا محمد متین خطیبِ عیدگاہ کراچی ان کے فرزندِ رشید ہیں۔

۴۔ مولوی بشیر احمد۔ ان کے والد کا نام شیخ غریب اللہ تھا، دیوبند کے مشہور طبیب حکیم صفت احمد مرحوم (وفات ــــ ھ) کے پردادا تھے یہ بھی دیوان لطف اللہ کے اخلاف میں ہیں، مولوی غریب اللہ کا مکان منصفی کے نام سے موسوم ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدِ حکومت تک اس خاندان میں منصفی کا عہدہ قائم رہا۔

۵۔ مولوی فریدالدین۔ والد کا نام شیخ محمود بخش ہے، دیوان لطف اللہ کی اولاد میں تھے، دارالعلوم کے دوسرے مہتمم مولانا رفیع الدینؒ کے والد ماجد تھے، دارالعلوم کے شمالی دروازے کے سامنے میدان میں ان کی قبر ہے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے تحصیلِ علم کی تھی، اپنے زمانے کے مشہور بزرگ تھے۔

۶۔ شیخ بلند بخت۔ مولوی فریدالدینؒ کے چھوٹے بھائی تھے، شیخ بلند بخت کے دو چھوٹے بھائی مقصود علی اور سید احمد بھی سید صاحب کے ساتھ شریکِ جہاد تھے، دیوبند کے لوگوں میں سید صاحب سے بیعت کرنے

والوں میں شیخ بلند بخت سب سے پہلے شخص تھے، یہ سرو دھنہ (میرٹھ) میں بیعت کر چکے تھے، سیّد صاحب اہم معرکوں کے سر کرنے کے لئے ان کو مامور فرماتے تھے، چنانچہ کوہ کنبر ڑی کی جنگ میں لڑائی کا نقشہ کچھ بگڑ گیا تھا، مگر شیخ بلند بخت نے اپنی عسکری مہارت اور جرأت و ہمّت سے جنگ جیت لی ایک مرتبہ مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنی جگہ ان کو جانشین بنایا تھا۔

شیخ بلند بخت شجاعت و مردانگی اور فنِ سپہ گری کے ساتھ فہم و دانش اور حُسنِ تدبیر کے اوصاف سے بھی متّصف تھے، سیّد صاحبؒ کی مجلسِ شوریٰ کے رکن تھے، فرمایا کرتے تھے کہ "ڈر، موت کے خوف سے پیدا ہوتا ہے، ہم اپنی جانیں خدا کی راہ میں قربان کر چکے ہیں، پس ہمیں کیا ڈر ہے"!۔ ان کی مہر پر یہ الفاظ کندہ تھے:۔

بفضلِ خدا گشت بختم بلند[1]

صوبہ سرحد میں چھتر بائی کی گڑھی پر حملے میں شیخ بلند بخت کے بھائی مقصود[2] علی نے دوسرے چند غازیوں کے ساتھ جامِ شہادت نوش کیا، جب ان کو بھائی کی شہادت کی خبر ملی تو نہایت صبر و ضبط سے فرمایا "الحمد للہ! میرا بھائی جو مراد لے کر آیا تھا وہ پوری ہو گئی، ہم سب کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب کرے، چنانچہ بالاکوٹ کے معرکے میں سید صاحب کے ساتھ ان کی

---

[1] جماعتِ مجاہدین ص ۳۶، ۴۲، ۴۹، ۸۰

[2] سید صاحبؒ کے تذکرہ نگاروں نے یہ نام علی محمد لکھا ہے، خاندانی شجرے کے مطابق صحیح نام مقصود علی ہے، علی محمد شیخ بلند بخت کے کوئی بھائی نہیں تھے۔

یہ آرزو پوری ہو گئی، گولی کھا کر شہادت سے سرفراز ہوئے۔ سید صاحبؒ کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ مقصود علی، پشتو بے تکلف بول لیتے تھے ایک موقع پر ان کی پشتو دانی کی وجہ سے مجاہدین کو بڑی کامیابی ہوئی۔

۷۔ مولوی جعفر علی لبستوی نے شہدائے بالاکوٹ میں دیوبند کے دو نام لکھے ہیں، شیخ بلند بخت اور سلّو خاں، راقم سطور کا خیال ہے کہ سلّو خاں اصل میں سید احمد ہیں سلّو بچپن کا نام ہے، جو بعد میں ان کی جرأت و مردانگی اور تہوّر کی بنا پر سلّو خاں زبان زد ہو گیا، یہ شیخ بلند بخت کے سب سے چھوٹے بھائی تھے، راقم سطور کا یہ ننھیالی خاندان ہے۔

شیخ بلند بخت اور سید احمد دونوں بھائیوں کی نسبت خاندان میں یہ روایت مشہور رہی ہے کہ بالاکوٹ میں دونوں نے شہادت پائی ہے [۱]

مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ بالاکوٹ کے معرکے میں ایک پُل کے تڑوانے کی ضرورت پیش آئی تاکہ دشمن ادھر سے حملہ نہ کر سکے سید صاحبؒ نے شیخ نصر اللہ خورجوی اور سلّو خاں کو بھیجا، انھوں نے پُل توڑ دیا، معرکۂ بالاکوٹ میں سید صاحبؒ کے اُس خاص دستے میں شامل تھے جس نے نہایت جرأت اور بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے سید صاحبؒ کے ساتھ جامِ شہادت نوش کیا [۲]، ان کی شہادت کی تفصیل نہیں ملتی اس لئے کہ اس دستے کے سب ہی لوگوں نے شہادت حاصل کی، حالات

---

[۱] سید احمد شہید جلد اول ص ۱۲۵۔ جلد دوم ص ۱۳۱، ۱۶۶ ر ۱۷۱، ۳۵۵ ر ۴۲۳

[۲] سید احمد شہید جلد دوم ص ۳۸۱ ر ۴۱۳

بتانے والا کوئی زندہ نہیں بچا۔

خاندان میں شیخ بلند بخت اور ان کے دونوں شہید بھائیوں مقصود علی اور سید احمد کی نسبت بڑی عقیدت مندی سے چند عجیب وغریب واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ انسان کی فطرت ہمیشہ عجوبہ پسند رہی ہے، محیر العقول کارنامے، خارقِ عادات اور عجیب وغریب واقعات اس کے لئے بڑی کشش رکھتے ہیں، ایسے معتقدات بحث ونظر کے لائق نہیں ہوتے، عوام کے دل ودماغ ہر وقت عجائب کاریوں کی تلاش وجستجو میں سرگرم رہتے ہیں اور عجائب پرستی کی رنگ آمیزیاں بات کو کچھ سے کچھ بنا دیتی ہیں، اس لئے میں نے ان کے بیان کرنے سے احتراز کیا ہے۔

۸۔ مجاہدین کے سب سے پہلے معرکے میں جو اکوڑہ (صوبہ سرحد) میں پیش آیا، جس میں ۳۷ مجاہدین شہادت سے سرفراز ہوئے، ان میں دیوبند کے ایک صاحب عبدالرزاق بھی شامل تھے، اس واقعہ پر ڈیڑھ سو سال گزر چکے ہیں، اس لئے عبدالرزاق کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ [1]

۹۔ شہدائے بالاکوٹ میں دیوبند کے عبدالعزیز کا نام بھی ملتا ہے ان کے حالات کا بھی علم نہ ہو سکا۔

۱۰۔ غازی حفیظ اللہ، دیوبند کے ایک بزرگ شیخ ابوالبرکات (جن کے نام پر محلہ ابوالبرکات موسوم ہے، کی اولاد میں سے تھے، سید صاحبؒ کی معیت میں شریکِ جہاد رہے۔

---

[1] سید احمد شہید جلد دوم ص ۱۴۴

اُس زمانے میں مسلمانوں کے معاشرے میں سنّت کے طریقے کے مطابق السلام علیکم کا رواج بہت کم ہوگیا تھا، یہ صرف برابر والوں کے لیے مخصوص تھا، چھوٹے اپنے بڑوں کے لئے سلام یا آداب عرض کے الفاظ استعمال کرتے تھے، چھوٹوں کا اپنے بڑوں کو السلام علیکم کہنا گستاخی پر محمول کیا جاتا تھا، سیّد صاحبؒ کے ذریعے سے جہاں معاشرے میں اور مفید اصلاحیں ہوئیں اُن ہی میں سے ایک السلام علیکم کا رواج عام بھی ہے، چنانچہ پہلی دفعہ جب شیخ حفیظ اللہ نے اپنے والد کو السلام علیکم کہا تو وہ بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ "مجھے معلوم ہے تمھیں کس نے سکھایا ہے، میں اسے سمجھوں گا! مگر رفتہ رفتہ وہ خود متأثر ہوئے اور یہاں تک بدلے کہ بیٹے کے ہاتھ پر جن کو سید صاحبؒ سے خلافت ملی تھی بیعت کرلی [1]

مولانا غلام رسول مہر نے سیّد صاحبؒ کے بارے میں غازی حفیظ اللہ کی متعدد روایتیں نقل کی ہیں، جنگ بالاکوٹ میں آخر تک سید صاحبؒ کے ساتھ شریک رہے، مہر صاحب نے لکھا ہے کہ "حفیظ اللہ دیوبندی سید صاحب کے پاس نالے میں پہنچ گئے تھے، وہاں ان کی بائیں آنکھ کے نیچے تیر لگا اور اس کا پیکان پار ہوگیا، میاں جی چشتی نے انھیں پن چکیوں کے پاس سایہ دار درختوں میں بھیجدیا، راستے میں انھیں امان اللہ خاں لکھنوی اور چند غازی ملے جو سید صاحبؒ کے

---

[1] سیرت سید احمد شہید بحوالہ شاندار ماضی جلد دوم ص ۱۰۴

پاس جا رہے تھے، حفیظ اللہ بھی ان کے ساتھ جانے لگے، دوسرے غازیوں نے انھیں یہ کہہ کر روک دیا کہ آپ زخم کی وجہ سے معذور ہیں وہ پھر پن چکیوں کے پاس پہنچے اور ایک درخت کے سایے میں بیٹھے رہے، بعد میں سید صاحبؒ کا فیل بان ان کا ہاتھ پکڑ کر میدان سے باہر لے گیا [۵]

سید صاحب کی شہادت کے بعد ان پر وارفتگی کا عالم طاری ہو گیا تھا، جب ٹونک میں سید صاحبؒ کے رفقاء جمع ہوئے تو یہ بھی ٹونک چلے گئے مگر وارفتگی طاری تھی، وہاں سے نکل کھڑے ہوئے، ایک مرتبہ دیوبند سے گزر رہے تھے، لوگوں نے دیکھا تو ان کو گھیر لیا اور اصرار کیا کہ گھر چلئے، بیوی بچے آپ کی جدائی سے مغموم اور پریشان ہیں، لوگ باصرار گھر لے آئے، دیوبند میں غازی کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔

انگریزوں کی جانب سے سیدؒ صاحب اور جماعت مجاہدین پر وہابیت کا جو الزام لگایا گیا تھا ضرورت ہے کہ تاریخی طور پر اس کا جائزہ لے کر یہ دیکھا جائے کہ حقیقت واقعہ کیا ہے؟

سید صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کی نسبت بڑے شد و مد سے کہا گیا ہے کہ ان کی اصلاحی تحریک نجد کی اصلاحی تحریک سے اخذ کی گئی ہے، اس بنا پر جس طرح شیخ محمد بن عبدالوہاب (۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء - ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء)

---

[۵] سید احمد شہید ص ۴۲۴ بحوالہ وقائع جلد سوم ص ۲۱۰ و ۲۱۱

کے متبعین کو وہابی کہا جاتا ہے اسی طرح اُن علماء کو بھی وہابی سے موسوم کیا جاتا ہے، جو کتاب وسنت کے مطابق اصلاحِ عقائد و اعمال کی دعوت دیتے رہے ہیں، مگر تاریخی عوامل سے اس الزام کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

بارھویں صدی ہجری میں عرب کے صوبے نجد میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کا آغاز ہوا، اصلاحِ عقائد و اعمال سے اس کی ابتدا ہوئی، مگر بہت جلد اس نے سیاسی نوعیت اختیار کرلی،۔ قرب وجوار کے مقامات پر قابض ہونے کے بعد متبعین شیخ نے خلافتِ عثمانیہ کے مقبوضات پر حملے شروع کردیے، ترکوں اور متبعین شیخ کے مابین متعدد جنگیں ہوئیں، یہاں تک کہ ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں خلافتِ عثمانیہ کی فوجوں نے نجد کے پایۂ تخت درعیہ پر قبضہ کرلیا، شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خاندان کے بہت سے افراد قتل ہوگئے۔

اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ سید صاحبؒ اور مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ نے ایک بڑے قافلے کے ساتھ ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء میں پہلی مرتبہ حج کیا، ظاہر ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے افکار وخیالات سے سرزمینِ حجاز میں روشناس ہونے کا یہی موقع ہوسکتا تھا، ورنہ اس دور میں انگریزوں، فرانسیسیوں اور پرتگالیوں کی سمندری تاخت نے بحری سفر کو خطرناک بنادیا تھا۔

سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور میں بحرِ ہند اور بحرِ عرب پر پرتگیزوں

اور انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ انھوں نے کئی مرتبہ حجّاج کے جہازوں کو لوٹ لیا تھا، اس وجہ سے بعض حیلہ جُو علماء کو عذر تراشی کا موقع مل گیا، اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ حج کے راستے میں امن باقی نہیں رہا ہے، جو شرائطِ حج میں سے ایک شرط ہے، اور جب شرط باقی نہیں رہی تو مشروط کی فرضیت ختم ہوگئی ہے۔

اگرچہ اسی وقت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، مولانا محمد اسمٰعیل اور مولانا عبدالحیؒ نے اپنے فتاویٰ کے ذریعے سختی کے ساتھ اس کی تردید کی تھی، مگر اس کے لئے عملی اقدام کی بھی ضرورت تھی، سید صاحبؒ کے عزمِ حج میں یہ مقصد بھی پیشِ نظر تھا کہ لوگوں کے دلوں سے ڈر اور خوف کو دور کیا جائے، چنانچہ اس میں کامیابی حاصل ہوئی، اور حج کرنے کا سلسلہ جو بند ہو چکا تھا سید صاحب کے حج کرنے کے بعد از سرِ نو جاری ہوگیا [۵۱]

سید صاحبؒ کے اصلاحی و تبلیغی دورے سفرِ حج سے بہت پہلے شروع ہو چکے تھے، ان کا آغاز ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء میں سید صاحبؒ کی ٹونک سے واپسی کے بعد ہوا۔ [۵۲]

اسی زمانے میں سفرِ حج سے قبل مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنی مشہور کتاب تقویۃ الایمان لکھی۔

---

[۵۱] تفصیل کے لئے دیکھئے سید احمد شہید مصنفہ غلام رسول مہر جلد اول باب ۱۶

[۵۲] سید احمد شہید جلد اول ص ۱۱۱

ارواحِ ثلاثہ میں امیر شاہ خاں[1] صاحب کی یہ روایت مذکور ہے:-
"مولوی اسمٰعیل صاحب نے تقویۃ الایمان اول عربی میں لکھی تھی چنانچہ اس کا ایک نسخہ میرے پاس اور ایک نسخہ مولانا گنگوہیؒ اور ایک نسخہ مولوی نصر اللہ خاں خورجوی کے کتب خانہ میں تھا، اس کے بعد مولانا نے اس کو اردو میں لکھا اور لکھنے کے بعد اپنے خاص خاص لوگوں کو جمع کیا، جن میں سید صاحب، مولوی عبدالحیؒ صاحب، شاہ اسحٰقؒ صاحب مولانا محمد یعقوب صاحب، مولوی فریدالدین مراد آبادی، مومن خاں (مومن) عبداللہ خاں علوی (استاد امام بخش صہبائیؒ، مولانا مملوک علی صاحب بھی تھے

---

[1] حاجی امیر شاہ خاں صاحب، خورجہ کے رہنے والے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے حلقۂ مریدین میں شامل تھے، اپنے زمانے کے بہت سے بزرگوں سے فیض حاصل کیا تھا، اگرچہ عالم نہ تھے، مگر فہم سلیم کے ساتھ قوتِ بیان پر پوری قدرت رکھتے تھے، حافظہ نہایت قوی تھا، بزرگوں کے بہت سے واقعات ان کو ازبر تھے، خصوصاً خاندانِ ولی اللّٰہی کے علماء و مشائخ کے حالات کے تو گویا حافظ تھے، ان کی نسبت مشہور تھا کہ بزرگوں کی زندہ تاریخ ہیں، ارواحِ ثلاثہ میں ان کی بیان کی ہوئی بہت سی روایتیں جمع کر دی گئی ہیں، یہ ۵۸ بزرگوں کا چار سو سے اوپر روایات کا مجموعہ ہے، دارالعلوم دیوبند سے بڑا تعلق تھا یہاں آتے اور مہینوں قیام فرماتے تھے، ۱۳۴۲ھ میں بمقام مینڈھو ضلع علی گڑھ وفات پائی۔

ان کے سامنے تقویۃ الایمان پیش کی، اور فرمایا میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ بھی آگئے ہیں اور بعض جگہ تشدّد بھی ہوگیا ہے، مثلاً ان امور کو جو شرکِ خفی تھے شرکِ جلی لکھ دیا گیا ہے، ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی اشاعت سے شورش ضرور ہوگی، اگر میں یہاں رہتا تو ان مضامین کو آٹھ دس برس میں بتدریج بیان کرتا، لیکن اس وقت میرا ارادہ حج کا ہے، اور وہاں سے واپسی کے بعد عزمِ جہاد ہے، اس لئے میں اس کام سے معذور ہوگیا اور میں دیکھتا ہوں کہ دوسرا اس بار کو اٹھائے گا نہیں اس لئے میں نے یہ کتاب لکھدی ہے، گو اس سے شورش ہوگی۔ مگر توقع ہے کہ لڑ بھڑ کر خود ٹھیک ہوجائیں گے، یہ میرا خیال ہے، اگر آپ حضرات کی رائے اشاعت کی ہو تو اشاعت کی جائے، ورنہ اسے چاک کر دیا جائے، اس پر ایک شخص نے کہا کہ اشاعت تو ضرور ہونی چاہیئے مگر فلاں فلاں مقام پر ترمیم ہونی چاہیئے، اس پر مولوی عبدالحیٔ صاحب، شاہ اسحٰق صاحب، عبداللہ خاں علوی، و مومن خاں نے مخالفت کی اور کہا کہ ترمیم کی ضرورت نہیں، اس پر آپس میں گفتگو ہوئی اور گفتگو کے بعد بالاتفاق یہ طے پایا کہ ترمیم کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اسی طرح شائع ہونی چاہیئے، چنانچہ اسی طرح اس کی اشاعت ہوگئی، اشاعت کے بعد مولانا شہید حج کو تشریف لے گئے اور حج سے واپسی کے بعد چھ مہینے دہلی میں قیام رہا، اس زمانے میں مولانا اسمٰعیل گلی کوچوں میں وعظ فرماتے تھے اور مولوی عبدالحیٔ صاحب

مساجد میں، چھ مہینے کے بعد جہاد کے لئے تشریف لے گئے، یہ قصہ میں نے مولوی عبدالقیوم صاحب اور اپنے استاد میاں جی محمدی صاحب وغیرہ سے سنا ہے[1]

مذکورہ بالا روایت سے صاف طور پر واضح ہے کہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ تقویۃ الایمان حجاز جانے سے قبل لکھ چکے تھے، اولاً یہ کتاب عربی میں لکھی گئی اور بعد ازاں اردو میں تصنیف ہوئی، بعض مضامین میں شدّت پیدا ہو جانے کا مصنّف نے خود بھی اعتراف کیا ہے، غالباً یہ شدّت اُس دور میں شرک و بدعات کے کثرت سے پھیل جانے کا نتیجہ ہے۔

---

[1] ارواحِ ثلاثہ، حکایت نمبر ۵۹۔ تقویۃ الایمان مصنفہ مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کا ایک قدیم مطبوعہ نسخہ جو اردو میں ہے اور ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء کا چھپا ہوا ہے، دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں موجود ہے، یہ نسخہ کلکتہ کے مطبع احمدی میں نستعلیق طابت میں ہے، سید عبداللہ ابن سید بہادر علی کے اہتمام سے چھاپا گیا ہے، گویا مصنف کی زندگی ہی میں اُن کی شہادت (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) سے چار سال پہلے یہ شائع ہو چکا تھا۔

تقویۃ الایمان کے چھاپنے والے یہ وہی سید عبداللہ ہیں جنھوں نے ۱۲۴۵ھ / ۱۸۲۹ء میں سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ترجمہ قرآن مجید شائع کیا ہے، سید عبداللہ کے والد سید بہادر علی فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف و ترجمے سے وابستہ تھے۔

مولانا شہیدؒ ان مضامین کو بتدریج آٹھ دس سال میں بیان کرنا چاہتے تھے مگر حالات کے تقاضے نے ان کو عجلت پر مجبور کر دیا۔

اس روایت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ تقویۃ الایمان کے مضامین کے سلسلے میں مولانا شہیدؒ منفرد نہ تھے بلکہ خاندانِ ولی اللہی کے ممتاز علماء حضرت شاہ محمد اسحٰق، حضرت شاہ محمد یعقوبؒ اور حضرت مولانا عبدالحیؒ کے علاوہ مولوی عبداللہ خاں علوی، مولوی فریدالدین مرادآبادی، حکیم مومن خاں مومن کو بھی تقویۃ الایمان کے مضامین سے اتفاق تھا، اور وہ اس حق میں نہ تھے کہ تقویۃ الایمان کے مسوّدے کو چاک کر دیا جائے!

جس زمانے میں متبعین شیخ محمد بن عبدالوہاب خلافتِ عثمانیہ کی فوجوں سے برسرِ پیکار تھے ٹھیک اسی زمانے میں سیّد صاحبؒ کی تحریکِ جہاد شروع ہوئی، جس کو بعد میں غلط فہمی کی بنا پر تحریکِ وہابیت سے متاثر ہونے کا نتیجہ سمجھ لیا گیا، حالانکہ اس تحریک کا شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا، یہ تحریک سفرِ حج سے کئی برس پہلے شروع ہو چکی تھی، درحقیقت اس سلسلے میں انگریزوں کی جانب سے بڑے پُرفریب طریقے اور شدّ و مد سے عام مسلمانوں کو جماعتِ مجاہدین سے بدظن اور برگشتہ کرنے کا پروپیگنڈہ کیا گیا، اس کا نہایت افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ انگریزوں نے اپنے پروپیگنڈے کا کام جس جماعت کے ذریعے سے لیا وہ خود علماء ہی کی جماعت تھی

اس طرح خود مسلمانوں کے اندر تشتّت وافتراق کی ایک عظیم خلیج پیدا کر کے مخالف محاذ کو کم زور کر دیا گیا۔

اس الزام کے غلط ہونے کا ایک واضح ترین ثبوت یہ ہے کہ تحریکِ وہابیت کو خلافتِ عثمانیہ کے نہ صرف مسلک سے اختلاف تھا بلکہ وہ سیاسی طور پر بھی اس کے خلاف سرگرم پیکار تھی، اور اس کے پُرجوش علم بردار غرصے تک خلافتِ عثمانیہ کے مقبوضات پر حملے کرتے رہے، اس کے برعکس مولانا شہیدؒ کے ہم مسلک علمار نے ہمیشہ خلافتِ عثمانیہ کو واجب التعظیم سمجھا ہے اور اس کی عظمت کو برقرار رکھنے میں ہمیشہ سرگرمی کے ساتھ حصّہ لیتے رہے ہیں، ۱۸۷۷ء/۱۲۹۴ھ میں جنگِ پلونا، جنگِ بلقان اور خصوصاً پہلی جنگِ عظیم کے موقعہ پر خلافتِ عثمانیہ کی مالی اور اخلاقی امداد و اعانت میں اس جماعت کے علمائے جس جوش و خروش کے ساتھ حصّہ لیا، اور ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف رائے عامّہ کو بیدار کر کے ترکوں کو اخلاقی مدد بہم پہنچائی، تاریخ کا ہر طالب علم اس سے باخبر ہے، چنانچہ ۱۹۱۹ء/۱۳۳۸ھ کی تحریکِ خلافت بھی اسی پرجوش تائید کا نتیجہ تھی!

حضرت شیخ الہندؒ نے قیامِ حجاز کے زمانے میں شریف مکہ کی ناراضگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس فتوے پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا جس میں ترکوں کی تکفیر کی گئی تھی، اور خلافتِ عثمانیہ کو ناجائز قرار دیا گیا تھا۔

غرض کہ وہابیّت کا الزام اولاً انگریزوں کی جانب سے سید صاحبؒ اور جماعتِ مجاہدین پر لگایا گیا، اور پھر اُن سب لوگوں کو اس کا نشانہ بنایا گیا جو مشرکانہ اوہام و رسوم کے مخالف اور کتاب و سنّت کی دعوت دینے کے مدعی تھے۔

برطانوی قوم کی ہمیشہ یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے اپنی مخالف طاقتوں کو پروپیگنڈے کے زور سے بدنام کرکے شکست دیتی... ہے. جماعتِ مجاہدین کے ساتھ بھی یہی عمل کیا گیا ان کو وہابی کہہ کر مسلمانوں میں بدنام کیا گیا اور اس طرح عام مسلمانوں کی ہمدردی اور تعاون سے محروم کرکے مجاہدین کو کمزور کر دیا گیا، اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ سید صاحبؒ کو ایک نئے مذہب کا بانی بتلا کر سرحد کے لوگوں کو بھڑکایا گیا تھا، برطانوی پروپیگنڈے کا یہ افسوں سید صاحبؒ کے خلاف کامیاب ثابت ہوا، اور بالآخر مجاہدین کی شکست کا ایک بڑا ذریعہ بنا۔

بنگال کے ایک سول انگریز افسر ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر نے اپنی سرکاری رپورٹ "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے ذریعے سے وہابیت کے الزام کی خوب تشہیر کی، اس شخص کو مجاہدین کی سرگرمیوں کی تحقیقات کے لئے حکومت نے مامور کیا تھا، چونکہ اس وقت مجاہدین انگریزوں سے گوریلا جنگ لڑ رہے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ ہنٹر کا رویّہ مجاہدین کے ساتھ انصاف پسندانہ نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ سمجھنا کہ سید صاحبؒ کی تحریک اصلاح اور دعوت کتاب و

سنت، وہابیت سے ماخوذ تھی، ایک ایسی بات پر یقین کرنا ہے، جو پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا!

ریشمی خطوط کی تحریک

معرکۂ بالاکوٹ اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی آزادی کے لئے تیسری سب سے بڑی منظم تحریک "ریشمی خطوط" کے نام سے مشہور ہے، اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو غیر منقسم ہندوستان کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔

۱۸۵۷ء کی مسلّح بغاوت کے بعد ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد ۱۲۷۴ھ میں جن جماعتوں نے حصّہ لیا اُن میں ایک جماعت وہ ہے جس کے قائد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ اسیرِ مالٹا تھے، یہی تحریک "ریشمی خطوط" کے نام سے موسوم ہے، اس تحریک کا مرکز دیوبند کے محلہ ابوالمعالی میں حضرت شیخ الہندؒ کا دیوان خانہ تھا، رازدارانہ اُمور قریب کی ایک حویلی میں انجام پاتے تھے جو "کوٹھی والی" کے نام سے موسوم ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء میں بریلی میں ہوئی، [1]

---

[1] حیات شیخ الہندؒ مصنفہ حضرت مولانا میاں سید اصغر حسینؒ ص ۹، طبع دوم

جہاں ان کے والد ماجد بریلی کالج میں پروفیسر تھے[1] ابتدائی تعلیم اپنے چچا مولانا مہتاب علی مرحوم سے حاصل کی، ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء میں جب دار العلوم قائم ہوا تو اس کے سب سے پہلے طالب علم آپ ہی تھے، دار العلوم کے نصاب کی تکمیل کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی خدمت میں رہ کر علم حدیث حاصل کیا، زمانۂ تعلیم میں ان کا شمار حضرت نانوتویؒ کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا تھا، چنانچہ ان کی اعلیٰ علمی اور ذہنی صلاحیتوں کے پیش نظر ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء میں ان کو دار العلوم کی مدرسی پر مقرر کیا گیا، ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء میں دار العلوم کے صدر المدرسین کی مسند پر فائز ہوئے، ان کے حلقۂ درس سے بڑے بڑے نامور اور یگانۂ روزگار علماء پیدا ہوئے، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے دار العلوم کے فارغ التحصیل طلبار کی ایک انجمن "ثمرۃ التربیت" کے نام سے قائم فرمائی[2] ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء میں ان کی مساعی کے نتیجے میں "جمعیۃ الانصار" کے نام سے ایک جماعت دار العلوم میں قائم ہوئی، مولانا عبید اللہ سندھی[3] کو اس کا ناظم مقرر کیا گیا "جمعیۃ الانصار" کا پہلا جلسہ مراد آباد میں منعقد ہوا، جس میں علماء کے علاوہ ہزاروں مسلمانوں نے

---

[1] مولانا محمد احسن نانوتوی مصنفہ محمد ایوب قادری ص ۲۷

[2] روداد دار العلوم بابت ۱۲۹۵ھ ص ۱۴

[3] مولانا عبید اللہ سندھی مغربی پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، ان کے والد ہندو سے سکھ ہو گئے تھے، ابتدائی تعلیم (باقی ص ۲۲۴ پر ملاحظہ ہو)

شرکت کی [۵۱] یہ اس زمانے کے لحاظ سے ایک عظیم الشان جلسہ تھا۔

---

[۵۱] روداد مؤتمر الانصار اجلاس اول ص ۱۶

(بقیہ حاشیہ صـ۲۲۳) جام پور کے مڈل اسکول میں پائی، دورانِ تعلیم ہی میں مشرف باسلام ہوئے، اور جام پور سے سندھ چلے گئے، وہاں حافظ محمد صدیقؒ کی خدمت میں کچھ مدت قیام کیا، حافظ صاحب ایک بڑے بزرگ اور درویشِ کامل تھے، مولانا سندھیؒ نے اپنی "ذاتی ڈائری" میں لکھا ہے کہ "حافظ صاحب کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میری طبیعتِ ثانیہ بن گئی"۔ مولانا سندھی ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء میں دار العلوم میں پہنچے اور ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں دورۂ حدیث میں شریک ہوئے، مگر تکمیل کی نوبت نہیں آئی، کچھ عرصے کے بعد سندھ چلے گئے، ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں پھر دیوبند تشریف لائے، اور اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ سے کتب حدیث کی اجازت حاصل کی، تعلیمی مشاغل کے علاوہ سیاسی امور میں بھی حضرت شیخ الہندؒ سے وابستہ ہو گئے، ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء میں جب دار العلوم میں جمعیۃ الانصار قائم ہوئی تو اس کے ناظم بنائے گئے ــــ جمعیۃ الانصار کی نظامت کے زمانے میں مولانا سندھی اور دار العلوم کے دوسرے علماء کے مابین بعض علمی مسائل میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا، جس کی وجہ سے ان کو دیوبند چھوڑنا پڑا، حضرت شیخ الہند نے ان کو دہلی بھیجدیا، وہاں انھوں نے نظارۃ المعارف کے نام سے ایک جماعت قائم کی جس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے علاوہ حکیم محمد اجمل خاں، اور نواب وقار الملک جیسی مقتدر شخصیتیں شامل تھیں۔

۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا سندھیؒ کو کابل بھیجا (باقی صـ۲۲۵ پر)

حکیم محمد اجمل خاں صاحب، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی مقتدر سیاسی شخصیتیں اسی زمانے میں حضرت شیخ الہندؒ سے وابستہ ہوئیں۔

پہلی جنگِ عظیم ابھی شروع نہیں ہوئی تھی، مگر اس کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے، برطانوی حکومت، سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف اعصابی جنگ شروع کر چکی تھی، حالات کی نزاکت بڑھتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء / ۱۳۳۲ھ میں جنگ کا خوفناک شعلہ بھڑک اٹھا، یہ زمانہ حضرت شیخ الہندؒ کے لئے بڑی بے چینی اور اضطراب کا تھا، انڈین نیشنل کانگریس کا نصب العین ابھی تک حقوق طلبی کی حد سے آگے بڑھنے نہیں پایا تھا،

(بقیہ صـ۲۲۴) وہاں انھوں نے متعدد سیاسی کام انجام دئے، کابل میں کانگریس کمیٹی قائم کر کے انڈین نیشنل کانگریس سے اس کا الحاق کیا، برطانوی مقبوضات سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی تھی" حزب اللہ" کے نام سے ایک فوج مرتب کی، حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے بعد روس چلے گئے، وہاں رہ کر سوشلزم کا مطالعہ کیا، ۱۹۲۳ء / ۱۳۴۲ھ میں ترکی کا سفر کیا اور وہاں سے حجاز چلے گئے، ۱۹۳۷ء / ۱۳۵۶ھ میں جب صوبوں میں کانگریس کی حکومت قائم ہوئی تو یوپی کی حکومت نے مولانا سندھیؒ کو ہندوستان آنے کی اجازت دے دی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور ریاست بہاولپور کے قصبہ چین پور میں انھوں نے زندگی کے بقیہ لمحات بسر کئے، ۲۱ اگست ۱۹۴۴ء / ۱۳۶۳ھ کو دین پور میں انتقال فرمایا۔

(نقشِ حیات جلد دوم ص ۱۳۷ - ۱۸۱)

یہ حالات تھے جن میں حضرت شیخ الہندؒ نے ایک انقلابی تحریک کی داغ بیل ڈالی، انھوں نے مسلح انقلاب کے ذریعے سے برطانوی حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کا منصوبہ تیار کیا، یہ بہت منظم منصوبہ تھا، ان کے شاگردوں اور رفقاء کار کی ایک بڑی جماعت جو ہندو بیرونِ ہند... اور سرحدی قبائل میں پھیلی ہوئی تھی، اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد میں شریک ہو گئی، سید احمد شہیدؒ کی جماعتِ مجاہدین سے بھی رابطہ قائم کیا گیا جو ہندوستان کی سرحد پر اکثر و بیشتر برطانوی حکومت سے برسرِ پیکار رہتی تھی، یہ تحریک بہت رازدارانہ طور پر چلائی گئی تھی۔

حضرت شیخ الہند کا منصوبہ یہ تھا کہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر آزاد قبائل کے ذریعے سے انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے اس وقت برطانیہ کی ساری فوجی طاقت جرمنی اور ترکی کے مقابلے میں مصروفِ جنگ تھی، سرحد پر جنگ شروع ہو جانے کے بعد برطانوی حکومت کے خلاف ہندوستان میں عام بغاوت برپا کرا دی جائے، تو اندرونی بغاوت اور بیرونی حملے پر قابو پانا برطانوی حکومت کے لئے مشکل ہو جائے گا، اور انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ دینے پر مجبور ہو جانا پڑے گا۔ چونکہ برطانیہ جیسی زبردست اور طاقتور حکومت سے مقابلہ تھا اس سے جنگ لڑنے کے لئے اور حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے اسلحہ کے علاوہ باقاعدہ فوج کی بھی ضرورت تھی، اس کے لئے افغانستان سے فوجی امداد حاصل کرنے کی غرض سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ

کو کابل بھیجا گیا، یہ اگست ۱۹۱۵ء / ۱۳۳۳ھ کا زمانہ تھا، مولانا سندھی کے کابل پہنچنے سے پہلے وہاں جرمنی سے ایک فوجی مشن پہنچ چکا تھا، جس میں جرمن اور ترک افسروں کے علاوہ راجہ مہندر پرتاپ، اور مولوی برکت اللہ شامل تھے[1]۔

اس مشن کے کابل آنے کا مقصد بھی وہی تھا جس کے لئے مولانا سندھیؒ کو کابل بھیجا گیا تھا، یہ کہ حکومت افغانستان کو ہندوستان پر حملے کے لئے آمادہ کیا جائے، جرمن مشن کی جانب سے یقین دلایا گیا تھا کہ ہندوستان سے جنگ شروع ہو جانے پر جرمنی اور ترکی کی فوجیں افغانستان کی مدد کے لئے وہاں پہنچ جائیں گی، اس طرح یہ متحدہ فوجی طاقت ہندوستان سے انگریزوں کو نکال دے گی، مگر جرمن مشن ہندوستان پر حملہ کرانے کے لئے افغانستان کو آمادہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

افغانستان خود ہندوستان پر قبضہ کرنا نہیں چاہتا تھا، اس کی خواہش صرف یہ تھی کہ ہندوستان کسی طرح برطانوی سامراج سے آزاد ہو جائے، اس لئے امیر حبیب اللہ خاں فرماں روائے افغانستان نے مشن کے سامنے یہ شرط پیش کی کہ حملے سے پہلے انڈین نیشنل کانگریس

---

[1] جرمن مشن کا لیڈر وان ہن ٹیگ (VON HENTIG) تھا، اور ترکی مشن کا قائد کاظم بے تھا (سرگزشت مجاہدین ص ۵۱۳)

سے معاہدہ ہوجانا چاہیئے، اور اس کے لئے مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور پنڈت موتی لال نہرو میں سے کسی ہندوستانی لیڈر کو کابل آنا چاہیئے [۵۱] مگر یہ مشن اس قسم کی یقین دہانی میں ناکام رہا، جرمن اور ترکی کا یہ مشن اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا اور افغانستان کی جانب سے ہندوستان پر حملہ کردیا جاتا تو نتیجہ ظاہر ہے، اس لئے کہ ہندوستان میں اس وقت انگریزی فوج کی تعداد پندرہ ہزار سے زیادہ نہ تھی، انڈین نیشنل کانگریس سے معاہدے کے بعد انگریزی حکومت کے لئے صورت حال کا نازک ترین بن جانا یقینی تھا، مگر جیسا کہ مولانا سندھی نے بیان کیا ہے، مشن کے ہندوستانی اور جرمن ممبروں میں یک جہتی قائم نہ رہ سکی جو ایسی سیاسی مہمات کے لئے ضروری ہے [۵۲]

مولانا سندھی کو کابل روانہ کرنے کے بعد ۱۳۳۳ھ (اگست ۱۹۱۵ء) میں حضرت شیخ الہند خود حجاز تشریف لے گئے، مکہ مکرمہ میں انھوں نے وہاں کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی اور پھر ترکی کے وزیر جنگ غازی انور پاشا سے ملے اور ان کے سامنے ہندوستان کو آزاد کرانے کا اپنا منصوبہ پیش کیا، اس وقت سلطنت عثمانیہ کی فوجیں ایک طرف تو برطانوی فوجوں سے برسرپیکار تھیں، اور دوسری طرف انگریزوں کی

---

۵۱ مشاہدات کابل و یاغستان ص ۳۲ بحوالہ سرگزشت مجاہدین مولانا غلام رسول مہر ص ۵۱۵

۵۲ ذاتی ڈائری بحوالہ نقش حیات جلد دوم ص ۱۵۹

ریشہ دوانیوں سے خود سلطنتِ عثمانیہ میں اندرونی طور پر بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی، ایسے نازک حالات میں ترکی حکومت کے لئے اسلحہ یا فوج کے ذریعے سے مدد دینا مشکل تھا، ادھر افغانستان کی نوجی اہمیت سے برطانیہ بھی غافل نہ تھا، اس نے اس خطرے کو محسوس کیا جرمن مشن افغانستان پہنچا ہوا تھا، برطانوی فوجوں نے دفعۃً عراق پر حملہ کر کے ترک اور جرمن فوجوں کے لئے افغانستان پہنچنے کا راستہ مسدود کر دیا، اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ترکی حکام نے حضرت شیخ الہندؒ کو مشورہ دیا کہ "آپ جلد سے جلد ہندوستان واپس پہنچ جائیں، اور وہاں ہندوستان کے لوگوں کو آزادیٔ کامل کے مطالبے پر آمادہ کریں، عنقریب صلح کانفرنس کا انعقاد ہونے والا ہے، اس میں ہم اور ہمارے دوست ملک جرمنی اور آسٹریا ہندوستان کی مکمل آزادی کے لئے جدوجہد کریں گے" اس یقین دہانی کے علاوہ حضرت شیخ الہندؒ کی خواہش پر ترکی حکام نے چند خطوط[1] لکھ کر دئے، جن میں ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کی تائید کرتے ہوئے ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا، اور ہندوستان کے لوگوں کو اپنی امداد و اعانت کا یقین دلایا گیا تھا، اور یہ تاکید کی گئی تھی کہ مولانا محمود حسن پر اعتماد کیا جائے اور ہر طرح ان کا ساتھ دیا جائے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے نہایت رازدارانہ طور پر ان خطوط کو اپنے ایک مخلص

---

[1] یہ خطوط غالب نامہ کے نام سے مشہور ہیں۔

مولوی ہادی حسن صاحب کے سپرد کرکے ان کو ہدایت کی کہ وہ ہندوستان میں ان خطوط کی فوٹو کاپیاں کراکر ان کو آزاد قبائل میں پہنچادیں، مولوی صاحب موصوف یہ اہم خطوط لے کر اپنے وطن خان جہاں پور پہنچ گئے

برطانوی حکام حضرت شیخ الہند کی سیاسی سرگرمیوں کو مدت سے شک وشبہ کی نظر سے دیکھ رہے تھے، حجاز جانے کے بعد یہ شبہ اور زیادہ قوی ہوگیا، حکومت کو غالب نامہ کا پتہ چل چکا تھا، اس کے حاصل کرنے کے لئے خفیہ پولیس بڑی تندہی سے مصروف تھی، مگر اسے کامیابی نہ ہوسکی، اسی دوران میں اتفاق سے اچانک وہ خطوط برطانوی حکام کے ہاتھ لگ گئے جن کو مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور مولانا منصور انصاریؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کے نام لکھا تھا، یہ وہی خطوط تھے جو ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں "ریشمی خطوط" کے نام سے موسوم ہیں، یہ واقعہ اگست ۱۹۱۶ء (شوال ۱۳۳۴ھ) کا ہے، مگر حضرت شیخ الہند کی جماعت میں کسی کو اس وقت اس واقعہ کا علم نہ ہوسکا تھا۔

حجاز میں حضرت شیخ الہندؒ کے قیام پر ایک سال گزر چکا تھا، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کو خیال ہوا کہ حضرت کے پاس اخراجات کے لئے روپیہ ختم ہوچکا ہوگا اس لئے روپیہ بھیجنا چاہئے، یہ واقعہ ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء کا ہے، اس کام کے لئے حضرتؒ کے ایک قریبی عزیز کا انتخاب کیا گیا، راستے میں عزیز مذکور کی سختی کے ساتھ تلاشی لی گئی، مگر پولیس کو کچھ ہاتھ نہ آیا حج کے بعد واپسی پر حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو تحریک سے متعلق بعض

اہم باتیں بتلائی تھیں، انہیں میں یہ بات بھی تھی کہ ترکی کے وزیر جنگ انور پاشا کے خطوط کس طرح مولوی ہادی حسن صاحب کے ذریعے سے بھیجے گئے ہیں، یہاں برطانوی پولیس غالب نامہ کی تلاش میں سرگرداں تھی، عزیز مذکور جب بمبئی پہنچے تو ان کو گرفتار کر کے الہ آباد لیجایا گیا، وہاں خفیہ پولیس کے حکام نے ان کو ڈرا دھمکا کر تمام راز معلوم کر لئے، پولیس خطوط کی تلاش میں خان جہاں پور پہنچی، مگر یہاں بھی ان کے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

عزیز مذکور کے ذریعے سے پولیس کو جو راز معلوم ہوئے ان کی نسبت حضرت مولانا مدنیؒ لکھتے ہیں کہ :-

"اُن میں کچھ ایسی باتیں بھی تھیں جو اگر ثابت ہو جاتیں تو نہ معلوم کتنوں کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑتا، کتنے عبور دریائے شور اور حبسِ دوام کی سزا پاتے" [1]

حضرت شیخ الہندؒ نے غالب نامے کو آزاد قبائل میں پہنچانے کا کام مولانا محمد میاںؒ کے سپرد فرمایا تھا، جس کو انھوں نے نہایت احتیاط کے ساتھ انجام دیا۔ مولانا محمد میاں آزاد قبائل سے گزرتے ہوئے افغانستان پہنچ گئے، مولانا عبید اللہ سندھیؒ وہاں پہلے سے موجود تھے، اور اب تک کئی اہم سیاسی کام کر چکے تھے، ضرورت تھی کہ ان تمام کارروائیوں کی اطلاع حضرت شیخ الہند تک پہنچائی جائے، چنانچہ دونوں

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے نقشِ حیات جلد دوم ص ۲۲۸ - ۲۳۱

حضرات نے ۱۹۱۶ء / ۱۳۳۵ھ کے وسط میں حضرت شیخ الہندؒ کو جو حجاز میں مقیم تھے، خطوط لکھے، جن میں حضرت شیخ الہندؒ کی ہدایت کے مطابق غالب نامے کی نوٹو کاپیوں کی تقسیم کی اطلاع، افغانستان کے سیاسی حالات، عارضی حکومت کی تشکیل کا ذکر، حزب اللہ کے نام سے فوجی تنظیم کا قیام، فوجی مرکزوں کے مقامات، ملکی اور فوجی عہدے داروں کی ترتیب اور عہدہ داروں کے ناموں کی پوری تفصیلات درج تھیں، یہ تمام خطوط اور تحریریں کاغذ کے بجائے زرد ریشم کے کپڑے پر لکھی گئی تھیں، یہ تمام دستاویزات ایک معتمد شخص عبدالحق کو دے کر سندھ روانہ کیا گیا، اس کو ہدایت کی گئی کہ وہ ان دستاویزات کو نہایت احتیاط کے ساتھ شیخ عبدالرحیم کو پہنچا دے، شیخ صاحب اس تحریک کے ایک اہم رکن تھے، شیخ صاحب کے نام جو خط تھا اس میں ان سے کہا گیا تھا کہ وہ حج کے لئے جائیں اور ان دستاویزات کو حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں پیش کر دیں، افسوس ہے کہ عبدالحق نے احتیاط برتنے کی ہدایت کے باوجود اس اعتماد کا حق ادا کرنے میں بڑی کوتاہی سے کام لیا، راستے میں اس نے اپنی سادہ لوحی سے ملتان کے ایک شخص خان بہادر حق نواز خاں پر بھروسہ کرتے ہوئے ان سے دستاویزات کا ذکر کر دیا، خان بہادر کے فرزند اللہ نواز خاں اس وقت کابل میں تھے اور عارضی حکومت کے سکریٹری تھے، مگر خود خان بہادر کی وفاداری برطانوی حکومت سے وابستہ تھی۔

انھوں نے عبدالحق کو بہلا پھسلا کر اس سے دستاویزات لے لیں

اور پنجاب کے گورنر سر مائیکل اوڈوائر[1] کے حوالے کر دیں، برطانوی حکام مدت سے غالب نامے کی تلاش میں سرگرداں تھے، اور حضرت شیخ الہندؒ سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے تفتیش کا سلسلہ جاری تھا، ان دستاویزات کے ہاتھ آجانے پر ریشمی خطوط کی جملہ کارروائیوں کا برطانوی حکام کو انکشاف ہو گیا۔

مذکورہ بالا خطوط کے آزاد قبائل میں پہنچ جانے کے بعد خود حضرت شیخ الہندؒ نے بھی ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر پہنچنے کا ارادہ فرمایا ابھی حجاز سے روانگی نہ ہونے پائی تھی کہ شریف حسین والیٔ مکہ نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا، جس کی وجہ سے حجاز میں نقل و حرکت دشوار ہو گئی، حضرت شیخ الہندؒ روانگی کی تدبیر اور انتظار میں مصروف ہی تھے کہ اچانک ۲۳ صفر ۱۳۳۵ھ کو شریف حسین کے حکم سے ان کو گرفتار کر کے مع رفقاء کے جدّہ بھیج دیا گیا، وہاں تین ہفتے تک حراست میں رکھنے کے بعد مصر روانہ کر دیا گیا، جہاں ایک مہینے تک جیل میں برطانیہ کی زیرِ نگرانی رکھا گیا، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے جو اس گرفتاری میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ تھے اپنی خود نوشت سوانح، نقشِ حیات میں لکھا ہے کہ "پہلے ہمارا خیال تھا کہ ہماری گرفتاری شریف حسین کی جانب سے عمل میں آئی ہے

---

[1] سر مائیکل اوڈوائر ۱۹۱۶ء ۱۳۳۵ھ میں پنجاب کا گورنر تھا، وہ اردو خوب جانتا تھا اور اپنی سخت گیری کے لئے پنجاب بھر میں بدنام تھا (سرگزشت مجاہدین، غلام رسول مہر ص ۶۵۸)

مگر انگریز افسر کے بیان لینے اور سوالات کرنے سے ظاہر ہوا کہ یہ گرفتاری تحریکِ آزادی کی ان کارروائیوں کی بنا پر ہوئی ہے جو صوبہ سرحد، کابل اور دیوبند میں مدتوں سے ہوتی رہی ہیں [1]"

مصر میں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کو ایک مہینے تک جیل میں رکھنے کے بعد ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ (۱۶ فروری ۱۹۱۷ء) کو مالٹا روانہ کر دیا گیا۔

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے پیراگراف ۱۶۴ میں سرکاری طور پر ریشمی خطوط کی تحریک کے متعلق جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے :-

"اگست ۱۹۱۶ء / ۱۳۳۵ھ میں ریشمی خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا، یہ ایک منصوبہ تھا جو ہندوستان میں اس خیال سے تجویز کیا گیا تھا کہ ایک طرف شمال مغربی سرحد پر گڑبڑ پیدا کرے اور دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کی شورش سے اسے تقویت دے کر برطانوی حکومت کو ختم کر دیا جائے اس منصوبے کو عمل میں لانے کے لئے مولوی عبید اللہ نامی ایک شخص نے

---

[1] نقشِ حیات جلد دوم ص ۲۴۳، مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی۔

[2] ہندوستان میں عام سیاسی بے چینی کا میلان دیکھ کر برطانوی حکومت نے ۱۹۱۷ء / ۱۳۳۶ھ میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تھی، جس نے بہت سی خفیہ جماعتوں کے حالات کا سراغ لگایا، اس تحقیقاتی کمیٹی کا صدر ایک انگریز جج رولٹ تھا، اسی کے نام پر یہ کمیٹی موسوم ہے۔ (تاریخ ہندہاشمی فرید آبادی ص ۴۳۴)

اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ اگست ۱۹۱۵ء/۱۳۳۳ھ میں شمال مغربی سرحد کو عبور کیا، عبید اللہ پہلے سکھ تھا بعد میں مسلمان ہوا، اس نے دیوبند میں مذہبی تعلیم حاصل کی، عبید اللہ نے جن لوگوں پر اپنا اثر ڈالا اُن میں سب سے بڑی شخصیت مولانا محمود حسن کی تھی، جو مدتوں اس درس گاہ کے صدر مدرس رہے، عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے فارغ التحصیل علماء کے ذریعے سے ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف ایک عالم گیر تحریک چلائے، مولانا محمود حسن کے مکان پر خفیہ مجالس قائم ہوتی تھیں، کہا جاتا ہے کہ سرحد کے کچھ آدمی بھی ان میں شریک ہوتے تھے، ۸ ستمبر ۱۹۱۵ء/۱۳۳۳ھ کو مولانا محمود حسن نے ہندوستان چھوڑ دیا اور حجاز پہنچ گئے، عبید اللہ اور مولانا محمود حسن کا اہم مقصد یہ تھا کہ بیک وقت ہندوستان پر باہر سے حملہ کرایا جائے اور ہندوستان میں بھی بغاوت پھیلائی جائے، عبید اللہ اور اس کے دوستوں نے پہلے ہندوستانی متعصب جماعت مجاہدین سے ملاقات کی اور پھر کابل پہنچے، وہاں عبید اللہ کی ملاقات ترک جرمن مشن سے ہوئی، کچھ عرصے کے بعد اس کا دیوبندی دوست محمد میاں[۵۱] بھی اس سے جا ملا، یہ شخص مولانا محمود حسن کے ساتھ حجاز گیا تھا اور وہاں سے

---

[۵۱] محمد میاں اصل نام تھا، مگر جب حجاز سے غالب نامہ لیکر ہندوستان آئے تو پولیس کی گرفت سے بچنے کے لئے اپنا نام منصور انصاری رکھ لیا تھا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نواسے تھے اور مولانا عبید اللہ انصاری ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فرزند اکبر تھے، ضلع سہارنپور کا قصبہ امبہٹہ وطن تھا، دار العلوم سے فراغت کے بعد کئی مدرسوں میں مدرس رہے، آخر میں حضرت شیخ الہندؒ نے (باقی حاشیہ ص ۲۳۶ پر)

۱۹۱۶ء / ۱۳۳۴ھ میں جہاد کا ایک اعلان حاصل کرکے واپس آیا تھا، جسے مولانا محمود حسن نے حجاز کے ترکی سپہ سالار غالب پاشا سے حاصل کیا تھا، یہ دستاویز "غالب نامہ" کے نام سے مشہور ہے، محمد میاں نے اس کی فوٹو کاپیاں راستے میں ہندوستان اور سرحدی قبائل میں تقسیم کیں۔

(بقیہ ص ۲۳۵) قرآن شریف کے ترجمے میں اعانت کے لئے اپنے پاس بلالیا تھا، اسی زمانے میں جمعیۃ الانصار کے نائب ناظم بھی رہے، نہایت صائب الرائے اور ذی استعداد عالم تھے، سفر حج میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ تھے، حجاز سے غالب نامہ کو ہندوستان اور آزاد قبائل تک پہنچانے میں ان کا زبردست حصہ تھا، ریشمی خطوط کی تحریر میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے ساتھ شریک تھے حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کے بعد افغانستان میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے تھے، حکومت افغانستان پر ان کے علم و فضل اور اصابت رائے کا بڑا اثر تھا، قیام افغانستان کے زمانے میں متعدد سیاسی رسائل تصنیف فرمائے، حکومت الٰہی اساس انقلاب، دستور امامت اور انواع الدول ان کی اعلیٰ ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں، افغانستان میں متعدد اعلیٰ سیاسی عہدوں پر فائز رہے، آخر عمر میں جلال آباد (افغانستان) میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، وہیں ۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۶ء میں وفات پائی ان کے بڑے صاحبزادے مولانا حامد الانصاری غازی مشہور صحافی ہیں، عرصہ تک "مدینہ" بجنور کی ادارت کے فرائض انجام دے چکے ہیں، دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں مدت تک جمعیۃ علماء مہاراشٹر کے صدر رہ چکے ہیں، اسلام کا نظام حکومت ان کی معرکۃ الآراء تصنیف ہے جو ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی ہے، مولانا منصور انصاری کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے نقش حیات جلد دوم ص ۱۸۹ تا ۱۹۱

عبیداللہ اور اس کے ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمے پر عارضی حکومت کے لئے ایک تجویز تیار کی تھی، اس تجویز کے مطابق مہندر پرتاب نامی ایک شخص کو صدر ہونا تھا[۱]، یہ شخص ایک معزز خاندان کا جو شیلا ہندو ہے

---

[۱] راجہ مہندر پرتاب ضلع متھرا کے ایک رئیس تھے، ۱۹۱۴ء / ۱۳۳۳ھ میں ہندوستان سے سوئزرلینڈ چلے گئے اور امریکن غدر پارٹی میں شامل ہو گئے، پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں جرمنی سے جو مشن افغانستان بھیجا گیا تھا اس میں جرمن اور ترک ممبران کے ساتھ یہ بھی شریک تھے، قیام کابل کے زمانے میں عارضی حکومت کی جانب سے روسی ترکستان کے گورنر اور زار روس کو جو خطوط بھیجے گئے تھے ان پر عارضی حکومت کے صدر کی حیثیت سے راجہ مہندر پرتاب نے دستخط کئے تھے، ان خطوط میں دونوں حکومتوں سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے میں مدد دینے کی درخواست کی گئی تھی۔

(نقش حیات جلد دوم ص ۲۴۱ و ۲۴۲)

راجہ مہندر پرتاب ہندوستان کی آزادی سے کچھ پہلے اپنی سیاسی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر کے ہندوستان واپس آگئے تھے، اب تک بقید حیات ہیں دہرہ دون میں قیام ہے، خود راجہ مہندر پرتاب کے بیان کے مطابق وہ اس وقت تک کے لئے صدر مقرر ہوئے تھے جب تک کانگریس حکومت بنائے، اس عارضی حکومت میں مولوی برکت اللہ وزیر اعظم اور مولانا سندھی وزیر داخلہ بنایا گیا تھا۔

(میری داستانِ حیات MY LIFE STORY ص ۵۱)

سنہ ۱۹۱۴ء / ۱۳۳۳ھ کے آخر میں اسے سوئزرلینڈ، اٹلی اور فرانس وغیرہ جانے کا پاسپورٹ دیا گیا تھا، یہ سیدھا جنیوا گیا اور وہاں بدنام زمانہ ہردیال سے ملا، جس نے اسے جرمن قونصل سے ملایا، وہاں سے یہ برلن آیا اور ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا خود عبیداللہ کو وزیر داخلہ اور برکت اللہ کو وزیر اعظم بننا تھا، برکت اللہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا[1]۔

---

[1] جن حریت پسند ہندوستانیوں نے امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں بیٹھ کر آزادی کے لئے کوششیں شروع کردی تھیں، ان میں لالہ ہردیال کی غدر پارٹی کو خاصی شہرت حاصل ہوئی ہے، مولانا برکت اللہ نے بھوپال میں تعلیم پائی تھی، وہ اصلاً فتح پور کے رہنے والے تھے، مگر خود اپنے آپ کو بھوپالی لکھتے تھے۔ قرآن مجید اور صحاحِ ستّہ کے گویا حافظ تھے، میٹرک تک انگریزی بھی پڑھی تھی تبلیغِ اسلام کے جوش میں انگلستان گئے، وہاں سے امریکہ پہنچے اور کچھ عرصے تک ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر رہے، ہر مقام پر تبلیغ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کی تنظیم اور آزادیٔ وطن کے لئے کوشاں رہتے تھے، امیر حبیب اللہ خاں نے باصرار ان کو اپنے پاس ٹھہرا لیا تھا، مگر کچھ مدّت کے بعد روس چلے گئے، لینن ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔

روس سے جرمنی، فرانس اور سوئزرلینڈ گئے، آخر میں کیلی فورنیا جاکر وفات پائی۔

(سرگزشت مجاہدین، غلام رسول مہر ص ۵۱۳)

سنہ ۱۹۱۶ء / ۱۳۳۵ھ کی ابتدا میں مشن کے جرمن ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے، مگر ہندوستانی ممبر وہیں رہے، انھوں نے عارضی حکومت کی جانب سے روسی ترکستان کے گورنر اور زارِ روس کو خطوط بھیجے، جس میں ان سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے امداد طلب کی گئی تھی، ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاب کے دستخط تھے، زارِ روس کو جو خط لکھا گیا تھا وہ سونے کی تختی پر تھا، اس عارضی حکومت کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ ترکی حکومت سے روابط قائم کئے جائیں، اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے عبید اللہ نے ۹ر جولائی سنہ ۱۹۱۶ء / ۱۳۳۵ھ کو مولانا محمود حسن کے نام ایک خط لکھا، اس کے ساتھ دوسرا خط محمد میاں انصاری کا تھا جس میں غالب نامہ کی اشاعت کا ذکر تھا، عارضی حکومت اور "حزب اللہ" کے نام سے فوج کے قیام کی تجویز درج تھی، اس فوج کی بھرتی ہندوستان سے کرنی تجویز ہوئی تھی، عارضی حکومت کا کام اسلامی حکومتوں کے درمیان اتحاد کا سلسلہ قائم کرنا تھا، مولانا محمود حسن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ سارے واقعات سلطنتِ عثمانیہ تک پہنچا دیں، یہ خطوط زرد ریشم پر لکھے گئے تھے [1]

عبید اللہ کے خط میں حزب اللہ کا مکمل و مرتب نقشہ تھا، اس فوج کا مرکز مدینہ میں قائم ہونا تھا، خود مولانا محمود حسن کو اس کا سالار اعلیٰ بننا تھا

---

[1] انھی خطوط کی وجہ سے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک "ریشمی خطوط" کے نام سے موسوم ہے۔

ثانوی مراکز مقامی سالاروں کے ماتحت قسطنطنیہ، طہران اور کابل میں قائم ہوئے تھے، کابل کا سالار عبیداللہؒ کو بنایا تھا، اس فہرست میں تین سربرآوردہ ۱۲ جنرلوں اور کئی اعلیٰ فوجی عہدے داروں کے نام درج ہیں، یہ ریشمی خطوط برطانوی حکومت کے ہاتھ آگئے ہیں، ان خطوط میں جو اطلاعات درج ہیں ان کی وجہ سے چند پیش بندیاں مناسب سمجھی گئیں، ۱۹۱۶ء / ۱۳۳۵ھ میں مولانا محمود حسن اور ان کے چار ساتھی برطانوی حکومت کے قبضے میں آگئے، وہ اس وقت برطانوی نگرانی میں جنگی قیدی ہیں، غالب نامہ پر دستخط کرنے والا غالب پاشا بھی جنگی قیدی ہے، اس نے یہ اقرار کیا ہے کہ محمود حسن پارٹی نے میرے سامنے ایک خط رکھا تھا جس پر میں نے دستخط کئے ہیں" [۱]

جیسا کہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں بتلایا گیا ہے، قبل از وقت برطانوی حکومت پر اس منصوبے کا انکشاف ہو گیا اور وہ تمام دستاویزیں اور خطوط جن میں تحریک کی نہایت اہم کارروائیوں کی تفصیلات درج تھیں برطانوی حکومت کے ہاتھ آگئے تھے، جس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر کے اختتام جنگ تک مالٹا میں نظر بند رکھا گیا، مالٹا سے ۳ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء کو تقریباً تین سال دو ماہ کے بعد ہندوستان کے لئے روانہ کیا گیا۔ [۲]

---

[۱] ذاتی ڈائری مولانا عبیداللہ سندھیؒ ص ۵۳-۶۰، بحوالہ نقش حیات جلد دوم ص ۲۳۸

۲۴۴ - [۲] نقش حیات جلد دوم ص ۲۳۳، مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی

منصوبے کے انکشاف کے بعد اگرچہ ریشمی خطوط کی تحریک بظاہر ختم ہو گئی مگر حضرت شیخ الہندؒ کے جذبۂ حریت میں کوئی کمی نہیں آئی، ہندوستان پہنچنے پر برطانوی حکومت نے مختلف ذرائع سے ان کو سیاسیات سے کنارہ کش رہنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر انھوں نے اسے مسترد کر دیا۔ بمبئی میں جہاز سے اترنے پر مولانا شوکت علی مرحوم اور خلافت کمیٹی کے ممبروں سے ملاقات ہوئی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنؤ سے اور گاندھی جی احمد آباد سے آکر بمبئی میں ملے، دوسرے لیڈروں سے بھی باتیں ہوئیں، اور حضرت شیخ الہندؒ خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ آزادیٔ وطن کی تحریک میں شریک ہو گئے اور اس طرح ہندوستان کی آزادی کے لئے "مسلح جدّوجہد" کا یہ منصوبہ ختم ہو گیا۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی ذاتی ڈائری کے دیباچہ نگار نے لکھا ہے کہ شیخ الہندؒ کی جماعت کو گزشتہ جنگِ عظیم میں وہی حیثیت حاصل تھی جو دوسری جنگ کے دوران آزاد ہند فوج اور آزاد حکومتِ ہند کو حاصل رہی ہے، جس طرح بعد از جنگ کی موجودہ سرگرمیاں دراصل دورانِ جنگ کی باغیانہ جدوجہد کی ترقی یافتہ صورت ہے، اسی طرح تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء / ۱۳۳۸ھ تا ۱۹۲۲ء / ۱۳۴۱ھ) کی سیاسی جدوجہد حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت اور ان کے شرکاء کار کی سرگرمیوں کی ترقی یافتہ صورت تھی، اگر آزاد ہند کے کارناموں کا سہرا سبھاش چندر بوس کے سر ہے تو پہلی جنگِ عظیم کے بعد کی سرگرمیوں کا مرکز حضرت شیخ الہندؒ تھے، ان کی سیاسی سرگرمیاں ۱۹۰۵ء سے شروع ہوئی تھیں اور اس پروگرام کا جزو تھیں جس کو ۱۳۲۳ھ

مولانا عبیداللہ سندھی، شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک کے نام سے یاد کرتے ہیں [۱]

حضرت شیخ الہندؒ کی اس تحریک میں جو حضرات شریک تھے ان میں حسب ذیل اسمارِ گرامی لائق ذکر ہیں :-

مولانا عبیداللہ سندھی، حاجی ترنگ زئی، مولانا سیف الرحمٰن پشاوری مولانا منصور انصاری امبہٹوی، مولانا عزیر گل پشاوری، مولانا احمداللہ پانی پتی مولانا ظہور محمد خاں سہارنپوری، شیخ عبدالرحیم سندھی، مولانا غلام محمد دین پوری مولانا تاج محمود سندھی، مولانا محمد صادق کراچوی، مولانا فضل ربی پشاوری مولانا محمد اکبر یاغستانی، مولانا فضل محمود پشاوری، خان عبدالغفار خاں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد احمد جکوالی (پنجاب) شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ (سہارنپور) مولانا محمد مبین دیوبندی، مولانا محمد ابراہیم رانڈیری [۲]

---

[۱] ذاتی ڈائری مولانا عبیداللہ سندھی ص ۳

[۲] ریشمی خطوط کی تحریک کے تفصیلی حالات کے لئے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی ذاتی ڈائری اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی خودنوشت سوانح نقش حیات جلد دوم ملاحظہ فرمائیے۔

مذکورہ بالا مختصر حالات انہی دونوں کتابوں سے اخذ کئے گئے ہیں، ابتدائی حالات حضرت مولانا میاں سید اصغر حسینؒ کی تصنیف "حیاتِ شیخ الہندؒ" سے ماخوذ ہیں۔

دیوبند ایک ادیب کی نظر میں

مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ نے "ہدیۃ السنیہ" میں یہاں کی عمارتوں، آب وہوا، صنعت وحرفت، جنگل، پیداوار، اور باشندوں کی مزاجی کیفیت کا نہایت لطیف ادیبانہ پیرایہ میں تعارف کرایا ہے، ذیل میں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں :-

"دیوبند ایک قدیم آبادی اور بڑا قصبہ ہے، شرقاً رکی بستی اور باعظمت شہر ہے، معلوم ہوتا ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد کی ابتدائی بستیوں میں سے ہے، یہاں وسیع عبادت گاہیں، بلند مسجدیں، مشہور نشانات، قابلِ زیارت مزارات، بہترین آثار، مبارک خبریں، مضبوط عمارتیں، مستحکم اور محفوظ مکانات اور بلند کوٹھیاں ہیں، یہ شہر خیر سے قریب اور شر سے دُور ہے، یہ پاکیزہ بستی لطافت اور صفائی کے لحاظ سے نہایت خوبصورت ہے، اس کے جنگل میں درخت اور پھل، تفریح گاہیں اور نہریں، حوض اور باغیچے اور خوش منظر جھاڑیاں ہیں، آب وہوا کے اعتبار سے نہایت عمدہ اور صبح وشام کی لطافت کے لحاظ سے عجیب وغریب ہے، ہوا ایسی منوّر اور روشن کہ روح وجسم کے لئے قوت بخش ہے، اس کی زمین گنوانی بارش کو قبول کرنے والی سرسبز اور شاداب ہے، چکنی مٹی چونہ سے زیادہ مضبوط اور کنکل سیمنٹ کی مانند مضبوط ہے، اس سے یہاں کے باشندوں کی قوتِ مزاجی، طبائع کی پختگی

پر استدلال کیا جا سکتا ہے، یہاں کا پانی ٹھنڈا، شیریں اور ہلکا ہے اور اپنی خوبیوں کے لحاظ سے آبِ حیات سے بڑھا ہوا ہے، یہاں تاجروں اور شہروں کے سامانِ تجارت کی منڈی ہے، دور دراز کے لوگ یہاں آتے اور ٹھہرتے ہیں، مسافروں کے لئے بہترین فرود گاہ ہے، خصوصاً جب سے ریل جاری ہوئی ہے اس وقت سے تو قریب کے مسافروں کے لئے ناشتہ گاہ اور دُور کے لوگوں کے لئے شام کے کھانے کی جگہ بن گیا ہے۔

پرانے زمانے میں یہاں کی اعلیٰ درجے کی صیقل کی ہوئی تلواریں مشہور تھیں، اسی طرح عمدہ قسم کے سوتی کپڑے میں دیوبند مشہور تھا، گنا اور شکر تو دیوبند جیسی شاید ہی کہیں ہوتی ہو، ذائقہ میں شہد اور خوشبو میں رند[1] کی مانند ہے اس کی خصوصیات سے سمرقند کو کیا نسبت۔ یہاں کے باشندے خدا ترس بادشاہ کے مطیع، علما کے فرمانبردار، فقرا کے گرویدہ ہیں، اکثر شرفا حضرت عثمان ذی النورین رضؓ کی اولاد میں سے ہیں۔

اس شہر کے منجملہ اور فضائل کے عمدہ آموں کی کثرت اور ان کی نفاست پاکیزگی ہے، یہ جنت کے میووں سے زیادہ مشابہ ہیں، رنگ میں عجیب و غریب اور خوشبو میں بہترین اور طرح طرح کے لذیذ ذائقوں والے ہیں، ان کے رنگوں کا یہ حال ہے کہ بعض انار کی طرح سرخ ہیں گویا سبز درختوں میں آگ لٹکی ہوئی ہے، اور بعض تیز زرد ہیں کہ دیکھنے والوں کی نظروں کو کھلے معلوم ہوتے، مشتاق لوگ اس کو دیکھنے سے تعجب کرتے ہیں جو اپنی سبزی میں ساری سبزیوں سے فائق ہو گئے ہیں

---

[1] رند ایک خوشبودار درخت۔ ۱۲ الہدیۃ السنیۃ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ص ۱۰

شبِ برات کی لڑائی

دیوبند کے حالات میں شبِ برات کی لڑائی کو ایک زمانے میں بڑی اہمیت حاصل تھی، وقائع نگار کی حیثیت سے میرا فریضہ ہے کہ اس تاریخی رسم کی تفصیلات پیش کروں، دیوبند میں عرصے سے یہ رواج چلا آتا تھا کہ ہر سال ۱۴ ۱۵ شعبان کی راتوں میں ایک دل چسپ "نمائشی جنگ" ہوتی تھی جو "شبِ برات کی لڑائی" کے نام سے موسوم تھی، اس لڑائی میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے تھے، مسلمانوں کی ہر ایک برادری کے نہ صرف نوجوان بلکہ بچے اور بوڑھے تک اس میں حصّہ لیتے تھے۔

معمول یہ تھا کہ شہر کو دو حصّوں میں تقسیم کر لیا گیا تھا، ایک حصّہ "کوٹلہ" کے نام سے موسوم تھا اور دوسرا گروہ "شہر والا" کہلاتا تھا، دونوں گروہوں کا علیحدہ علیحدہ سالار ہوتا تھا، ہر ایک گروہ میں متعدد گروپ ہوتے تھے، جو "ٹھولہ" کے نام سے موسوم کئے جاتے تھے، ایک ٹھولہ کئی کئی سو افراد پر مشتمل ہوتا تھا، لڑائی آبادی سے باہر بجانب مغرب جنگل میں ہوتی تھی، ہر ایک فریق اور ٹھولے کا ایک مقام مقرر ہوتا تھا، جو اس فریق کا "مورچہ" کہلاتا تھا، دونوں فریقوں کے درمیان خطِ فاصل قائم ہوتا تھا جس کے عبور پر فتح و شکست کا انحصار ہوتا تھا، جو فریق ہار جاتا وہ میدان چھوڑ کر چلا جاتا فاتح فریق اس کے "مورچے" پر قابض ہو کر فتح کے شادیانے بجا کر اپنے قبضے کا

اعلان کرتا۔

لڑائی کی صورت یہ تھی کہ ۱۴ شعبان کو آدھی رات کے قریب "ٹھولے" اپنے اپنے محلوں سے نکلتے، باجے ساتھ ہوتے تھے، بارہ بجے تک ہر ایک فریق اور ٹھولہ اپنے مقررہ مورچے پر پہنچ کر قابض ہو جاتا تھا، نصف شب گزرنے پر لڑائی شروع ہو جاتی جو فیصلہ کن نہ ہونے کی صورت میں صبح تک جاری رہتی اگر صبح تک کسی فریق کو شکست نہ ہوتی تو سفید جھنڈے دکھلا کر لڑائی آئندہ شب کے لئے ملتوی کر دی جاتی، اگرچہ لڑائی پہلی شب میں بھی پوری قوت کے ساتھ لڑی جاتی مگر فتح و شکست کا انحصار دوسری شب کی آخری لڑائی پر تھا، جو فریق اس میں جیت جاتا وہ آئندہ سال تک جیتا ہوا سمجھا جاتا تھا۔

اس لڑائی میں تین قسم کے حربے استعمال کئے جاتے تھے، بیل جو ایک درخت کا پھل ہوتا ہے اس کا گودا نکال کر اندر سے خالی کر کے اس میں بارود بھر کر بیل کا منہ بند کر دیا جاتا۔ ہر شخص بیلوں کی کافی مقدار اپنے ساتھ رکھتا، یہ بیلیں دن میں بھر لی جاتی تھیں، لڑائی کے وقت اس میں آگ لگا کر بیل کو فریق مخالف پر پھینکتے تھے، یہ نہایت خطرناک قسم کی آتش گیر چیز تھی اس کا وزن ڈیڑھ پاؤ سے لے کر آدھ سیر تک ہوتا تھا۔

دوسرا حربہ گوپیا تھا، جس میں پتھر رکھ کر چلاتے تھے، یہ دونوں چیزیں تو دور کے لئے تھیں، جب مخالف گروہ ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے تو دست بدست لڑائی ہوتی، جس میں لاٹھی استعمال کی جاتی تھی، ہر ایک فریق دوسرے فریق پر قطعاً دشمن کی طرح حملہ آور ہوتا تھا۔

اس لڑائی کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اگر کوئی مرجاتا تھا تو اس کے ورثاء اس کے خون کا مطالبہ نہیں کرتے تھے، زخمیوں کا تو کوئی ذکر ہی نہیں ہے، وہی لوگ جو رات کو دشمنوں کی طرح ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوتے صبح کو انھیں لوگوں کی جنھیں انھوں نے مجروح کیا تھا مرہم پٹی اور تیمارداری کرتے نظر آتے تھے، جماعتی فتح و شکست کے علاوہ انفرادی انتقام کے جذبے کا اس میں شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔

دیوبند میں نامعلوم مدت سے اس لڑائی کا سالانہ دستور چلا آرہا تھا، حکومت نے کبھی اس لڑائی سے تعرض کرنا مناسب نہیں سمجھا، سنہ ۱۳۶۷ھ کے شعبان سے مقامی حکام نے اس لڑائی کو بند کردیا ہے۔ ۱۹۴۸ء

معاشی حالت

انگریزی حکومت سے قبل تجارت پیشہ لوگوں کے علاوہ زمینداروں کا بھی ایک بڑا طبقہ تھا، یہ لوگ عام طور سے مرفہ الحال ہوتے تھے، انکی مرفہ حالی کا اندازہ ان عالی شان حویلیوں سے کیا جا سکتا ہے، جو اس دور میں تعمیر ہوئیں، جن کا ذکر آئندہ اوراق میں اپنے موقع پر آئے گا، تاریخ سہارنپور میں لکھا ہے کہ دیوبند کی بیشتر آراضی معافی دوام تھی، جو مسلمان بادشاہوں، روہیلوں اور مرہٹوں کے عہد حکومت میں دی جاتی رہی تھی برطانوی حکومت کے زمانے میں ضبط ہوکر محال مضبطہ قرار دی گئی"۔ [1]

---

[1] تاریخ سہارنپور ص ۱۶۱

برطانوی عہد میں یہاں کی تجارت اور صنعت و حرفت کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا، اسی طرح زمیندار بھی دن بدن مفلوک الحال ہوتے چلے گئے، موجودہ دور میں اہلِ ہنود کی حالت بہتر اور روبترقی ہے، وہ جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ ہیں، مگر مسلمان پچھلے سو برس سے بالعموم نکبت اور افلاس کے شکنجے میں گرفتار رہیں۔

ستمبر ۱۹۴۶ء کے راشننگ سسٹم کے اعداد و شمار کے مطابق دیوبند میں ۲۴۹۱ خاندان ایسے تھے جن کے افراد کی آمدنی ۴۰ روپے ماہانہ سے زیادہ تھی اور ۲۹۱۵ خاندان ایسے تھے جن کے افراد کی آمدنی ۴ روپے ماہوار سے کم تھی۔

صنعت و حرفت اور تجارت

دیوبند کی مصنوعات میں کرگھے کا کپڑا جو باریک اور مہین ہوتا ہے قرب و جوار میں عام طور پر پسند کیا جاتا ہے، دوتیاں بھی یہاں اچھی بنی جاتی تھیں مگر اب ان کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے، کھلونوں میں بچوں کے بجانے کی پی پیاں کثرت سے بنائی جاتی ہیں اور دور دور تک جاتی ہیں، اسی طرح بچوں کے لئے رنگین کاغذ کی عینکیں بڑے پیمانے پر بنتی ہیں اور ملک کے مختلف حصوں میں دور تک جاتی ہیں، لوہے کے آلات زراعت میں گنڈاسوں کے بھی کئی کارخانے ہیں، چاول بنانے کے بھی کئی کارخانے ہیں، ایک کارخانے میں چینی کے برتن تیار ہوتے ہیں، برف کے بھی کئی کارخانے ہیں۔

پرانے زمانے میں یہاں کی اعلیٰ درجے کی صیقل کی ہوئی تلواریں خاص شہرت رکھتی تھیں، قدیم ہندوستان کی بہت سی چیزیں دنیا میں مشہور تھیں ان میں مشرقِ وسطیٰ میں ہندوستان کی تلوار کو بڑی شہرت و اہمیت حاصل تھی، قدیم شعرائے عرب نے اپنے اشعار و قصائد میں ہندوستانی تلوار کے بڑے اوصاف بیان کیے ہیں، عرب ہندوستان کی بنی ہوئی تلوار کو مُہنّد کہتے تھے، عربی شاعری میں اسے بڑا مقام حاصل تھا، کعب بن زُہیرؓ نے اپنے قصیدہ بانت سُعاد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کہا ہے:-

مُہنّدٌ من سیوف اللہ مسلولٌ [1]

عرب سیّاحوں نے بھی ہندوستانی تلواروں کی بہت تعریف کی ہے انھوں نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے لوگ ایسی ترکیبوں سے واقف ہیں جن کے ذریعے سے وہ لوہے کو پگھلا کر فولاد میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ ہندوستان میں تلوار بنانے کے کارخانے بہت موجود ہیں، جن میں ہندوستانی کاریگر دوسری قوموں سے بہتر تلواریں بناتے ہیں، دھار کی تیزی اور استواری میں کوئی لوہا ہندوستان کے لوہے کا مقابلہ نہیں کر سکتا، عرب ہندوستانی کی تلوار کو مہند کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

فردوسی کے شاہنامہ میں ہے کہ جب سکندر نے ۳۳۱ سنہ قبل مسیح ایران پر حملہ کیا تو اس موقع پر ہندوستان سے تلواریں منگوائی گئی تھیں۔

---

[1] ارشاد شرح قصیدہ بانت سعاد ص ۱۵ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴ء

مگر اب عرصے سے یہ صنعت دیوبند سے ختم ہو چکی ہے۔ ان گھریلو اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے علاوہ چینی بنانے کا بھی ایک بڑا مل ہے۔

اتر پردیش کی ریاست ملک میں سب سے زیادہ شکر پیدا کرتی ہے یو، پی میں اس وقت شکر بنانے کی ۱۷ فیکٹریاں ہیں، ایک سرکاری اندازے کے مطابق ان فیکٹریوں کے لیے ۲۸ لاکھ ایکڑ زمین میں گنے کی کاشت ہوتی ہے۔

سہارنپور کا ضلع مذہب، تعلیم، صنعت اور زراعت کا ایک ایسا سنگم ہے جسے اتر پردیش میں خاص حیثیت حاصل ہے، یہاں شکر کے کئی مل ہیں، کاغذ اور گتہ بنانے کے کارخانے ہیں، کپڑے کا مل ہے اور سگریٹ بنانے کی فیکٹری "انڈیا ٹوبیکو کمپنی" کے نام سے ہے، بجلی کے بھاری سامان بنانے کا ایک بڑا کارخانہ ہردوار کے قریب قائم ہے یہ ضلع اب اتر پردیش کی صنعت میں صفِ اول میں شمار ہوتا ہے۔

دیوبند میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ۱۹۳۳ء / ۱۳۵۲ھ سے چینی بنانے کا ایک مل قائم ہے، اس مل کی بنی ہوئی چینی دوسرے ملوں کے مقابلے میں بہت عمدہ اور بلّور کے مانند سفید ہوتی ہے اور بیرونی ممالک کے لیے برآمد کی جاتی ہے۔ موسم سرما میں تقریباً ۶ مہینے اس میں شکر تیار ہوتی ہے روزانہ دو ہزار کوئنٹل شکر تیار ہونے کا اوسط ہے۔

تجارت میں یہاں گیہوں، چاول، کھانڈ اور گڑ کا کاروبار بڑے پیمانے پر ہوتا ہے، ضلع سہارنپور سے تقریباً ۲۵ لاکھ من بالس متی چاول

ہر سال برآمد ہوتا ہے جو ملک کے مختلف خطّوں میں جاتا ہے۔

عام تجارت کے علاوہ دینی کتابوں کی تجارت کو خاص اہمیت حاصل ہے، درسِ نظامی کی مطبوعات کا دیوبند، ہندو پاکستان میں سب سے بڑا مرکز ہے، ایشیائی ملکوں کے علاوہ یہاں کی کتابیں یورپ، امریکہ اور افریقی ممالک تک جاتی ہیں، ان کتابوں کو چھاپنے کے لئے ۷ پریسوں کی مشینیں مصروف رہتی ہیں۔

سنہ ۱۹۵۵ء سے حکومت کی جانب سے یہاں مختلف صنعتوں کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے، پروجیکٹ کا ایک خاص محکمہ صنعتی پیشوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور صنعت کاری کو فروغ دینے میں سرگرم عمل ہے ہندوستان کی اقتصادی ترقی اور بے روزگاری کو دور کرنے کے لئے یہ محکمہ اہم کردار ادا کر رہا ہے، اس محکمے میں گھریلو صنعتوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، لکڑی کے کھلونوں، ٹین اور پلاسٹک کے سامان اور چینی کے برتن اور زراعتی آلات کا کام سکھایا جاتا ہے، تربیتی پروگرام کے تحت مختلف صنعتوں کی چھ ماہ سے لے کر دو سال تک عملی تربیت دی جاتی ہے، کام سیکھنے والوں کو وظائف بھی دیئے جاتے ہیں، یہاں جو لوگ کام سیکھ چکے ہیں وہ مختلف مقامات پر ترقیاتی منصوبوں میں کام کر رہے ہیں، غرض کہ ملک کی معاشی ترقی میں اس محکمے کی کارکردگی کا نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔

پچھلے چند برسوں میں دیوبند کے پروجیکٹ کو صوبہ بھر میں امتیازی

حیثیت حاصل تھی، اس کے مختلف شعبے تھے، آج کل پروجیکٹ میں زراعت سے متعلق آلات اوراوزار تیار کرنے پر خاص توجہ دی جارہی ہے، زراعتی مشینوں کے پُرزے بھی بنائے جاتے ہیں، کنستر بنانے کا کام بھی سکھایا جاتا ہے، ایک شعبہ برتن سازی کا ہے جس میں چینی کے برتن اور چائے کے سیٹ تیار کئے جاتے ہیں۔

اخبارات ورسائل

پچھلے ساٹھ سالوں میں دیوبند سے متعدد ماہنامے اور ہفتہ وار اخبار نکل چکے ہیں۔ ماہناموں میں "القاسم" "الرشید" "قاسم العلوم" "خالد" اور "ہادی" قابلِ ذکر ہیں۔ "مہاجر" "الانصار" اور "استقلال" ہفتہ وار اخبار تھے۔ "القاسم" اور "الرشید" میں اکابر علماء کے مضامین شائع ہوتے تھے، ان کے مضمون نگاروں میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت میاں سید اصغر حسین، حضرت مولانا اعزاز علی، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا شائق احمد عثمانی اور دوسرے بہت سے ممتاز علماء اس کے لکھنے والوں میں شامل تھے۔

یہ دونوں رسالے اپنے علمی اور دینی مضامین کے لحاظ سے ملک کے ممتاز ترین رسائل میں شمار ہوتے تھے۔

اس وقت ماہنامہ "دارالعلوم" کے علاوہ ایک رسالہ "تجلی" نکل رہا ہے

یہ رسالے اپنے دینی مضامین کی عمدگی کے لحاظ سے دینی اور علمی حلقوں میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، ان کے ذریعے سے گراں قدر علمی اور دینی خدمات انجام پا رہی ہیں۔ "چراغِ حرم" اور "دیوبند ٹائمز" کے نام سے بھی دو پندرہ روزہ اخبار نکلتے ہیں۔

کتب خانے

ہندوستان میں دینی کتابوں کی طباعت اور اشاعت کا دیوبند ایک بڑا مرکز ہے، دینی کتابوں کے علاوہ درسِ نظامی کی کتابیں ان کی شرحیں اور حاشیے یہاں کے کتب خانے چھاپنے میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ ایک زمانے میں کتب خانہ قاسمی سے چھپنے والی کتابیں کتابت و طباعت، کاغذ کی عمدگی اور صحت کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی تھیں اہلِ علم دوسرے مطابع کی چھپی ہوئی کتابوں پر کتب خانۂ قاسمی کی مطبوعات کو ترجیح دیتے تھے۔

دیوبند کے اکثر کتب خانوں نے عربی اور فارسی کی بہت سی درسی اور غیر درسی کتابوں کے ترجمے کرا کر شائع کئے ہیں، بہت سی درسی کتابوں پر حاشیے لکھوا کر طبع کرائے ہیں اور متعدد کتابوں کی شرحیں لکھوائی ہیں، ان کتب خانوں سے جو درسی اور غیر درسی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ملک کی تقسیم سے قبل کتب خانہ دارالاشاعت سے بھی بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں، طباعت و اشاعت کا سلسلہ

برابر جاری ہے، کتابوں کی اشاعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دیوبند میں لیتھو پریس کی چھ سات مشینیں کتابوں کے چھاپنے میں مصروف ہیں، یہ کتب خانے قرآن شریف بھی بڑی تعداد میں چھاپتے ہیں، قرآن شریف کے علاوہ سپارے اور قاعدے بھی ان کے یہاں سے چھپتے رہتے ہیں یہاں کی کتابیں ہندوستان و پاکستان کے علاوہ برما، نیپال، افغانستان جنوبی افریقہ، انگلستان، امریکہ اور دوسرے بہت سے ملکوں تک پہنچتی اور ذوق و شوق سے ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں، دیوبند کا یہ ایک بڑا تجارتی کاروبار ہے، اسی کے ساتھ اس ذریعے سے دینی علوم کی کتابوں کی نشر و اشاعت کی بھی زبردست خدمت انجام پا رہی ہے، اور چونکہ یہاں سے شائع ہونے والی کتابیں زیادہ تر اردو زبان میں ہوتی ہیں، اس طرح سے اردو زبان کا دائرہ بھی وسیع ہو رہا ہے، اور ایشیا اور افریقہ اور یورپی ممالک کے کروڑوں مسلمان یہاں کی مطبوعہ کتابوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔

یہاں کے بعض کتب خانوں نے ضخیم کتابوں کی طبع و اشاعت کا ایک خاص طریقہ رائج کیا ہے، وہ یہ ہے کہ کتاب کو متعدد حصّوں پر تقسیم کر دیا جاتا ہے، جس کو ان کتب خانوں کی اصطلاح میں "جز" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایک "جز" بالعموم بڑے سائز کے ۸۰ صفحات سے لے کر ۹۶ صفحات تک ہوتا ہے، ہر دوسرے مہینے اس کتاب کا ایک ایک "جز" شائع ہوتا رہتا ہے۔ ایک "جز" کی قیمت عام طور پر ڈھائی تین روپے ہوتی ہے، اس طرح سے وہ گراں قیمت کتابیں جن کی خریداری

عام لوگوں کے لئے مشکل ہوتی ہے وہ اس طریقۂ اشاعت سے ہر دوسرے مہینے صرف ڈھائی تین روپے خرچ کرنے پر شائقین کے ہاتھوں تک پہنچ جاتی ہیں، اور خریدار قیمت کی گراں باری سے بچ جاتا ہے، اس طریقِ کار نے ضخیم کتابوں کی افادیت کو عام کرنے میں بڑا کام کیا ہے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن، مولانا عبدالحق حقانیؒ کی تفسیر حقانی، حافظ ابن کثیرؒ کی تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ، تفسیر جلالین کا ترجمہ و شرح کمالین درس قرآن کا سلسلۂ تفسیر، تفسیر ہدایت القرآن، حدیث میں صحیح بخاری کا اردو ترجمہ ایضاح البخاری، تفہیم المسلم، مشکوٰۃ المصابیح کی اردو شرح مظاہر حق اور معارف المشکوٰۃ، فقہ میں ہدایہ، فتاویٰ عالم گیری وغیرہ کے اردو ترجمے، سیرتِ نبوی میں سیرتِ حلبیہ کا اردو ترجمہ وغیرہ کتابیں "جز" وار ہو کر طبع ہو رہی ہیں۔ مذکورہ بالا کتابوں میں اکثر کتابوں کے پورے "جز" شائع ہو چکے ہیں، سالم کمپنی سے تفسیر روح المعانی عربی کی ایک ایک جلد اسی طرح چھپ رہی ہے۔

یہ کتب خانے جو دینی، علمی اور عام کتابوں کی طباعت و اشاعت کی گراں قدر خدمت انجام دے رہے ہیں، ان کی تعداد ۸۰ کے قریب ہے چند کتب خانوں کے نام یہ ہیں :-

کتب خانہ اعزازیہ[1]۔ کتب خانہ رحیمیہ[2]، کتب خانہ امدادیہ، کتب خانہ

---

[1] کتب خانہ اعزازیہ کے مالک مولانا سید احمد صاحب دارالعلوم کے فاضل اور بہت اچھے مقرر ہیں، اس کتب خانے نے بعض نادر کتابیں بھی شائع کی ہیں [2] کتب خانہ رحیمیہ ہند و پاکستان میں واحد کتب خانہ ہے جس نے درس نظامی کی چھوٹی بڑی تقریباً سب کتابیں شائع کی ہیں۔

راشد کمپنی[۱]، مکتبہ دینیہ، مکتبہ تجلی، مکتبہ تاج المعارف، کتب خانہ قاسمی مکتبہ فیض القرآن، ادارہ اسلامیات[۲]، کتب خانہ محمودیہ، کتب خانہ فخریہ کتب خانہ نعمانیہ، ملک پبلیکیشنز، ادارہ اشرف المواعظ، نشر واشاعت مکتبہ حجاز، مکتبہ آفتاب ہدایت، کتب خانہ سعیدیہ، جمہوری بکڈپو، کتب خانہ نعیمیہ، کتب خانہ مصطفائی سالم کمپنی، اشاعت منزل[۳]، مکتبہ قاسم المعارف مدنی کتب خانہ، کتب خانہ ہاشمیہ، رحیم بکڈپو، علمی مرکز، مکتبہ دار المعارف[۴] احمد کمپنی، مکتبہ رحمت، مکتبہ نور وغیرہ وغیرہ

---

[۱] یہ کتب خانہ مولانا راشد حسن عثمانی (وفات ۱۳۸۹ھ / ۱۹۷۰ء) کی یادگار ہے، قرآن شریف کی اشاعت کا دیوبند میں سب سے بڑا ادارہ ہے۔

[۲] اس ادارہ سے مولوی عبداللہ جاوید، مظاہر حق (جدید) مصنفہ مولانا قطب الدینؒ کو آسان اور سہل زبان میں بالاقساط شائع کر رہے ہیں۔

[۳] اشاعت منزل سے مولانا عبدالرؤف عالی مشکوٰۃ المصابیح کی شرح عالمانہ انداز میں پیش کر رہے ہیں، یہ دونوں ادارے علم حدیث کی قابلِ قدر خدمت میں مصروف ہیں۔

[۴] اس مکتبہ سے صحیح مسلم کا اردو ترجمہ مختصر شرح کے ساتھ بالاقساط شائع ہو رہا ہے، اگر یہ ترجمہ مکمل ہو گیا تو اردو میں حدیث کی ایک اہم خدمت ہو گی، شارح مولانا ہلال عثمانی ابھی نوجوان ہیں، علمی اور دینی کاموں سے شغف ہے کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

پریس

ہندوستان میں پریس کی ابتدا اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر سے ہوئی، سب سے پہلے بنگال کے شہر سیرام پور میں ڈینش مشن کے عیسائی مبلغین نے ایک مطبع قائم کیا جس میں بائیبل کا ترجمہ ٹائپ میں چھاپا گیا۔

اس کے کچھ عرصے کے بعد ۱۸۰۰ء ۱۲۱۵ھ میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا پریس قائم ہوا، یہ نستعلیق ٹائپ کا پریس تھا، جس میں فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف وترجمے کی کتابیں چھاپی جاتی تھیں، فرانسیسی مستشرق گارسان دتاسی نے لکھا ہے کہ ممالک مغربی وشمالی میں سب سے پہلا لیتھو گراف مطبع ۱۸۳۷ء ۱۲۵۳ھ میں دہلی میں جاری ہوا۔ ۱۸۵۲ء ۱۲۶۹ھ تک ممالک مغربی وشمالی کے شہروں میں مطابع کی تعداد ۳۴ تک پہنچ گئی تھی [1]۔

دیوبند میں ۱۹۱۱ء ۱۳۲۹ھ میں مطبع قاسمی کے نام سے ایک پریس علمائے دیوبند کی نگرانی میں قائم ہوا، دیوبند میں یہ پہلا پریس اور تجارتی کتب خانہ تھا، مطبع قاسمی سے قرآن مجید اور عام کتابوں کے علاوہ درس نظامی کی کئی کتابیں علمائے دیوبند کے حواشی کے ساتھ شائع ہوئیں کتابت وطباعت اور صحت کے لحاظ سے یہ مطبع ایک امتیازی حیثیت رکھتا تھا، اس کی چھپی ہوئی کتابیں، علمی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھی

---

[1] ترجمہ خطبات گارساں دتاسی ص ۱۷۸ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۵ء۔

جاتی تھیں۔ اس مطبع سے "القاسم" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ بھی نکلتا تھا جو اپنے علمی اور دینی مضامین کے لحاظ سے ملک کے بلند ترین رسائل میں شمار ہوتا تھا عرصے سے یہ مطبع اور "القاسم" دونوں بند ہو چکے ہیں۔

گزشتہ چوتھائی صدی میں یہاں متعدد پریس جاری ہوئے، اولاً شرون پریس قائم ہوا جس میں انگریزی اور ہندی کی طباعت کے ساتھ بلاک بھی چھپتے تھے، ۱۹۶۲ء میں شرون پریس کے بجائے بابو شام لال نے پردیپ پریس جاری کیا، اس پریس میں تین مشینیں ٹائپ اور بلاکوں کی طباعت کرتی ہیں لیتھو کی طباعت کے لئے اولاً مولوی شوکت علی خاں صاحب نے نیشنل پریس قائم کیا، اس پریس کے ساتھ مکتبہ نظامی کے نام سے ایک کتب خانے کا قیام بھی عمل میں آیا تھا، جس میں درسِ نظامی کی کتابوں کو نہایت اہتمام اور کتابت کے جدید طریقوں کے مطابق چھاپا جاتا تھا مگر جلد ہی یہ مکتبہ بند ہو گیا۔

پھر ایک دوسرے مولوی شوکت علی صاحب نے محمدی پریس جاری کیا، اس کے بعد صاحبزادہ محمد مستحسن صاحب فاروقی نے وسیم پریس لگایا۔ بعد ازاں محبوب پریس، آزاد پریس اور اسلامی پریس یکے بعد دیگرے جاری ہوئے۔ ٹائپ کا ایک اور پریس پرگتی کے نام سے ہے۔

لائبریریاں

دیوبند میں کئی لائبریریاں ہیں۔ جن میں دارالعلوم کا عظیم الشان کتب خانہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، جس میں مختلف علوم وفنون کی عربی، فارسی، اردو اور دوسری کئی زبانوں کی تقریباً ایک لاکھ مطبوعات ومخطوطات کا عظیم ذخیرہ موجود ہے، اس کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔ شہر میں جو لائبریریاں ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے :-

انوریہ لائبریری

یہ لائبریری ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کی یادگار کے طور پر قائم کی گئی تھی اس میں کئی ہزار کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے، جس میں بعض نادر اور کم یاب کتابوں کے نسخے بھی موجود ہیں، اردو زبان کی کتابیں زیادہ تعداد میں ہیں۔

پبلک لائبریری

یہ بھی ایک اچھی لائبریری ہے، اس میں تقریباً ۶ ہزار کتابیں موجود ہیں، ہندی اور انگریزی زبان کی کتابوں کی خاصی تعداد ہے، اردو کی بھی کچھ کتابیں ہیں، زیادہ تعداد ناولوں کی ہے۔ لائبریری کی اپنی شاندار اور کشادہ دو منزلہ عمارت ہے، عام عطیات کے علاوہ لائبریری کو حکومت سے بھی امداد ملتی ہے۔

ثمرۃ التربیت لائبریری

دارالعلوم کے طلباء کی بعض علمی وادبی انجمنوں نے اپنے طور پر شہر میں کئی

لائبریریاں قائم کی ہوئی ہیں، جن میں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے طلبائے دارالعلوم کی لائبریریوں میں انجمن ثمرۃ التربیت کی لائبریری اپنی کتابوں کی اہمیت کے لحاظ سے خاص طور پر ممتاز ہے، اس لائبریری کو افریقی اور سورتی طلبار نے اپنے ذوق کی شیرابی کے لئے ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء میں قائم کیا تھا، اس وقت لائبریری میں تقریباً ۸۰۰ مفید اور نایاب کتابیں موجود ہیں، تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، تاریخ، جغرافیہ، تصوف، کلام، مناظرہ اور مواعظ کی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ اس میں موجود ہے، تاریخ کی بعض عمدہ کتابیں لائبریری کی زینت ہیں، کتابوں کے علاوہ بعض علمی ماہناموں کے فائل بھی محفوظ رکھے گئے ہیں، کتابوں کے انتخاب اور جمع و ترتیب میں بڑے سلیقے کا ثبوت دیا گیا ہے۔

یہ لائبریری راقم سطور کے صدیق محترم مولانا عبدالحق اسمٰعیل عمرجی[1] کی مخلصانہ جد وجہد کا نتیجہ ہے۔ طلبائے دارالعلوم کی موجودہ لائبریریوں میں یہ سب سے پہلی لائبریری ہے، دوسری اور لائبریریاں اسی کی تقلید میں قائم ہوئی ہیں۔

---

[1] مولانا عبدالحق اسمٰعیل عمرجی اپنے علم و فضل اور کردار و عمل کے لحاظ سے ایک خاص امتیازی شخصیت کے مالک ہیں، دنیوی دولت کے ساتھ علم و فضل، زہد و تقویٰ اور خدمتِ دین کے بے پناہ جذبے سے بھی اللہ تعالیٰ نے اُن کو سرفراز فرمایا ہے، والد صاحب علیہ الرحمہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت تھے، انھوں نے منت مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے فرزند عطا فرمایا تو اسے دینی علوم کی تعلیم دلوائیں گے (باقی ص ۲۶۱ پر)

(بقیہ صـ۲۶۰) مولانا عبدالحق صاحب ۲۷ ستمبر ۱۹۲۷ء / ۱۳۴۶ھ کو جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن میں پیدا ہوئے، والد صاحبؒ نے ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۴۷ء / ۱۳۶۶ھ میں دارالعلوم میں حصولِ علم کے لئے بھیجا، یہاں انھوں نے دارالعلوم کے ممتاز اساتذہ سے دینی علوم کی تکمیل کی حدیث میں صحیح بخاری اور جامع ترمذی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے پڑھیں، شعبان ۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۹ء میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔

زمانۂ طالب علمی میں ہی مولانا موصوف کا علمی ذوق اور خدمت دین کا جذبہ نمایاں ہونے لگا تھا، اپنے ہم عصر طلبا میں ہمیشہ تعلیمی لحاظ سے ممتاز اور نمایاں حیثیت کے مالک رہے، دارالعلوم میں افریقی اور سورتی طلبا، کی انجمن ثمرۃ التربیت اور لائبریری نے ان کے زمانۂ صدارت میں بڑی ترقی کی، ان کے علمی ذوق کو دیکھ کر یہ شعر ان پر صادق آتا تھا

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

اپنے غایت علمی ذوق کے باعث مولانا موصوف نے انجمن ثمرۃ التربیت کی صدارت کے زمانے میں انجمن کی جانب سے کتابوں کی طبع واشاعت کا ایک مفید پروگرام بنایا تھا، جس کا آغاز اس دور کے نامور عالم مولانا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کی کتاب "ہزار سال پہلے" سے ہوا، افسوس ہے کہ ان کے وطن چلے جانے کے بعد انجمن ثمرۃ التربیت کی جانب سے یہ مفید علمی کام جاری نہ رہ سکا۔

محترم مولانا عبدالحق صاحب عمر جی کا یہی علمی ذوق ابتداءً راقم سطور سے تعلق کا ذریعہ بنا اور پھر روابط میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا، صورت یہ ہوئی کہ (باقی صـ۲۶۲ پر)

(بقیہ صـ۲۶۱) مولانا موصوف نے ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء میں "ہزار سال پہلے" کے شائع کرنے کا ارادہ کیا، مولانا گیلانیؒ کا یہ ایک طویل سلسلۂ مضامین تھا، جس میں نویں صدی عیسوی میں ہند وچین اور دوسرے ممالک کے تہذیبی وتمدنی حالات بیان کئے گئے تھے، یہ مضامین منتشر حالت میں تھے، کتابی شکل دینے کے لئے ضروری تھا کہ تصنیفی ترتیب وتبویب کے ساتھ ان کو مرتب کیا جائے، اس کام کے لئے صدیق محترم مولانا سید ازہر شاہ صاحب مدیر رسالہ دارالعلوم دیوبند کے مشورے سے قرعۂ فال راقم سطور کے نام نکلا، مولانا عبدالحق صاحب نے، "ہزار سال پہلے" کو بڑے اہتمام وانتظام کے ساتھ شائع کیا تھا۔

جنوبی افریقہ کے صوبہ ناٹال میں جمعیۃ العلماء آپ ہی کی کوشش سے قائم ہوئی، اور آپ ایک عرصے تک اس کی مسندِ صدارت پر فائز رہے وہاں کے بہت سے اداروں کے ٹرسٹی ہیں۔

اسلام کی دعوت وتبلیغ اور مسلمانوں کی صلاح وفلاح کے بے پناہ جذبے سے ان کا دلِ دردمند معمور ہے، اپنے وطن جنوبی افریقہ میں عام مسلمانوں کی اصلاحِ اعمال وعقائد کے علاوہ مسلمان نوجوانوں کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کرانے کیلئے عربی اور اردو زبان سے دینی کتابوں کے انگریزی زبان میں ترجمے کرا کر شائع کر رہے ہیں، مولانا موصوف جنوبی افریقہ کے دولت مند طبقے کو توجہ دلا کر اس پر آمادہ کرتے رہتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو دینی علوم کی تعلیم دلائیں، چنانچہ مولانا عمر جی جنوبی افریقہ سے ہر سال طلبار کو دارالعلوم دیوبند میں پڑھنے کے لئے بھجواتے ہیں، خدائے تعالیٰ ان کی دینی خدمات کو قبول فرما کر نتیجہ خیز بنائے اور انھیں فلاحِ دارین سے سرفراز فرمائے۔!

مدنی دارالمطالعہ

طلبائے دارالعلوم کی ایک دوسری لائبریری مدنی دارالمطالعہ کے نام سے ہے، یہ لائبریری یو، پی کے طلبار نے ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء میں قائم کی ہے، اس میں کتابوں کی تعداد ۱۷۰۰ کے قریب ہے زیادہ تر کتابیں اردو زبان کی ہیں، موضوع کے لحاظ سے تاریخ کا بہت اچھا ذخیرہ مدنی دارالمطالعہ میں جمع کر دیا گیا ہے۔

سجاد لائبریری

طلبار ہی کی ایک لائبریری سجاد لائبریری کے نام سے موسوم ہے، اسے ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۵ء میں صوبہ بہار کے طلبار نے قائم کیا تھا۔ تقریباً ۶۰۰ کتابیں اس لائبریری میں موجود ہیں، جو مختلف مذاہب پر طلبا کی تقریری مشق اور مناظرے کیلئے بہت کارآمد ہیں، فن مناظرے پر اس لائبریری میں اچھا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔

دعوت الفکر لائبریری

طلبار کی ایک اور لائبریری انجمن دعوت الفکر کے زیرِ انتظام قائم ہے، ابھی چند سال ہوئے اس لائبریری کا قیام عمل میں آیا ہے ۸۰۰ کے قریب اس میں کتابیں ہیں، تاریخ پر کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔

مطالعے سے شغف رکھنے والے اہلِ علم خصوصاً طلبائے دارالعلوم کے علمی و ادبی اور سیاسی ذوق کے نشو و نما میں ان لائبریریوں کا بڑا حصہ ہے، ان کے ذریعے سے طلبار میں تحریر و تقریر کا بڑا اچھا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے

☆ ☆ ☆

تعلیمی ادارے

دیوبند کے قدیم تاریخی ذرائع مفقود ہونے کے سبب سے افسوس ہے کہ برطانوی عہد سے قبل کے مدارس کا کوئی سراغ نہیں ملتا، صرف عہد اورنگ زیب کے ایک فرمان سے جس کا ذکر اپنے موقع پر گذر چکا ہے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ سرائے پیرزادگان کی خانقاہ میں مدرسہ بھی تھا جس میں طلبا کی اتنی کثرت تھی کہ اس زمانے کے رواج کے مطابق دہلی کی مرکزی حکومت کو مدرسہ کے اخراجات اور طلبا کے خورد و نوش کے مصارف کے لئے ایک بڑی جاگیر دینی پڑی تھی۔ فرمان میں مذکور ہے کہ :-

"شیخ وجیہہ الدین جو تقویٰ اور پرہیزگاری سے آراستہ ہیں اپنے والد کی خانقاہ میں طالبانِ علم و طریقت کی تعلیم و تربیت فرما رہے ہیں"

اس زمانے کی علمی تاریخ کو سمجھنے کے لئے اس بات کا پیش نظر رہنا نہایت ضروری ہے جس کے بغیر تاریخ کا کوئی طالب علم حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا، وہ یہ ہے کہ اُس دور میں علم آج کل کی طرح مدارس کے احاطے اور دیواروں کی قید و بند میں مقیّد اور محدود نہ تھا، مدارس کے لئے مستقل عمارتیں بنانے کے بجائے اُس زمانے میں زیادہ تر یہ کام مسجدوں اور خانقاہوں کے حجروں، علما کے مکانات اور امرا کی ڈیوڑھیوں سے

لیا جاتا تھا، تعلیم مفت ہوتی تھی، غریب طلبا، کے کھانے، کپڑے اور لکھنے پڑھنے کے لئے کتابیں وغیرہ بغیر کسی معاوضے کے مہیّا کی جاتی تھیں علماء کے علاوہ امرا بھی عموماً صاحبِ علم و فضل ہوتے تھے، اپنے کاموں کے علاوہ درس و تدریس بھی ان کی زندگی کا عزیز ترین مشغلہ ہوتا تھا۔

منتخب التواریخ میں بدایونی نے لکھا ہے کہ "میر فتح اللہ شیرازی جو اکبر کے عہد میں وزارت کے منصب پر فائز تھا وقتاً فوقتاً طلبا، کو درس دیتا رہتا تھا"[1]

عربی صرف کی مشہور کتاب "علم الصیغہ" اور "تاریخ حبیب آلہ" کے مصنف مفتی عنایت احمد (وفات ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء) منصف کے عہدے پر فائز تھے، عدالت میں بھی شاگردوں کا مجمع ساتھ رکھتے تھے، دورانِ مقدمات میں جہاں ذرا فرصت ملتی درس شروع ہو جاتا تھا[2]

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ساری عمر مطابع میں تصحیح کتب کا کام کرتے رہے مگر اسی کے ساتھ ہمیشہ درس و تدریس کی مجلسیں بھی گرم رہتی تھیں[3]، اب سے کچھ عرصہ پہلے تک ایسے علماء موجود تھے جنھوں نے گنگوہ کی خانقاہِ قدوسی میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے علم حدیث کی تحصیل کی ہے۔

---

[1] منتخب التواریخ بدایونی ذکر میر فتح اللہ شیرازی

[2] استاذ العلماء ص ۵ مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ

[3] سوانح قاسمی ص ۲۰ و ۲۱

یہ زمانۂ ماضی کی چند مثالیں ہیں، خود ہمارے زمانے میں چھوٹے بچّوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے اس طرز کے بے شمار مکاتب کم و بیش ہر جگہ پائے جاتے ہیں، لکھے پڑھے مسلمانوں کی آبادی کا شاید ہی کوئی محلہ ایسا ہوگا جس کے گھروں میں بچّوں کے لئے قرآن شریف کے مکتب موجود نہ ہوں، ہر بستی میں ایسی مسجدیں ضرور ملیں گی جن میں چھوٹے بچّے بچّیوں کو قرآن شریف پڑھانے کا انتظام موجود ہوگا۔ ان مکاتب میں قدیم روش کے مطابق آج تک مفت تعلیم ہوتی ہے، مسجدوں میں اکثر و بیشتر ایسی عمارتیں بنائی جاتی تھیں جو طلباء کے درس و تدریس اور قیام کے کام میں آسکیں، چنانچہ اس زمانے کی اکثر مساجد کے صحنوں کے اطراف میں حجروں اور دالانوں کا وسیع سلسلہ نظر آتا ہے، دہلی میں مسجد فتح پوری جو شاہ جہاں کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی اسی طرز کی قدیم یادگار ہے، مسجد فتح پوری کے وسیع صحن کے گرد جو حجرے اور دالان بنے ہوئے ہیں وہ آج بھی اس مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔

جون پور کی مسجد اٹالہ کے صحن کے اطراف میں درس و تدریس کے لئے دالان بنائے گئے تھے۔ دیوبند کی جامع مسجد میں بھی اسی طرز پر حجرے اور دالان بنے ہوئے ہیں۔ جب تک دارالعلوم کی موجودہ عمارت تیّار نہیں ہوئی، مسجد ہی سے مدرسہ کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

غرض کہ اس دور میں مسجدوں سے مدرسوں کا کام لینے کا عام رواج تھا۔

عموماً ہمارے بڑے بڑے مدرسوں کا آغاز مسجدوں ہی سے ہوا ہے، جامع ازہر، جامع قزدین[1] اور جامع زیتونیہ اس کی مثالیں ہیں، یہ صرف مسجدیں ہی نہ تھیں بلکہ اپنے وقت کی عظیم درس گاہیں بھی تھیں۔ جن میں تعلیم کے علاوہ قیام اور خورد و نوش کی تمام سہولتیں طالبانِ علم کو حاصل ہوتی تھیں۔

غرض کہ اس طرح برطانوی عہد سے پہلے ملک میں مدارس کا جال بچھا ہوا تھا، اور گھر گھر علم کا چرچا رہتا تھا، مسجدیں اور خانقاہیں اہلِ علم کی آوازوں سے ہر وقت گونجتی رہتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ مدارس کے لئے مستقل عمارتیں بنانے کا رواج اس زمانے میں بہت کم تھا۔

آخری زمانے میں دیوبند میں قدیم طرز کے صرف تین مدرسوں کا پتہ چلتا ہے، ایک مدرسہ مولوی مہتاب علی کا تھا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی عربی تعلیم کا آغاز اسی مکتب سے ہوا تھا، دوسرا میاں جی

---

[1] جامع قزدین، مراکش کے قدیم تاریخی شہر فاس میں واقع ہے، یہ ایک عظیم الشان مسجد ہے، جامعۂ قزوین، جامعۂ ازہر سے بھی زیادہ پرانی ہے، جامعۂ ازہر کی شہرت قرونِ وسطیٰ میں بڑھی لیکن جامعۂ قزدین شروع ہی سے اپنے علمی کارناموں کے باعث مشہور رہے، ابھی پچھلے دنوں مراکش کے بادشاہ حسن الثانی نے اس کے گیارہ سو سال پورے ہونے کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا تھا۔

امام علی کا تھا جو امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے، اور تیسرے مدرسہ میں جو بجال سنگھ مصرّر تھے دیوبند کے مکان پر جاری تھا دیوبند کے مشہور بزرگ میاں جی مُنّے شاہ صاحبؒ پڑھاتے تھے، ان مدرسوں میں ہندو اور مسلمان بچّے ساتھ ساتھ پڑھتے تھے، نصابِ تعلیم میں فارسی زبان اور حساب داخل تھا، اگرچہ ان مدارس کی تعلیم آج کل کی طرح باضابطہ نہ تھی، مگر استادوں کا فیضانِ نظر شاگردوں میں غیر معمولی صلاحیت، علمی پختگی اور اخلاقی درستگی پیدا کر دیتا تھا، جن لوگوں کو ان مدرسوں کے پڑھے ہوئے اشخاص سے واسطہ پڑا ہے وہ اس کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

تعلیم انسان کی ذہنی اور دماغی صلاحیتوں کی تہذیب و ترقی اور اس کے اعمال و فضائل کی اصلاح میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے مسلمانوں نے کبھی تعلیم کو نظر انداز نہیں کیا۔ مسجدوں میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے، مسجد کا امام مدرس کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت مسلمانوں کے نقشِ قدم پر قائم ہوئی تھی، اس کی حکومت نے سلطنتِ مغلیہ کی جگہ پائی تھی، اٹھارویں صدی کے اواخر میں کمپنی کی حکومت نے کلکتہ اور دہلی میں مشرقی علوم کے ادارے قائم کئے، عام شہروں اور قصبات میں مڈل اسکول جاری کئے گئے، ان اداروں میں جو نصاب جاری کیا گیا اس کا مقصد کمپنی کی حکومت کے لئے کارکن پیدا کرنا تھا۔

تحصیلی اسکول

دیوبند کے موجودہ مدارس میں سب سے قدیم تحصیلی اسکول ہے، یہ اسکول سنہ ۱۸۵۰ء، میں ۱۲۶۶ھ میں جاری کیا گیا، ابتدا میں اسکول میں طلبار کی تعداد صرف ۴۰ تھی[1]، اسکول کی عمارت تحصیل کے قریب واقع ہے، عام تحصیلی اسکولوں کی طرح اسکول کے مصارف کا تعلق ڈسٹرکٹ بورڈ سے ہے۔

تحصیلی اسکول کے علاوہ میونسپل بورڈ کی جانب سے شہر کے مختلف محلوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ۱۳ پرائمری اسکول ہیں، جن میں ۸ اسکول لازمی تعلیم کے تحت ہیں، ان کے مصارف کا ۳/۴ حصّہ حکومت دیتی ہے اور ۱/۴ حصہ میونسپل بورڈ ادا کرتا ہے۔

۲ اسکول لڑکوں اور ۳ لڑکیوں کے لئے تیسرے پنج سالہ پلان کے تحت جاری کئے گئے ہیں، ان کے جملہ مصارف حکومت ادا کرتی ہے۔

ان کے علاوہ ۴ پرائیویٹ پرائمری اسکول اور ہیں جن کو میونسپل بورڈ امداد دیتا ہے، ان میں جین گرل اسکول سب سے زیادہ نمایاں ہے اس میں انٹرینس تک تعلیم ہوتی ہے، بقیہ ۳ اسکول پرائمری تک ہیں ان میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم ہوتی ہے۔ ان کے نام یہ ہیں :-

---

[1] تاریخ سہارنپور ص ۱۸۷

۱۔ خبتا مون ٹیسری اسکول
۲۔ شِب شیشو مندر اسکول
۳۔ رام کشن اسکول۔

یہ تینوں اسکول آبادی سے باہر ریلوے روڈ پر واقع ہیں۔ تحصیلی اور پرائمری اسکولوں میں برطانوی عہد میں اردو اور ہندی دونوں زبانیں پڑھائی جاتی تھیں مگر اب کچھ مدت سے چونکہ سرکاری اور دفتری زبان اردو کے بجائے ہندی قرار پا چکی ہے اس لئے اردو کو نصابِ تعلیم سے خارج کر دیا گیا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے دینی مکاتب مختلف محلوں میں جاری ہیں۔ ایک نرسری سینٹر بھی چھوٹے بچّوں کے لئے قائم ہے۔

انٹر کالج مذکورہ بالا تحصیلی اور پرائمری اسکولوں کے علاوہ دیوبند میں انگریزی کا ایک انٹر کالج بھی ہے، یہ کالج بابو ہرپت رائے آنجہانی کی علم دوستی کی یادگار ہے اور اپنے بانی کے نام پر ہرپت رائے انٹر کالج کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ۱۹۰۶ء سنہ ۱۳۲۳ھ میں قائم ہوا تھا، اور ابتدا میں صرف آٹھویں کلاس تک اس میں تعلیم ہوتی تھی پھر رفتہ رفتہ ترقی کر کے میٹرک تک پہنچ گیا اور اب انٹرمیڈیٹ تک ترقی کر چکا ہے۔

کالج کی عمارت شہر کے شمال مشرق میں آبادی سے باہر واقع ہے اسکول کی عمارت ہندو مسلمانوں کے مشترکہ سرمایے سے تعمیر ہوئی ہے۔

اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول

ہرپت رائے انٹر کالج کے علاوہ بچّوں کی انگریزی تعلیم کا کوئی مناسب انتظام نہ تھا، شیخ ضیاء الحق مرحوم (سنہ ۱۳۷۳ھ) اور سید محمد محتشم شہید (سنہ ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۴ء) کی متفقہ کوششوں سے سنہ ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء میں مسلمان بچوں کی تعلیمی سہولت کے پیش نظر یہ اسکول جاری کیا گیا، ابتداءً یہ آٹھویں کلاس تک تھا، مگر اب اپنے تعلیمی نتائج کی عمدگی کے باعث چند ہی سالوں میں انٹرلیس تک پہنچ گیا ہے، اس اسکول کا ہر قدم ترقی کی جانب گامزن ہے۔

گورنمنٹ گرل ہائی اسکول

یہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے دیوبند میں پہلا گرل ہائی اسکول ہے اس کے مصارف گورنمنٹ اٹھاتی ہے۔

سنسکرت مہاودّیالیہ

سنسکرت کا یہ ودّیالیہ دیوی کنڈ پر واقع ہے، اس کو سنہ ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۵ء میں پریماتند سرسوتی اور بیاس امی چند نے ہندی اور سنسکرت کی تعلیم اور ہندو دھرم کی تبلیغ کے لئے قائم کیا تھا، اس میں مقامی طلبا کے علاوہ بیرونی طلبار بھی زیر تعلیم رہتے ہیں۔

غریب طلبار کو کھانا بھی ملتا ہے، ڈھائی تین سو من اناج سالانہ اُن طلبار کے کھانے پر خرچ ہوتا ہے جو ودّیالیہ سے کھانا کھاتے ہیں سالانہ مصارف کا تخمینہ تین ہزار روپے ہے، آمدنی کا ذریعہ عام چندہ ہے

طلبا، کی تعداد سو کے لگ بھگ ہے [1]

مدرسہ اصغریہ

یہ ایک پرانا مدرسہ ہے، دیوبند کے مشہور بزرگ حضرت میاں جی منّے شاہؒ اس کے سب سے پہلے معلّم تھے، قرآن مجید کے علاوہ اس میں فارسی اور حساب بھی پڑھایا جاتا تھا، جو اس زمانے کی متداول تعلیم تھی، اس مدرسے کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ اس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کے بچے بھی تعلیم حاصل کرتے تھے جو اس زمانے کا عام رواج تھا، میاں جی کے حلقۂ درس سے بڑے بڑے باکمال فارسی داں پیدا ہوئے، میاں جی کی نسبت یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ ان کے شاگردوں کو کبھی معاشی تنگی سے پریشان نہیں ہونا پڑا، جس نے ان کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ کیا وہ بر سرِ روزگار ضرور ہو گیا، حضرت میاں جیؒ کے بعض ہندو شاگردوں کو راقم سطور نے دیکھا ہے اور ان لوگوں کو بھی مسلمان شاگردوں کی طرح اپنے استاد کی تعریف میں رطب اللسان اور ان کے فیضانِ نظر کا مدّاح پایا ہے، کچھ مدت تک حضرت میاں جی کا یہ مکتب دیوبند کے ایک ہندو رئیس بجال سنگھ مصرّ کی سرپرستی میں اُن کے مکان پر بھی رہا ہے [2]

---

[1] یہ حالات "ہندو سنسکرت کا ایک کیندر" نامی پمفلٹ سے ماخوذ ہیں۔

[2] سوانح حیات حضرت مولانا میاں اصغر حسینؒ ص ۵ مطبوعہ علیمی پریس دہلی ۱۳۶۵ھ

سنہ ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۴ء میں حضرت میاں جیؒ کی وفات کے بعد اُن کے بھانجے شاہ محمد حسنؒ اور ان کے بعد حضرت مولانا میاں اصغر حسینؒ نے اس مکتب کی دیرینہ روایات کو برقرار رکھا، اب مدرسہ اصغریہ میں قرآن شریف اور فارسی کے علاوہ عربی کا چار رسالہ نصاب بھی پڑھایا جاتا ہے، مدرسہ اصغریہ میں بیرونی طلباء کے لئے خورد و نوش اور قیام کا بھی انتظام ہے۔

جامعۂ دینیات اردو

انیسویں صدی کے وسط سے عام مسلمانوں خصوصاً لڑکوں اور لڑکیوں کی دینی تعلیم کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کئے ہوئے ہے مسلم معاشرے میں دینیات سے ناواقفیت نے اس مسئلہ کو زیادہ اہم بنا دیا ہے، ایسے حالات میں ایک ایسے تعلیمی نظام کی ضرورت ہے جو زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر ہو اور جس کے ذریعے سے اسکولوں اور کالجوں کے مسلمان طلباء اور طالبات مروّجہ تعلیم کے ساتھ ساتھ بقدرِ ضرورت دینی معلومات حاصل کر سکیں، اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے "جامعۂ دینیات اردو" کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، چنانچہ جامعۂ دینیات اردو کے ذریعے سے مسلمان طلباء و طالبات کے علاوہ عام مسلمان مرد و عورت بھی اپنے اپنے مقام پر رہتے ہوئے بسہولت ضرورت کے مطابق دینی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

جامعۂ دینیات کا طریقِ تعلیم ایسی عمومیت کا حامل ہے جو بچّوں اور بڑوں سب کو اپنے دائرے میں لئے ہوئے ہے۔

جامعۂ دینیات کا نصاب جو چار امتحانوں پر مشتمل ہے، اردو زبان میں ہے جس میں تفسیر وحدیث، فقہ وعقائد، سیرت نبوی اور تاریخ اسلام کے علاوہ اردو ادب بھی شامل ہے، اختیاری مضامین میں عربی، فارسی انگریزی، اور ہندی میں سے کوئی ایک زبان لی جاسکتی ہے۔

جامعۂ دینیات کا تعلیمی نظام دینی تعلیم کے موضوع پر دنیائے اسلام میں غالباً پہلا تجربہ ہے۔ جامعۂ دینیات کا قیام ۱۹۶۶ء میں ۱۳۸۶ھ میں ہوا ہے، سال بسال اس کے امتحانات میں "امیدواروں" کی تعداد بڑھ رہی ہے، جامعۂ دینیات کی ابتدائی تین سالہ خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی سالہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:۔

"تین سال کے عرصے میں جامعۂ دینیات کے امتحانات میں پانچ ہزار سے زیادہ امیدوار شریک ہوئے، ان میں ستّر فی صد اسکولوں اور کالجوں کے طلبا و طالبات ہیں ۱۰ فی صد اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد، ۱۵ فی صد ملازمت پیشہ اور ۵ فی صد میں مختلف قسم کے افراد شامل تھے"

رپورٹ میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ:۔

"رفقائے تحریک مولانا محمد سالم صاحب، سید محبوب صاحب رضوی اور مولانا عبدالرؤف عالی نے بڑے اندیشوں کے

ساتھ اس راہ میں قدم رکھا تھا، اس طرح کا کوئی نقشۂ کار بھی سامنے نہ تھا، نہ اس راہ کی مشکلات سے آگاہی تھی اور آنے والے مراحل میں کسی کے عملی تجربے بھی موجود نہ تھے البتہ ایک داعیۂ یقین، ایک نشاطِ فکر اور ایک ہمتِ عمل تھی جس نے اس کام کو شروع کرایا اور ایسے حالات میں اس کی داغ بیل ڈلوائی جب کوئی ظاہری سہارا، اور مادّی ساز و سامان پشت پر نہ تھا، بس ملّت کی عمومی ضرورت کا ایک احساس، مقصد کی لگن اور خدائے تعالیٰ پر بھروسہ اس سفر کا توشہ تھیں۔" [1]

جامعۂ دینیات اردو کا تجربہ بحمد اللہ کامیاب رہا، اس کا ہر قدم ترقی کی جانب گامزن ہے۔

تعلیم گاہِ نسواں

دینی علوم کی تعلیم اور نشر و اشاعت میں دیوبند کی سرزمین نے جو اہم کردار پیش کیا ہے وہ تاریخ اسلام کا ایک روشن اور زرّین باب ہے گزشتہ ایک سو سال کی تاریخ میں دیوبند کی دینی خدمات اپنی وسعت و

---

[1] جامعۂ دینیات اردو کی سالہ رپورٹ مندرجہ پندرہ روزہ "میقات" دیوبند مورخہ یکم جولائی ۱۹۶۹ء ص ۵

عظمت کے لحاظ سے نہایت وقیع اور بلند پایہ رہی ہیں، لیکن دیوبند کی یہ عظیم الشان خدمات صرف مردوں کی حد تک محدود تھیں، اس لئے ضرورت تھی کہ بچیوں کی دینی تعلیم وتربیت کا کوئی مناسب بندوبست کیا جاتا تعلیم گاہِ نسواں (مدرسہ مرکز البنات) کے ذریعے سے اسی مقصد کو بروئے کار لایا جارہا ہے۔

۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء میں راقم سطور کی اہلیہ جمیلہ پنہاں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا، ابتداً چند سالوں تک صرف قرآن مجید پڑھایا جاتا رہا، پھر رفتہ رفتہ اردو زبان میں دینیات کے نصاب کا اضافہ ہوتا رہا، اور اب اس تعلیم گاہ میں قرآن شریف کے علاوہ اردو ادب، تاریخ اسلام، حساب انگریزی اور ہندی کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں عقائد وفقہ، تفسیر و حدیث، سیرتِ نبوی وغیرہ دینی علوم تعلیمی نصاب میں شامل ہیں، تعلیم کے علاوہ امورِ خانہ داری اور آرٹ (سینا، کاڑھنا، سوئٹر بننا، ٹیلرنگ کامدانی اور زری وغیرہ کاموں) کی تعلیم بھی دی جاتی ہے، تاکہ آئندہ زندگی میں بچیاں معاشی اور اقتصادی پریشانیوں کا شکار نہ ہوں۔

تعلیم گاہ میں جامعۂ دینیات اردو دیوبند، جامعۂ اردو علی گڑھ اور اردو بورڈ علی گڑھ کے امتحانات کی طالبات کو تیاری کرائی جاتی ہے جامعۂ دینیات اور اردو بورڈ کے امتحانی سینٹر بھی تعلیم گاہ میں قائم ہیں۔

گزشتہ سال میں تعلیم گاہ کی ۵۳ لڑکیوں نے جامعۂ دینیات اردو،

جامعۂ اردو، اور اردو بورڈ کے امتحانات میں سو فیصدی کامیابی حاصل کی، ۵۰ فی صد طالبات فرسٹ اور سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوئیں۔

یہ تعلیم گاہ، درسِ قرآن، بزمِ اردو اور تعلیم دینیات کے تین شعبوں پر مشتمل ہے، طالبات کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے، چھ استانیاں بچیوں کی تعلیم و تربیت میں ہمہ تن مشغول ہیں، تعلیم کے کسی مرحلے میں طالبات سے فیس نہیں لی جاتی، بلکہ ضرورت مند طالبات کو وظائف بھی دیئے جاتے ہیں، اور یہ سب کچھ اعتمادِ خداوندی کے بھروسے پر حسبۃً لِلّٰہ انجام پا رہا ہے۔

دیوبند کی مسلمان خواتین اور بچیوں میں دینی بیداری پیدا کرنے اور اسلامیات کی تعلیم کو فروغ دینے میں اس تعلیم گاہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ تعلیم گاہ نسواں کی جانب سے سیرتِ نبویؐ کے موضوع پر منعقد ہونے والے جلسے خواتین میں بڑے مقبول ہیں۔

مدرسۃ البنات

یہ بھی بچیوں کا مدرسہ ہے، جو مسلمان بچیوں کی پرائمری تعلیم کے لئے ۱۹۵۹ء / ۱۳۷۹ھ سے محترمہ امّ فرید صاحبہ کی سعی و کوشش سے جاری ہے موصوفہ ایک تجربہ کار اور کہن سال معلّمہ ہیں اور "پھوپھو" کے لقب سے مشہور ہیں۔ اس مدرسہ میں آٹھویں درجے تک تعلیم ہوتی ہے

جامعۂ اردو کے امتحانات کا سینٹر بھی اس میں قائم ہے۔

قرآن شریف کے علاوہ اردو، ہندی، حساب اور جغرافیہ کے ساتھ تعلیم الاسلام، بہشتی زیور اور سیرتِ نبویؐ اس کے نصابِ تعلیم میں شامل ہیں۔

طالبات کی خاصی تعداد اس میں زیرِ تعلیم رہتی ہے، کئی استانیاں محترمہ ام فرید کی نگرانی میں تعلیم کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

تعلیم گاہِ نسواں اور مدرسۃ البنات نے اُن بچیوں کی تعلیم وتربیت کی بڑی خدمات انجام دی ہیں جن کے والدین پردے کی پابندی کی وجہ سے اپنی بچیوں کو اسکولوں میں تعلیم دلانا پسند نہیں کرتے۔

بچیوں کے یہ دونوں تعلیمی ادارے پردے کے اہتمام کے ساتھ تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

قدیم عمارتیں

دیوبند کی قدیم عمارتیں بالعموم چھوٹی اینٹ سے بنی ہوئی ہیں، جس کو لکھوری[1] اینٹ کہتے ہیں، یہ عمارتیں مسلمانوں کے عروج و اقبال اور امارتِ رفتہ کے عہد کی یادگاریں ہیں اور اپنے بنانے والوں کے جاہ و جلال پر نوحہ کناں اور مصروفِ ماتم ہیں ؎

تِلکَ آثَارُنَا تَدُلُّ عَلَیْنَا فَانْظُرُوا بَعْدَنَا اِلَی الْآثَارِ

(ہمارے یہ نشانات ہمارا پتہ دے رہے ہیں، ہمارے بعد تم لوگ انہی آثار و علائم کو دیکھ لیا کرنا)

ان عمارتوں میں سے بہت سی مرورِ ایام اور انقلاب زمانہ کے باعث معدوم ہو چکی ہیں اور اب ایک تودۂ خاک کے سوا ان کا کوئی نشان نہیں ملتا، اور جو زمانے کے دست و بُرد سے بچی ہوتی ہیں وہ بھی نہایت خستہ اور شکستہ حالت میں ہیں، اپنی اصلی ہیئت میں تو کوئی عمارت بھی

---

[1] لکھوری اینٹ جسامت میں موجودہ اینٹ سے بہت چھوٹی ہوتی ہے، اس کی لمبائی ۶ انچ، چوڑائی ۴ انچ اور موٹائی ڈیڑھ انچ ہوتی ہے، قدیم زمانے میں عام طور پر انہی اینٹوں سے تعمیر کا رواج تھا۔ ان اینٹوں سے بنی ہوئی عمارتیں نہایت مستحکم ہوتی تھیں، اور ان کے بنے ہوئے مکانات گرمی اور سردی کے موسمی اثرات سے بہت کم متاثر ہوتے تھے۔

باقی نہیں رہی ہے، بعض جگہ قدیم مقبروں اور مزاروں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں، ان کے شکستہ آثار اور کھنڈر اپنی داستانِ اقبال پر نوحہ خواں ہیں ؎

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا!
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

ان عمارتوں میں سے اکثر کے زمانۂ تعمیر کی نسبت قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے، گمان غالب یہ ہے کہ چھٹی صدی ہجری کے اواخر اور گیارھویں صدی کے درمیان میں تعمیر ہوئی ہوں گی۔

یہ عمارتیں عموماً شاہانہ وضع کی تھیں، ان کی کشادگی اور وسعت کا یہ عالم ہے کہ ان کے کھنڈر کئی کئی فرلانگ کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں، ہر عمارت دوسری عمارت سے خاصے فاصلے پر واقع تھی۔

تیسری صدی ہجری کے مشہور سیاح[1] الہمدانی نے اس زمانے کی تعمیری خصوصیات کے بارے میں لکھا ہے کہ :-

"مکان بنانے کا بہترین موقع و محل ٹیلہ اور بلند جگہ ہے تاکہ اس میں رہنے والوں کی نگاہ نیچے کی چیزوں پر پڑتی رہے، اسی طرح مکانوں کے

---

[1] ابن الفقیہہ الہمدانی، مغربی ایران کے شہر ہمدان کا باشندہ تھا، ہمدانی نے تیسری صدی ہجری کے اواخر میں جغرافی معلومات پر ایک کتاب لکھی ہے، عربی میں جغرافیہ پر یہ قدیم ترین تصنیف ہے، اصل کتاب نہیں ملتی، اس کا خلاصہ علی شیرازی کا کیا ہوا ہے۔

رُخ، دروازے اور کھڑکی وغیرہ کے لئے بہترین سمت مشرق ہے کیونکہ جسم کی صحت پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے، اس قسم کے مکانات میں آفتاب کی شعاعوں اور اس کی روشنی سے استفادے کا زیادہ موقع ملتا ہے جو مکان بنائے جاتے ہیں ان میں کشادگی اور بلندی کا لحاظ ضرور رکھا جاتا ہے، مکان کا دروازہ مشرق کی جانب ہوتا ہے" [1]

یہ قدیم عمارتیں اور حویلیاں شہر کی آبادی سے باہر تھیں، ان میں سے قریب کی بعض عمارتیں اب آبادی میں شامل ہو گئی ہیں اور جو کسی قدر فاصلے پر تھیں وہ آبادی سے علیحدہ ہیں، ان میں سے بعض آباد بھی ہیں اور ان کے بنانے والوں کی اولاد ہی ان حویلیوں میں رہتی ہے، بعض میں دوسرے لوگ آباد ہو گئے ہیں، جو عمارتیں موجود ہیں ان کے اندرونی مکانات کسی میں بھی باقی نہیں رہے ہیں، صرف باہر کی چہار دیواریاں یا دروازے رہ گئے ہیں۔

میں یہاں صرف ان عمارتوں کا ذکر کروں گا جن کے کچھ نہ کچھ حالات معلوم ہو سکے ہیں، ورنہ بہت سے آثار ان سے بھی زیادہ قدیم اور اہم ہیں مگر چونکہ ان کے صحیح حالات معلوم نہ ہو سکے اس لئے مجبوراً ان کو نظر انداز کرنا پڑا ہے۔

دیوان یہ عظیم الشان عمارت دار العلوم کے مشرق میں لب شاہراہ واقع ہے، اس کا بلند و بالا دروازہ شکستگی کے باوجود

---

[1] الہمدانی ص ۱۰۳ بحوالہ ہزار سال پہلے ص ۱۹۳

بھی اپنے اندر ایک خاص شان و شکوہ رکھتا ہے، اس عمارت کا دروازہ، برج اور محراب فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ عمارت "لکھوری" اینٹ کی ہے اس وقت دروازہ اور چہار دیواری کا کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے، موجودہ مکانات بعد کی تعمیر ہیں، دروازے کے قریب دیوان خاص تھا، جس کے شکستہ بام و در خود راقم حروف نے بھی دیکھے ہیں، اب اس جگہ پردار العلوم کا شاندار مہمان خانہ تعمیر ہو گیا ہے۔

یہ عمارت شیخ لطف اللہ عثمانی کی یادگار ہے، جو شاہجہاں کے عہد میں دیوان کے منصب پر فائز تھے، انھوں نے اورنگ زیب کی ابتدائے حکومت کے زمانے میں یہ عمارت تعمیر کرائی تھی، کہا جاتا ہے کہ اورنگ آباد دکن میں بھی شیخ لطف اللہ نے بالکل اسی وضع کی ایک حویلی تیار کرائی تھی، یہ دروازہ پانچ منزل کا بتلایا جاتا ہے، اوپر کی دو منزلیں گر چکی ہیں، لکھوری اینٹ کے علاوہ جا بجا سنگِ سرخ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ کواڑوں کی چول میں اوپر کی جانب جو پتھر لگا ہوا ہے، کہا جاتا ہے کہ بارش ہونے سے پہلے اس میں نمی ظاہر ہونے لگتی ہے، دروازے کی محراب کی ڈاٹ پھٹ گئی تھی، ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۱ء میں اس کی مرمت کرائی گئی ہے، اس عمارت میں جو اب محلہ دیوان کے نام سے موسوم ہے، دیوان لطف اللہ کے اخلاف رہتے ہیں۔

مالیوں کی سرائے

شہر سے باہر شمال کی جانب واقع ہے، اس کی چہار دیواری بہت زیادہ قدیم التعمیر معلوم

ہوتی ہے، یہ عمارت کب؟ اور کس نے تعمیر کی؟ اس پر گمنامی کا گہرا پردہ پڑا ہوا ہے، صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ رؤسا رشیوخ اس کے بنانے والے تھے، اور اس میں متعدد رؤسا کی حویلیاں تھیں، یہ سرائے اور اس کے گرد و نواح کی زمین ابھی تک عثمانی شیوخ کی ملکیت ہے، ایک مسجد جو اسی عمارت کے ساتھ کی تعمیر بتلائی جاتی ہے احاطہ کے اندر موجود ہے مگر افسوس کہ اس میں کتبہ نہیں ہے، حویلی کا احاطہ بہت وسیع ہے، آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں عظیم الشان عمارت ہوگی، مکانات بکثیر معدوم ہو چکے ہیں چہار دیواری کا بھی بیشتر حصہ حوادثِ روزگار کی نذر ہو چکا ہے۔

سرائے پیرزادگان

شہر سے باہر جنوب کی جانب دیوی کنڈ کے متصل واقع ہے، یہ حضرت سید محمد ابراہیمؒ کی خانقاہ تھی، سید صاحبؒ گیارھویں صدی کے اوائل میں لکھنؤ سے آکر یہاں مقیم ہوئے تھے، اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ دیوبند اور اس کے اطراف و جوانب میں سید صاحبؒ کی دعوت و تبلیغ سے بہت سے لوگ متاثر ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے، سید صاحبؒ کی خانقاہ میں باطنی اصلاح اور تزکیۂ نفس کے علاوہ علمِ ظاہر کی تعلیم پر بھی کما حقہٗ توجہ کی جاتی تھی۔

خانقاہ کی کوئی عمارت اب موجود نہیں ہے، البتہ چہار دیواری اور مکانات کے آثار جا بجا پائے جاتے ہیں، سید صاحب کی اولاد شہر میں منتقل ہو گئی ہے، صرف دو ایک گھر باقی رہ گئے ہیں اور وہ بھی خستہ حال اور روایاتِ اسلاف سے عاری ہیں۔

کوٹلہ دیوبند سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں پرڑ واقع ہے کہا جاتا ہے کہ یہ عمارت اس موضع پرڑ کے رئیس شیخ محمد محسن صاحب کی بنوائی ہوئی ہے اور ان ہی کی اولاد مع اپنی رعایا کے اس میں رہتی ہے، اس کی چہار دیواری اپنی عمر کی آخری گھڑیوں سے گزر رہی ہے، چند سال ہوئے اس کا دروازہ منہدم ہو چکا ہے، زمانۂ تعمیر کا پتہ نہیں چل سکا۔

قلعہ جس قلعہ کے نام سے یہ مقام موسوم ہے وہ معدوم ہو چکا ہے شہنشاہِ اکبر کے عہد میں یہ قلعہ موجود تھا، ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں اس کا ذکر کیا ہے اور پختہ اینٹوں کی تعمیر بتلایا ہے، اس کے الفاظ ہیں، "قلعہ از خشت پختہ دارد"[1] البتہ قلعہ کے آثار موجود ہیں، قلعہ کا مقام عام سطح سے کافی بلند ہے، اس مقام پر ایک مسجد صحیح حالت میں موجود ہے اور اس میں کتبہ بھی نصب ہے، یہ ۹۱۰ھ / ۱۵۰۴ء میں اکرم میاں فیروز ملک محمد لطف اللہ افغان کے اہتمام میں تعمیر ہوئی ہے، کتبہ میں سلطان سکندر لودھی کا نام کندہ ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ قلعہ کو حسن خاں نے جو دیوبند کا حاکم تھا، تعمیر کرایا تھا، اور یہ قلعہ اسی قدیم شکستہ قلعہ کی بنیاد پر تعمیر کرایا گیا تھا جو راجگانِ ہستناپور کا بنوایا ہوا تھا۔

حسن خاں کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ سلطان حسین مشرقی شاہ جونپور کا بھائی تھا، بہلول لودھی کے عہد میں جب جون پور کی سلطنت تباہ ہوئی، تو

---

[1] آئینِ اکبری جلد دوم ص ۱۴۳

حسن خاں نے شہنشاہِ ہند کی ملازمت اختیار کرلی۔

سلطان سکندر شاہ (۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء - ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء) کے عہد میں اس کو دیوبند کا حاکم بنا کر بھیجا گیا، بعض لوگوں کا بیان یہ ہے کہ قلعہ اور مسجد مرزا حسن بیگ کے بنوائے ہوئے ہیں جو سلطان شہاب الدین غوری کے عہد میں دیوبند کا حاکم تھا، یہ بیان صحیح نہیں ہے، کیونکہ مرزا حسن بیگ اپنے نام کے امتیاز سے مغل معلوم ہوتا ہے، اس کا دیوبند آنا، تاریخ سہارنپور کی روایت کے مطابق سلطان شہاب الدین غوری کے زمانے میں بتلایا جاتا ہے اور یہ زمانہ مسجد کی تعمیر سے جیسا کہ اس کے کتبے سے معلوم ہوتا ہے تین سو سال قبل کا ہے، اس بنا پر قلعہ اور مسجد کے بنوانے کی نسبت مرزا حسن بیگ کی جانب منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔

خانقاہ یہ عمارت دارالعلوم کے مغرب میں واقع ہے، اکبر کے ابتدائی عہدِ حکومت میں ایک بزرگ شیخ جیا صاحبؒ اجمیر سے دیوبند آئے اور یہیں مقیم ہوگئے، اکبر پر ان کی بزرگی کا خاص اثر تھا، چنانچہ شیخ جیا صاحبؒ کے قیام کے لئے مرزا بیگ ابن خواجہ محب علی بخشی کے ذریعے اکبر کے حکم سے خانقاہ اور مسجدِ شاہی مصارف سے تعمیر کرائی گئیں، مسجد اب تک صحیح حالت میں موجود ہے، مگر خانقاہ کی عمارت کا بہت کم حصہ باقی رہ گیا ہے، شیوخ کے علاوہ اب اس میں متعدد غیر مسلم قومیں آباد ہیں

دیوبند کے مسلمانوں کی ان عمارتوں کی بوسیدگی اور شکستگی کو دیکھ کر دل میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر مستحکم اور مضبوط عمارتیں

اتنی جلد کیونکر منہدم ہوگئیں، جب کہ دوسرے مقامات پر ان سے زیادہ قدیم عمارتیں آج تک اپنی پرانی آن بان کے ساتھ سر اٹھائے کھڑی ہیں؟ میرے نزدیک ان عمارتوں کے اس قدر جلد حوادثِ روزگار کی نذر ہو جانے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کی سلطنت کے آخری دور میں بدامنی کے باعث دیوبند کو متعدد مرتبہ تاخت وتاراج اور آتش زدگی سے دوچار ہونا پڑا، جس سے پے در پے نہ صرف یہ کہ ان عمارتوں ہی کو نقصان پہنچا بلکہ مکین بھی پیہم لوٹ مار کی وجہ سے ایسے تباہ وبرباد ہوئے کہ پنپ نہیں سکے، ایسی حالت میں کون ان عمارتوں کی شکست وریخت کی مرمت کرا کر اپنے آباء واجداد کی یادگاروں کو باقی رکھ سکنے کی ہمت کر سکتا تھا، اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی عمارت کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیا جائے تو وہ زیادہ عرصے تک زمانے کے انقلابات کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

دو قدیم مکان

محلہ کائستھ واڑہ میں ایک شمال رویہ مکان جو بابو نند کشور بھٹناگر کی ملکیت میں ہے اس کے چوبی دروازہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس پر سنسکرت میں ۱۷۴۰ھ بحری لکھا ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس دروازے پر ۱۹ سو سال کے قریب گزر چکے ہیں، میں نے اس کو جس وقت دیکھا تو عبارت اور حروف اس قدر شکستہ اور محو ہو چکے تھے کہ ان کو پڑھ سکنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں تھا، البتہ اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس مقام پر کوئی عبارت لکھی ہوئی تھی، اگرچہ مکان کی عمارت میں کافی تغیر وتبدل ہو چکا ہے مگر دروازے کی نسبت کہا جاتا ہے کہ

یہ جوں کا توں ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آج دنیا میں اس قدر پرانی لکڑی جو پالش کے بغیر اتنی مدت تک باقی رہی ہو، غالباً کہیں موجود نہیں ہے لکڑی کے ماہرین کی رائے ہے کہ مضبوط سے مضبوط لکڑی تین سو سال سے زائد باقی نہیں رہتی، بشرطیکہ پانی کے اثر سے محفوظ رکھی جائے، مگر اس دروازے میں پانی سے حفاظت کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے، ایسی حالت میں اس کی انیس سو سال کی عمر پر یقین کرنا مشکل ہے۔

ایک اور مکان بھی کافی قدیم بتلایا جاتا ہے، اس مکان کے دروازے کی چوکھٹ گو حسب معمول لکڑی کی ہے مگر اپنے بہترین نقش و نگار اور تصاویر کے لحاظ سے اعلیٰ درجے کی صناعی کا نمونہ ہے، اوپر کی جانب یہ چوکھٹ تقریباً دو فٹ چوڑی ہے، اور اس میں بڑی بڑی مورتیاں تراشی ہوئی ہیں مورتیوں کے اوپر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عبارت لکھی ہوئی ہے، مگر اس مقام سے لکڑی اس قدر خراب اور بوسیدہ ہو گئی ہے کہ عبارت پڑھی نہیں جاتی یہ مکان پنڈت مادھو پرشاد جی (جو اس مکان کے مالک ہیں) بزرگوں کا بنوایا ہوا بتلایا جاتا ہے، میرے دریافت کرنے پر پنڈت مادھو پرشاد نے کہا کہ وہ "یہ تو نہیں بتلا سکتے کہ یہ مکان اور اس کا دروازہ کب تعمیر ہوا اس لئے کہ تمام خاندانی کاغذات سکھوں کی لوٹ میں ضائع ہو گئے ہیں"۔ اس سلسلے میں پنڈت جی نے ایک دلچسپ واقعہ بھی سنایا جو اُنھی کے الفاظ میں یہ ہے کہ :-

"ان کے گھرانے میں ایک بیل تھی جس میں اکسیر بھری ہوئی تھی

جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی آمیزش سے تانبا سونا بن جاتا ہے، جب سکھوں نے مکان لوٹا تو یہ بیل بھی دوسری قیمتی اشیاء کے ساتھ ان کے ہاتھ لگی، سکھ اس کی شہرت سن چکے تھے اور وہ اس بیل کی تلاش میں تھے مگر اس کی شکل وصورت سے واقف نہ تھے، انھوں نے صاحبِ خانہ سے پوچھا یہ کیا ہے؟ اُس نے اس خیال سے کہ شاید کسی طرح یہ بیل بچ جائے، کہا کہ اس میں تمباکو ہے سکھوں نے تمباکو سے نفرت کے باعث اس کو آگ میں پھینک دیا اور چلے گئے، بعد میں جب آگ میں دیکھا تو بیل جل کر سونے میں تبدیل ہوگئی تھی۔"

دیوی کنڈ

شہر کے جنوب شرق میں سُندری دیوی کا مشہور مندر اور تالاب ایک وسیع میدان میں واقع ہے، زمانۂ قدیم میں اس کے گرد ونواح میں جنگل کی کثرت تھی جس میں سادھو اور سنیاسی رہتے تھے، جس جگہ پر مندر واقع ہے وہ دیوی کنڈ کے نام سے موسوم ہے، مندر کی عمارت بہت پُرانی بتلائی جاتی ہے، مگر مدّت کی صحیح تعیین نہیں کی جاتی تاہم کہا جاتا ہے کہ موجودہ عمارت پانچ سو برس سے زیادہ کی بنی ہوئی ہے مندر سے ملحق ایک بڑا اور پُر فضا تالاب ہے، جس کے گھاٹ پختہ بنے ہوئے ہیں، یہ جگہ قدیم الایام سے ہندوؤں کی تیرتھ گاہ ہے، ہر سال یہاں ایک شاندار میلہ چیت شدی چودش کو ہوتا ہے، جس میں مختلف اطراف وجوانب سے

ہزاروں آدمی دیوی کی پوجا پرستش کے لئے آتے ہیں۔

پہلے یہ میلہ معمولی طور پر ہوتا تھا، مگر ۱۹۳۳ء / ۱۳۵۲ھ سے میونسپلٹی نے اس کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، اور اب ملک کے شائستہ میلوں کی طرح اسے آراستہ کیا جانے لگا ہے، مندر سے متصل سنسکرت کا ایک وِدیالیہ (مدرسہ) بھی قائم ہے، جس کا اوپر ذکر گزر چکا ہے۔

سُندری دیوی کے مندر کے علاوہ اور بھی بعض مندر قدیم بتلائے جاتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ نہ تو ان کے زمانۂ تعمیر کا پتہ چلتا ہے اور نہ بنانے والوں کا، اور نہ ان کے ساتھ کوئی تاریخی واقعہ وابستہ ہے، اس لئے اُن کو نظر انداز کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

بیاس میسّر کا مندر

متھرا کے رہنے والے ایک سادھو نے جن کا نام برجیندر گُسائیں ہے، راقم سطور کو ہندی ادبیات کے حوالے سے بتلایا کہ دیوبند کے ایک شخص ہت ہری بنس ترک وطن کر کے بندرابن (متھرا) چلے گئے تھے، انھوں نے ایک نیا مذہب جاری کیا جو رادھا بلّبھی کے نام سے موسوم ہے، اس کے ماننے والے لوگ بندرابن اور گجرات میں پائے جاتے ہیں۔

ہت ہری بنس کے دیوبند سے ترکِ وطن کا زمانہ سمبت ۱۵۹۱ بکرمی (۱۵۳۴ء) بتلایا جاتا ہے، ہندوستان کی تاریخ میں یہ ہمایوں کا عہدِ سلطنت تھا، ہت ہری بنس کے والد بیاس میسّر تھے ان کے نام کا ایک مندر دیوبند میں موجود ہے اور ان کے خاندان کے کچھ لوگ دیوبند میں آباد ہیں، یہ لوگ گُسائیں کہلاتے ہیں، اس مندر کے علاوہ اور بھی کئی پرانے مندر ہیں مگر ان کے زمانۂ تعمیر کا پتہ نہیں چلتا۔

تاریخی مَساجد

دیوبند میں مسجدیں بڑی کثرت سے ہیں، اور خوشی کی بات یہ ہے کہ بالعموم سب آباد ہیں، اور ان میں پنجگانہ نمازیں باجماعت ہوتی ہیں، بڑی چھوٹی سب ملاکر سو سے زائد ہیں، آبادی کے تناسب کے لحاظ سے بہت کم مقامات ایسے ہوں گے جو اس بارے میں دیوبند پر فوقیت لے جاسکیں گے۔

چھ مسجدیں مختلف شاہانِ دہلی کے زمانوں کی تعمیر ہیں، ان میں سے چند پرسنگی کتبے بھی موجود ہیں، چھ مسجدوں میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے، تاریخی حیثیت رکھنے والی مسجدیں حسبِ ذیل ہیں:

مسجد چھتہ یہ مسجد شہر کی مغربی جانب اور دارالعلوم کے جنوب مشرقی گوشے میں واقع ہے، ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم کا آغاز اسی مسجد میں ہوا تھا، یہ مسجد ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی طرزِ تعمیر کا نہایت سادہ مگر پُرشکوہ نمونہ ہے، یہ لکھوری اینٹ کی بغیر چونہ ویلاسٹر کی عمارت ہے، دیوبند کی سرزمین میں اس مسجد کے حجرے مشائخ و اکابر اہل اللہ کی قیام گاہ رہے ہیں۔

دیوبند کے مشہور بزرگ حضرت حاجی محمد عابدؒ کا قیام بھی اسی مسجد کے حجرہ میں رہتا تھا، دارالعلوم کے قیام کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ جو دارالعلوم کے سب سے پہلے

صدر مدرس تھے، اس مسجد میں قیام پذیر رہے ہیں۔ غرض کہ یہ مسجد دیوبند کے اکثر اہل اللہ کی جائے قیام اور سرچشمۂ فیوض رہ چکی ہے، مسجد کے صحن میں انار کا وہ تاریخی درخت بھی اب تک موجود ہے جس کے سایہ میں دارالعلوم کا مبارک آغاز عمل میں آیا تھا، سنہ ۱۳۹۰ھ / ۱۹۷۰ء میں مسجد کے قدیم حجرے جو شمالی جانب تھے ان کی جگہ اب نئی عمارت بن گئی ہے۔

مسجد قاضی

کہا جاتا ہے کہ شیخ ابوالوفا عثمانی جو دیوبند کے شیوخِ عثمانی کے مورثِ اعلیٰ ہیں اُن کے فرزند قاضی فضل اللہ ملقب بہ "شیر" نے یہ مسجد نویں صدی ہجری میں تعمیر کرائی تھی، عمارت نہایت سادہ بڑی اینٹ کی تھی، مرورِ زمانہ سے بوسیدہ ہو جانے پر سنہ ۱۳۱۱ھ میں دیوبند کے نامور طبیب حکیم مشتاق احمد صاحب نے جو دارالعلوم ۱۸۹۰ء دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اولین اراکین میں سے تھے، مسجد کو از سرِ نو بنوا دیا ہے، افسوس کہ اس موقع پر سنگی کتبہ گم ہو گیا، اس لئے سنِ تعمیر کا پتہ نہیں چل سکا، حضرت سید احمد شہیدؒ اپنے دورے کے سلسلہ میں سنہ ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء میں جب دیوبند تشریف لائے تھے تو اسی مسجد کے ایک الان میں دس روز تک قیام فرمایا تھا، حضرت سید شہیدؒ کے دیوبندی رفقاء میں سے اکثر حضرات اسی مسجد کے قرب وجوار کے رہنے والے تھے، ان حضرات کا تفصیلی ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

مسجد قلعہ

سکندر شاہ لودھی (سنہ ۸۹۴ھ / ۱۴۸۸ء - سنہ ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء) نے اپنے عہدِ حکومت میں بکثرت سرائیں، مدرسے اور مسجدیں

بنوائیں، یہ بڑا علم دوست بادشاہ تھا، ہندوؤں نے اولاً فارسی زبان کی تعلیم اسی کے عہد حکومت میں شروع کی، اسی زمانے میں ہندو مسلمانوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی، دیوبند کی یہ مسجد اسی کے عہد کی یادگار رہے ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ قلعہ کے ساتھ ہی اس کی تعمیر عمل میں آئی تھی، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، قلعہ کے آثار معدوم ہو چکے ہیں، البتہ مسجد صحیح اور قدیم حالت میں موجود ہے، اس کی صدر محراب میں باہر کی جانب سنگی کتبہ لگا ہوا ہے جس میں بخط نسخ حسب ذیل عبارت تحریر ہے:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

بنا شد ایں مسجد جامع در عہد سلطنت سلطان سکندر شاہ ابن سلطان بہلول شاہ خلد اللہ ملکہٗ، بانی خیر مسمیٰ اکرم میاں نیر وزیر ملک محمد لطف اللہ افغان ۵ بتاریخ ماہ رجب مرجب من سنۃ عشر و تسعمائۃ"

۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء میں مسجد کے عقبی جانب اور ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء میں صحن کی عمارت میں مزید اضافہ ہوا ہے، جس سے مسجد پہلے سے زیادہ وسیع اور کشادہ ہو گئی ہے۔

صحن میں حوض بھی مؤخر الذکر تعمیر کے زمانے میں بن گیا ہے، عقبی جانب کی عمارت میں اس کے زمانۂ تعمیر کا کتبہ بھی نصب ہے جس میں لکھا ہے کہ:-

---

۵ اس کے بعد جو لفظ لکھا ہوا ہے وہ صاف پڑھا نہیں جاتا۔

"درجۂ پیشین ایں جامع مسجد تعمیر ۶۱۶ھ ہجری معلوم می شود

---

[1] مسجد میں جو کتبہ نصب ہے اس کی عبارت اوپر گزر چکی ہے، تاریخ سہارنپور کے مصنف نے بھی ۶۱۶ھ ہی لکھا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، یہاں یہ واضح رہنا چاہیے کہ کتبے میں جس بادشاہ کے عہدِ سلطنت میں مسجد کا تعمیر ہونا ظاہر کیا گیا ہے وہ سکندر شاہ ابن بہلول شاہ ہے، اس کا زمانۂ سلطنت ۸۹۴ھ / ۱۴۸۸ء سے ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء تک ہے، ۶۱۶ھ / ۱۲۱۹ء سکندر شاہ کا نہیں بلکہ شمس الدین التمش (۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء سے ۶۳۳ھ / ۱۲۳۶ء) کا عہدِ حکومت ہے، کتبے میں سکندر شاہ کے نام کی موجودگی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اُسی کے عہدِ حکومت (۸۹۴ھ / ۱۴۸۸ء - ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء) کو مسجد کی تعمیر کا زمانہ قرار دیا جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سنِ مذکور کے پڑھنے میں اس قدر غلطی کیوں کر ہوتی رہی؟ یہ کتبہ خطِ نسخ میں لکھا ہوا ہے، اور پتھر کی سطح کو تراش کر حروف اُبھارے گئے ہیں، خط نہایت بھدّا ہے، کتبے کے حروف مشکل پڑھے جاتے ہیں، اس لئے جن لوگوں نے ۶۱۶ھ پڑھا (جیسا کہ درجۂ پیشین والے کتبے اور تاریخ سہارنپور میں لکھا ہے) انھوں نے "سنۃ عشر" میں "سنۃ" (سن) کو "ستۃ" سمجھ لیا۔ سنۃ عشر و تسعمائۃ کچھ اس طرح لکھا ہوا ہے کہ ستۃ عشر و ستمائۃ پڑھا جا سکتا ہے، یا تو یہ غلطی کتبہ لکھنے والے سے سرزد ہوئی، یا پھر مرورِ زمانہ سے حروف کی شکل کچھ متغیر ہو گئی ہے، جن لوگوں نے مسجد کو ۶۱۶ھ کی تعمیر بتلایا ہے انھوں نے تاریخ ہند و کی روشنی میں کتبے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، اور صرف کتبے کی تحریر پر اعتماد کر لیا اور یہی مغالطے کا باعث ہوا ہے، اس لئے مسجد کا سنِ تعمیر ۹۱۰ھ / ۱۵۰۴ء سمجھنا چاہیئے۔

چنانکہ از کتبۂ عربی پیشانیٔ دروازۂ کلاں ظاہر ست، سپس در دیوار قبلہ سہ در مفتوح کردہ، در سنہ ۱۳۴۲ھ ایں درجۂ جدیدہ غربیہ کہ وسعت چہار صف متصل دارد، از چندۂ عام اہل اسلام حنفی المذہب صورت تعمیر یافت۔"

سنگ مرمر کا یہ کتبہ محراب کی بائیں جانب لگا ہوا ہے، داہنی جانب اسی مضمون کی عبارت عربی میں کندہ ہے۔

آدینی مسجد

مسجد چھپنہ، مسجد قلعہ اور اس مسجد کا نقشہ اور طرز تعمیر تقریباً ایک ہی قسم کا ہے، یہ مسجد شیخ معزّ الاسلامؒ کی بنوائی ہوئی بتلائی جاتی ہے، مسجد کے متصل ہی ان کا مکان تھا، جس میں اب ان کا مزار ہے، مسجد سے ملحق جگہ "محلّہ بڑے بھائیان" کے نام سے موسوم ہے۔

"آدینی" کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس مسجد میں پہلے نماز جمعہ ہوتی تھی، اور چونکہ جمعہ کو فارسی میں آدینہ کہتے ہیں، اس لئے آدینی مسجد کے نام سے موسوم ہو گئی۔

سنہ ۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۶ء میں مسجد کی مشرقی جانب تعمیر میں مزید اضافہ ہوا ہے، تعمیر جدید کا جو کتبہ لگایا گیا ہے اس میں تحریر ہے کہ:-

"یہ قدیم جامع عرف مسجد آدینی ابتدائے آبادی قصبۂ دیوبند سے قائم ہے، سنہ ۱۳۶۵ھ میں تعمیر میں مزید اضافہ ہوا۔"

"ابتدائے آبادی دیوبند سے مسجد کا قائم" ہونا صحیح نہیں ہوسکتا، دیوبند ایک قدیم بستی ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی آبادی ہے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیوبند میں جب مسلمان آباد ہوئے اس وقت یہ مسجد تعمیر ہوئی تھی۔

ابتدائے آبادی کے وقت مسجد کے تعمیر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ظاہر ہے کہ مسجد اُسی وقت تعمیر ہوئی ہوگی جب مسلمانوں نے یہاں اقامت اختیار کی ہوگی، اور یہ زمانہ ساتویں صدی ہجری یا اس کے بعد کا ہوسکتا ہے، خود مسجد کے طرزِ تعمیر سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔

مسجد خانقاہ

یہ مسجد اکبر کے اوائل عہدِ حکومت کی یادگار ہے، جس محلہ میں یہ مسجد واقع ہے وہ شہر سے باہر شمال مغرب کی جانب ... ہے، اور خانقاہ کے نام سے موسوم ہے (اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے) مسجد میں سنگِ سُرخ کا کتبہ لگا ہوا ہے، کتبے کی پیمائش ۹ × ۱۵، انچ ہے، عبارت کا رسم الخط شاہانِ افغان کے رسم الخط سے ملتا جلتا ہے، اس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

" بنا شد ایں مسجد در عہد سلطان السلاطین نور حدقۂ شہریاری مہر سپہر سلطنت و کامگاری شہنشاہِ عادل ابو المظفر محمد جلال الدین اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ بسعی اہتمام فقیر حقیر مرزا بیگ ابن خواجہ علی محب بخشی شہر صفر سنہ نہصد و شصت و پنج از ہجرت"

اس کتبے میں اکثر باتیں تاریخی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہیں، اس کی تاریخ ۹۶۵ھ / ۱۵۵۷ء ہے جو اکبر کے سنِ جلوس کا تیسرا سال ہے، ہندوستان بھر میں عہدِ اکبری کا یہ کتبہ ان تمام موجودہ کتبات پر جو اب تک معلوم ہوئے ہیں سبقت رکھتا ہے، کیونکہ امکاناً اکبر کے عہد کا کوئی قریب ترین کتبہ اگر ہو سکتا تھا تو اس کے پایۂ تخت آگرہ اور فتح پور سیکری میں پایا جاتا مگر ان مقامات پر کوئی ایسا کتبہ اب تک دست یاب نہیں ہوا جو اس کتبے پر تقدّم رکھتا ہو، اس کتبے میں اکبر کی کنیت ابو المظفر کندہ ہے حالانکہ دوسرے کتبات پر جو بعد کے ہیں ابو الفتح تحریر ہے، اکبر کی پہلی اختیار کردہ کنیت ابو المظفر کسی دوسرے کتبے پر اب تک نہیں پائی گئی۔

راقم الحروف کے نزدیک ایک یہ بات بھی اس مسجد کو اکبر کے عہد کی دوسری مسجدوں سے ممتاز کرتی ہے کہ یہ ویران نہیں ہے، میں نے اکبر کی بنوائی ہوئی اب تک جس قدر مسجدیں دیکھی ہیں ان کو عموماً ویران پایا ہے مگر یہ مسجد ہمیشہ آباد رہی ہے۔ اس مسجد کا گنبد اسی طرح حسین اور خوبصورت ہے جیسا کہ شاہجہانی عہد کی مسجدوں کے گنبد پائے جاتے ہیں۔

مسجد سرائے پیرزادگان

یہ مسجد بھی قدیم اور تاریخی ہے اور شہنشاہ جہانگیر کے عہد کی یادگار ہے۔

سید محمد ابراہیم قدس سرہٗ کی خانقاہ کے ساتھ شاہی مصارف سے اس کی تعمیر عمل میں آئی تھی، سکھوں کی لوٹ مار اور آتش زدگی سے مسجد کو بھی سخت نقصان پہنچا تھا۔ اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، سادات کے

مشہور بزرگ حاجی محمد انور صاحبؒ نے ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں قدیم بنیاد پر مسجد کو از سرِ نو تعمیر کرایا، مسجد میں جو کتبہ نصب ہے وہ دوسری تعمیر کا ہے جو ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں ہوئی ہے۔

مسجد عالم گیری

عہدِ عالم گیری کی یہ مسجد شہر کی مغربی جانب محلہ ابوالمعالی میں واقع ہے، یہ مسجد ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء میں شیخ عبدالرحمٰن بن شیخ چندا عثمانی کے اہتمام میں تعمیر ہوئی تھی، صدر دروازہ میں حسبِ ذیل عبارت کا کتبہ نصب ہے، مسجد کا صحن وسیع اور کشادہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

"بنا شد ایں مسجد در عہدِ سلطنت شاہنشاہِ عادل، سلطان السلاطین ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب عالم گیر خلد اللہ ملکہ بسعی خانِ زمان جہاں گیر علی خان بہ اہتمام شیخ عبدالرحمٰن ابن شیخ چندا عثمانی شہر رمضان سنۃ ثمان وسبعین بعد الالف ہجری النبوۃ"

جامع مسجد

اس جامع مسجد کی بنیاد ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں رکھی گئی ہے، چار سال کے عرصے میں بن کر مکمل ہوئی، اسی زمانے میں دارالعلوم کا قیام بھی عمل میں آیا تھا، یہ جامع مسجد نہایت وسیع، کشادہ اور عظیم الشان ہے، اس کے بلند میناروں پر چڑھ کر شہر اور مضافاتِ شہر کا منظر نہایت خوش نما معلوم ہوتا ہے، صحنِ مسجد میں سنگِ مرمر کا حوض ہے۔ مسجد کی صدر محراب پر سنگِ مرمر پر حسبِ ذیل عبارت کندہ ہے

ھو اللہ الواحد، رسول اللہ محمد صلی اللہ علیہ
وسلم واسمائہ خلفاء من اللہ موید مہتمم تعمیر
صافی ضمیر حاجی محمد عابد صاحب سلمہٗ ربہٗ
ساعی ایں مسجد نقیر عبد الخالق دیوبندی عفی عنہ

صدّیقِ باصفا عمرِ عادلِ امور عثمانِ باحیا علی قاتلِ شرور
خواہی اگر زسالِ بناءِ مسجدِ عظیم یابی مرادِ خود بحسابِ جمل غفور

۱۲۸۶ھ

حاجی صاحبؒ نے مؤسس و مہتمم تعمیر کی حیثیت سے مسجد کے شمالی دروازے پر مسجد کے انتظام سے متعلق ایک دستور العمل سنگِ سُرخ پر کندہ کرا کر نصب کرا دیا ہے، چنانچہ اسی کے مطابق نظم و نسق قائم ہے، مسجد کے زمانۂ تعمیر کے ایک اشتہار میں تعمیرِ مسجد کی تحریک کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ نے خواب میں دیکھا کہ اس مقام پر جہاں اب جامع مسجد واقع ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور آپ کے سامنے ایک تشت رکھا ہوا ہے جو دودھ سے بھرا ہوا ہے، داہنی جانب ایک شخص ہے جو روپیہ لا لا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انبار لگا رہا ہے، آپ نے حاجی صاحبؒ سے ارشاد فرمایا کہ "یہاں مسجد بنانا شروع کر دو"۔

اسی زمانے میں مشہور واعظ مولانا عبدالرب دہلویؒ دیوبند تشریف لائے اور اپنے مواعظ میں جامع مسجد کی تحمیل کی تحریک کی، اہلِ شہر پر مولانا کے مواعظ کا بہت اثر ہوا، مگر جب تعمیر کا تخمینہ لگایا تو کم وبیش ایک لاکھ روپے کا ہوا، اتنی بڑی رقم کا فراہم ہونا آسان نہ تھا، لوگ متحیر تھے آخر ایک جگہ متعین کرکے سب لوگ رات کو جمع ہوئے اور بارگاہِ رب العزت میں دعا کی، لوگوں میں تعمیر مسجد کا ایسا جذبہ پیدا ہوگیا کہ انھوں نے روپیے کے علاوہ زیور، کپڑے، برتن، لکڑی، اینٹ اور چونہ، غرض کہ جو جس سے بن پڑا اس نے لاکر رکھ دیا، حاجی صاحبؒ مہتمم تعمیر قرار پائے اور مولانا عبدالخالق تحصیل چندہ پر مامور کئے گئے۔

مسجد کے مسقّف درجے تین ہیں اور ہر ایک درجے میں سات سات در ہیں، اور تین تین گنبد ہیں، مینار ہشت پہلو ہیں، ہر مینار میں چار درجے ہیں، روشنی اور ہوا کے لئے ہر ایک میں آٹھ آٹھ روشن دان ہیں ہر مینار میں سنگِ سُرخ کی سو سو سیڑھیاں ہیں، مناروں اور برجوں پر طلائی کلس چڑھے ہوئے ہیں، جو منشی ابوالحسن دیوبندی کی تنہا فیاضی کی یادگار ہیں، مسجد کے دالانوں میں تقریباً بارہ سو نمازیوں کی جگہ ہے صحن کے اطراف میں قدیم طرز پر مدرسہ اور طلبہ کے لئے دالان اور حجرے بنائے گئے ہیں، دارالعلوم دیوبند اپنے ابتدائی چند سالوں میں اس جامع مسجد میں بھی رہا ہے، مگر جب اس کی روز افزوں ترقی کے باعث یہ جگہ ناکافی ثابت ہوئی تو وہ دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔

مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں اسی زمانے میں ایک بزرگ سید جمعیت علی دیوبندی نے ایک طویل مثنوی لکھی تھی، اس میں مسجد کے حالات، مدتِ تعمیر معماروں اور مزدوروں کی تعداد، ان کی یومیہ مزدوری، طرزِ تعمیر کی خصوصیات مصارف کی تعداد وغیرہ، حاجی صاحبؒ کی انتظامی، اور مولانا عبدالخالق صاحب کی تحصیل چندہ کی خدمات نہایت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں، حاجی صاحبؒ کی نسبت اسی مثنوی میں ایک شعر ہے ؎

پیر جی عاشق علی کے نورِ عین　　بانیٔ مسجد ہوئے عابد حسین

یہ مثنوی چھ ہزار تین سو اشعار پر مشتمل ہے، چند شعر درجِ ذیل ہیں ؎

لکھتا ہوں اب درجہ درجہ کا بیاں　　تاکہ واقف اس سے ہو جاہر جواں
تین برج ہیں پہلے درجے پر میاں　　چار اگلے پر کیے اس نے نہاں
دوسرے درجہ پہ سات ہیں گئے عیاں　　تین اونچے چار نیچے بے گماں
تیسرے درجے پہ بھی بس تین ہیں　　تیرہ ہیں لیکن بہت رنگین ہیں
درجۂ سوئم پر کبھی ہیں اوپر کیے　　مستری نے چھت کے چار ہم سر کیے

حکیم عبدالحیؒ لکھنوی اپنے سفرنامہ دہلی اور اس کے اطراف میں لکھتے ہیں کہ :-

"جامع مسجد کی عمارت قابلِ دید ہے، تین درجے کی مسجد ہے، نہایت عمدہ عمارت ہے، صحن وسیع ہے۔" [۵۱]

---

[۵۱] دہلی اور اس کے اطراف ص ۹۶

دار العلوم

دیوبند

دارالعلوم دیوبند

دیوبند کو دارالعلوم کے باعث جو شہرت و عظمت حاصل ہے اس نے دیوبند اور دارالعلوم کو ایک دوسرے کا ہم معنی بنا دیا ہے، اس لئے دیوبند کی تاریخ میں دارالعلوم کا ذکر گویا دیوبند ہی کی تاریخ کا ایک حصّہ ہے، دارالعلوم اپنی ایک مستقل اور انفرادی حیثیت رکھتا ہے، ہند و پاک کے دوسرے مدارسِ عربیہ کے مقابلے میں یہ ادارہ اپنی اعلیٰ تعلیم، طلباء کی کثرت، انتظام و انصرام کے مختلف شعبہ جات اور کئی ایکڑ رقبے میں پھیلی ہوئی اپنی عظیم الشان عمارتوں کے لحاظ سے ایک مثالی ادارہ اور ایشیا میں مسلمانوں کا ایک عظیم علمی اور دینی مرکز ہے، جو بجا طور پر "ازہر الہند" کہلانے کا مستحق ہے، یہ باتیں اس کی مقتضی ہیں کہ دارالعلوم کے حالات کو بسط و تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔

گزشتہ ایک صدی میں اس عظیم درس گاہ سے ہزاروں طالبانِ علم فارغ ہوکر نکلے اور آسمانِ علم وفضل کی زیب وزینت بنے، ان فضلاء میں بڑے بڑے محدّث ومفسّر بھی ہیں اور فقیہ ومتکلم بھی، معقولات کے نامور ماہر بھی ہیں اور ادب وانشاء کے نکتہ شناس بھی، سیاسی رہنما بھی ہیں اور مشائخ گوشہ نشیں بھی مصنف بھی ہیں اور اخبار نویس بھی، مدرس بھی اور مبلغ بھی ہیں، حکیم وطبیب بھی ہیں اور اخلاقی وروحانی مرشد ومعالج بھی ہیں، غرض کہ دینی لحاظ سے مسلمانوں کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ملیگا جہیں جامعہ دارالعلوم کے فیض یافتہ موجود نہ ہوں، یہ تعلیم گاہ جو ابتداً بہت ہی معمولی اور بے سروسامانی کے عالم میں قائم ہوئی تھی، بہت جلد ترقی پاکر ایک عظیم الشان دارالعلوم کی شکل میں تبدیل ہوگئی، اور ایشیا کے مسلمانوں کا علمی ودینی مرجع ومرکز بن گئی، سمرقند وبخارا ایران وافغانستان، ترکی وروس، انڈونیشیا وملائیشیا، نیپال، برما، سیلون، افریقہ، اور دوسرے خطّوں سے کتاب وسنت اور شریعت وطریقت کے طالبین جوق درجوق آنے شروع ہوگئے، علم ودانش کی کرنوں نے دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے گوشے گوشے کو پُرنور بنا دیا، اور مسلمانانِ ہند کے دل ودماغ نورِ ایمانی اور تہذیبِ اسلامی سے منوّر ہوگئے۔

دارالعلوم دیوبند کئی معنی میں ایک بے مثال تعلیم گاہ ہے، اس کا قیام اُس وقت عمل میں آیا جب نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیائے اسلام میں دینی علوم زوال کے آخری سرے پر پہنچ چکے تھے، چنانچہ مصر کے مشہور عالم سید رشید رضا لکھتے ہیں:-

لولا عناية اخواننا علماء الهند — اگر ہندوستان کے علماء کی توجہ اس

بعلوم الحدیث فی ھذا العصر
تقضی علیھا بالزوال من امصار
الشرق، فقد ضعفت فی مصر و
الشام والعراق والحجاز منذ
القرن العاشر للھجرۃ حتّٰی بلغت
منتھی الضعف فی اوائل ھذا
القرن الرابع عشر[1]

زمانے میں علم حدیث کی طرف مبذول
نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم
ہو چکا ہوتا، کیونکہ مصر، شام، عراق
اور حجاز میں دسویں صدی ہجری سے
چودھویں صدی کے اوائل تک حدیث
کا علم ضعف کی آخری منزل پر پہنچ
گیا تھا۔

ایسے پُرآشوب حالات میں دارالعلوم نے علوم دینیہ کی نشاۃ ثانیہ کی گراں قدر خدمات انجام دیں، علوم اسلامی کی بقاء وترقی میں اس ادارے نے ہندوپاک کی تاریخ میں اہم رول ادا کیا ہے اور دینی علوم میں یہ درس گاہ پورے ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہے، زوالِ بغداد کے بعد جس طرح قاہرہ علوم وفنون کا مرکز بنا، ٹھیک اسی طرح دہلی کے زوال کے بعد علمی مرکزیت دیوبند کے حصّے میں آئی اور بڑی بڑی نامور اور یگانۂ روزگار شخصیتیں اس سرزمین سے اٹھیں، دارالعلوم جس وقت قائم ہوا اس زمانے میں اسلامی علوم کی وہ شمع جو چھ سو سال سے ہندوستان میں روشن تھی گُل ہو چکی تھی، انگریزوں نے اسلامی علوم وفنون اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کے تباہ وبرباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔

---

[1] مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ ص"ق" سید رشید رضا، مطبوعہ مصر ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء

۱۸۵۷ء تک دہلی کو اسلامی علوم وفنون کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی ملک کے گوشے گوشے سے تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھانے کے لئے دہلی پہنچتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جب دہلی اجڑی تو پھر اس کی علمی مرکزیت بھی ختم ہوگئی اور علم کا کارواں دہلی سے دیوبند منتقل ہوگیا۔

انگریزی عمل داری تک دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان، گجرات، جونپور، لکھنؤ، خیرآباد، پٹنہ، مدراس اور بنگال وغیرہ کے بہت سے مقامات علم وفن کا مرکز تھے، ان مدارس کے اخراجات کے لئے ہندوستان کے سلاطین اور امرائے سلطنت نے چھ سو سال کی طویل مدت میں جو بڑے بڑے اوقاف مقرر کئے تھے، ۱۸۳۸ء/۱۲۵۴ھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے ان تمام اوقاف کو ضبط کرلیا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی تعلیم کا سارا دارومدار انہی اوقاف کی آمدنی پر تھا، ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر نے جو بنگال میں ایک بڑے سول عہدے پر فائز تھا، برطانوی حکومت سے مسلمانوں کی عام ناراضگی کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"صوبۂ بنگال پر جب ہم نے قبضہ کیا تو اس وقت کے قابل ترین افسر مال جیمز گرانٹ کا بیان ہے کہ اس وقت صوبہ کی آمدنی کا تخمیناً ایک چوتھائی حصہ جو معافیات کا تھا حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ ۱۷۷۲ء/۱۱۸۶ھ میں وارن ہیسٹنگز نے اس علاقے کی واپسی کی مہم شروع کی مگر ناکام رہی۔ ۱۷۹۳ء/۱۲۰۸ھ میں لارڈ کارنوالس نے پھر اس معاملے کو اٹھایا مگر اس وقت کی طاقت ور حکومت بھی اس پر قابو نہ پاسکی۔ ۲۵ برس کے بعد ۱۸۱۵ء/۱۲۳۱ھ میں حکومت نے پھر اس معاملے کو زور سے اٹھایا مگر عمل کی جرأت نہ ہوسکی، آخر ۱۸۳۸ء/۱۲۵۴ھ میں آٹھ لاکھ پونڈ

کے خرچ سے مقدمات چلاکر ان معافیات اور اوقافِ تعلیم پر حکومت نے قبضہ کرلیا، صرف ان معافیات سے حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ (تقریباً ۴۵ لاکھ روپے) کا اضافہ ہوگیا۔" [۱]

اس کارروائی کا مسلمانوں کی تعلیمی زندگی پر کیا اثر پڑا؟ اس کی نسبت ہنٹر نے لکھا ہے کہ :-

"سیکڑوں پرانے خاندان تباہ ہوگئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دار و مدار انہی معافیات پر تھا، تہ و بالا ہوگیا، مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ۱۸ سال کی مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔" [۲]

آگے چل کر ہنٹر لکھتا ہے کہ :-

"مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جاسکتا کہ ہم نے ان کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا، اس حقیقت کو چھپانے سے کیا فائدہ، مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائداد کو جو اس مصرف کے لئے ہمارے قبضے میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں آج بھی اُن کے پاس اعلیٰ اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے۔" [۳]

ہنٹر کے اس بیان سے اندازہ کیجئے کہ اسلامی دورِ حکومت میں جب صرف ایک ایسے دور افتادہ صوبے میں جس کو اس زمانے میں تعلیمی لحاظ سے

---

[۱] ہنٹر کی کتاب کا اردو ترجمہ ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۲۵۵ و ۲۵۶

[۲]، [۳] ایضاً ص ۲۵۷ و ۲۵۸

کوئی علمی نوقیت یا مرکزیت حاصل نہ تھی، تعلیم کے لئے ۴۵ لاکھ روپے سالانہ آمدنی کے اوقاف موجود تھے تو ہندوستان کے دوسرے صوبوں اور بالخصوص ان مقامات میں جن کو تعلیمی مرکزیت حاصل تھی کس قدر اوقاف ہوں گے؟

مسلمانوں کے قدیم نظامِ تعلیم کو مٹا کر جو جدید تعلیمی نظام قائم کیا گیا تھا اس میں مسلمانوں کے مذہبی رجحان کی کس حد تک رعائت ملحوظ رکھی گئی تھی، اس کو بھی ہنٹر ہی کی زبان سے سنئے، لکھتا ہے :-

"ہمارے طریق تعلیم میں مسلمان نوجوانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے، بلکہ وہ قطعی طور پر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے"[1]

برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر برک نے اپنی اُس یادداشت میں جو برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کی گئی تھی لکھا ہے :-

"اُن مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا، اور جہاں دُور دُور سے طالب علم پڑھنے کے لئے آتے تھے، آج وہاں علم کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا ہے"[2]

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سلطنتِ مغلیہ کے نقشِ قدم پر قائم ہوئی تھی، مسلمانوں کے علوم و فنون میں فی الفور کثیر تبدیلی لانا مشکل تھا اس لئے اٹھارویں صدی کے اواخر میں کمپنی کی حکومت نے دہلی اور کلکتہ میں مشرقی علوم

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۲۵۲۔ [2] بحوالہ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد اول ص ۲۹۲۔ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی۔

کے ادارے قائم کئے، ان اداروں کا مقصد کمپنی کی حکومت کے لئے عہدے دار پیدا کرنا تھا۔ لارڈ ولیم بنٹینک (۱۸۲۸ء - ۱۸۳۵ء / ۱۲۴۴ھ - ۱۲۵۱ھ) کے عہد میں جب وسیع پیمانے پر سرکاری مدارس قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تو اس وقت اہل الرائے انگریزوں کا خیال تھا کہ یہ تعلیم مشرقی زبانوں میں دی جائے، لیکن سرکاری کونسل کا ایک رکن میکالے تھا جو انگلستان کا مشہور مصنف گزرا ہے، اس کو اصرار تھا کہ ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان قرار دی جائے، بڑے بڑے پادری بھی اس کے ہم خیال تھے، کیونکہ ان کے نزدیک مغربی علوم اور زبان کی تعلیم سے عیسائیت کے فروغ پانے میں آسانی پیدا ہوتی تھی، میکالے کی پرجوش تقریروں کے سامنے کسی کی کچھ پیش نہ گئی اور انگریزی کو سرکاری مدارس کی زبان تسلیم کرلیا گیا[1] چنانچہ

سب سے پہلے دہلی کالج میں انگریزی کی کلاس جاری کی گئی، تین چار سال کے اندر اندر اس کلاس نے بڑی ترقی کی، یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی زبان اور انگریزی علوم سے ہندوستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً سخت نفرت تھی، مذہبی اختلاف نے انگریزوں سے انتہائی منافرت پیدا کردی تھی، دہلی کالج کے مشہور پروفیسر رام چندر کے عیسائی مذہب اختیار کرنے سے لوگ اور بھی زیادہ برداشتہ خاطر ہوگئے تھے۔

فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے جس کی ہندوستان کے حالات

---

[1] تاریخ ہندہاشمی فرید آبادی ص ۳۸۷۔ مطبوعہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

پہ بڑی گہری نظر تھی، سرکاری اسکولوں کی تعلیم کے نتائج پر بڑے وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ :-

"اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستانی نوجوان نہ صرف مشن اسکولوں بلکہ سرکاری مدارس میں جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ عیسائیت کی طرف مائل ہوں، مسلمانوں کو خاصکر اس بات کا احساس ہے اور وہ اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجنے سے احتراز کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اسلام کے علاوہ نجات کا کوئی دوسرا راستہ نہیں، لیکن ہندو اس باب میں زیادہ سخت نہیں چنانچہ انھیں کی جماعت کے افراد مسیحی تبلیغ سے متاثر ہو رہے ہیں، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مشنری بھی غافل نہیں وہ بھی اپنا کام انہماک سے کئے جاتے ہیں اور اپنی مساعی کا پھل پاتے ہیں"[1]

یہی مصنف ایک دوسری جگہ لکھتا ہے :-

"ہندوستانیوں میں یورپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جاتا ہے اسی قدر وہ ہماری تہذیب و تمدن اور ہمارے اصولِ مذہبی سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں، ہندوستان میں تبلیغ مسیحیت کو جو کامیابی حاصل ہو رہی ہے اس سے ہر عیسائی کو خوشی ہونی چاہیئے، انگریزی مشن جو ہندوستان میں کام کر رہے ہیں ان کو خوب کامیابی ہو رہی ہے،

---

[1] ترجمہ خطبات گارساں دتاسی (GARCIN DE TASSY) ص ۸۰۴ و ۸۰۵ مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۵ء۔

اور روز بروز ہندوستان میں دینِ مسیحی کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔" [1]

غرض کہ انیسویں صدی عیسوی میں ہندوستانی مسلمانوں کی ملّی زندگی بڑی ہی سنگین صورتِ حال سے دوچار تھی، ہندوستان کی فرمانروائی انگریزوں کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی تھی، اس زمانے میں مسلمانوں کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو بادہائے مخالف کے تیز و تند جھونکوں سے متأثر نہ ہوا ہو، سیاسی انقلاب ہمیشہ اپنے جلو میں فکری اور ذہنی انقلاب لے کر آتا ہے، ہندوستان میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا، انگریزی حکومت کا قیام صرف اتنا ہی نہ تھا کہ ایک حکومت کی جگہ دوسری حکومت نے لے لی تھی بلکہ سیاسیات سے لے کر علم و فن، فکر و نظر اور تہذیب و معاشرت کے ہر گوشے میں انقلاب آگیا، پرانی قدریں جو صدیوں سے چلی آرہی تھیں ایک ایک کر کے بدلنے لگیں، قدیم نظامِ تعلیم کی جگہ نئے تعلیمی نظام کا چرچا شروع ہوگیا، اُسی زمانے میں یورپ میں سائنسی اور صنعتی انقلاب برپا ہو چکا تھا، نئی نئی محیر العقول ایجادات نے لوگوں کو مبہوت اور حیرت زدہ بنا دیا تھا، جس سے انگریزوں کی غیر معمولی قوت و شوکت اور برتری کا رعب دلوں پر طاری ہوگیا، ہر وہ صدا جو یورپ سے اٹھتی تھی ذہن و فکر کے لئے مسحور کن ہوتی تھی۔

---

[1] ترجمہ خطبات گارساں دتاسی ——— ص ۴۰۷

و ۴۰۲، مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سنہ ۱۹۳۵ء۔

۱۸۵۷ء کا سیاسی طوفان مسلمانوں کے لئے سخت ناسازگار ثابت ہوا، ان کے اس علمی اور تہذیبی سرمایے کو زبردست خطرہ پیش آگیا جس کو سیکڑوں سال کی جدوجہد سے اُنھوں نے ہندوستان میں فراہم کیا تھا، اس تاریخی انقلاب نے عام طور پر ہر ہندوستانی کو یہ محسوس کرادیا کہ اب وہ اپنے وطن میں انگریز قوم کا نہ صرف سیاسی طور پر ماتحت ہے بلکہ اس کا دل و دماغ اور علم و فکر بھی فاتح قوم کے ہاتھوں میں رہن ہو چکا ہے، اس لئے اب یا تو اپنی قومی روایات کو بالکل خیرباد کہنا پڑے گا یا اس میں ترمیم و تخفیف کرنی ہوگی تاکہ وہ اس نئے تہذیبی نظریے سے ہم آہنگ ہوسکے جو یورپ سے انگریز اپنے ساتھ لائے ہیں، یہ احساسات ہندوؤں اور مسلمانوں کے فعّال اور باشعور طبقے میں بڑی تیزی کے ساتھ پیدا ہوئے اور ہر ایک نے ان مسائل پر اپنے اپنے انداز میں غور کرنے اور ان کا حل ڈھونڈ نکالنے کی کوششیں شروع کردیں۔

مسلمانوں نے اس مسئلہ پر دو طرح سوچا، ایک طرزِ فکر یہ تھا کہ چونکہ ملک کا پورا نظم و نسق انگریزوں کے ہاتھ میں جا چکا ہے اور ان کی پالیسی خاص طور پر مسلمانوں کو نظر انداز کرنے کی ہے، اس لئے بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ خود انگریزی تعلیم اور طرزِ زندگی کو اپنایا جائے تاکہ فاتح اور مفتوح کی اجنبیت دور ہوسکے اور مسلمان بحیثیت ایک ملّت کے قومی اور ملکی سطح پر پھر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرسکیں۔

اس طرز کے ماتحت ایک نقشہ بنایا گیا، اور اس کے مطابق علی گڑھ میں کام شروع کر دیا گیا۔

دوسرا طرزِ فکر یہ تھا کہ برطانوی اقتدار کو ہندوستانیوں سے بالعموم کوئی ہمدردی نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کے ساتھ اسے خصوصی عناد ہے اس لئے برطانوی سامراج اور اس کے پیدا کردہ اثرات سے مرعوب ہونے کے بجائے ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ اپنی دینی اور تہذیبی روایات کو مغربی تہذیب کے سائے سے محفوظ رکھا جا سکے اس طرزِ فکر کے لوگوں کو اپنے ان غیرت مندانہ احساسات و جذبات کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی، لیکن اس وقت پورے ملک میں جبر و ظلم کا جو دور دورہ تھا اس کا مسلمانوں میں یہی ردِ عمل ہونا چاہیے تھا کہ وہ کبھی خوش دلی سے برطانوی سامراج کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے، عام مسلمانوں کا اس وقت یہی جذبہ تھا جس کی نمائندگی دوسرے طرزِ فکر کے لوگوں نے کی، یہی طرزِ فکر دیوبندی طرزِ فکر کہلاتا ہے۔

یہ حالات تھے جن میں ایک طرف دارالعلوم دیوبند عالم وجود میں آیا اور دوسری طرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی دونوں اداروں نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے مطابق کام کرنا شروع کیا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کا ذہن و فکر تعلیمی حیثیت سے دو حصّوں میں منقسم ہو گیا تھا

ایک گروہ وہ تھا جو کلیۃً انگریزوں کا مخالف تھا، اور انگریزی تعلیم کو مسلمانوں کے لئے مُضر سمجھتا تھا، اس کے پیش نظر سب سے زیادہ اہم مسئلہ احیائے دین کا تھا، اس جماعت کی قیادت علمائے دیوبند کے ہاتھوں میں تھی دوسرا طبقہ مسلمانوں کی دنیوی فلاح و بہبود کے لئے حکومت سے وابستگی ضروری سمجھتا تھا، اس گروہ کی سربراہی کا فخر علی گڑھ کو حاصل تھا، اگرچہ بنیادی طور پر دونوں جماعتوں کا مقصد مسلمانوں کی فلاح و بہبود تھا مگر چونکہ طریق کار الگ الگ تھے، اس بنا پر ملّی نشاۃ ثانیہ کے لئے ان میں تصادم اور ٹکراؤ کا ہونا ناگزیر تھا، مگر اس کے باوجود مردانِ کار کے قدم آگے بڑھتے رہے، اور ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ پر ملّت کی زبردست خدمات انجام دیں، دونوں طبقوں کے مابین یہ محض رائے کا اختلاف تھا، مگر چونکہ نیتوں میں جذبۂ اخلاص کارفرما تھا اور ملّت کا مفاد دونوں کے پیشِ نظر تھا، اسی لئے تصادم روز بروز کم ہوتا گیا، اور دونوں گروہوں کو اپنی اپنی جگہ پر غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی، اس لئے یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ آج ہند و پاک کے مسلمان دینی، علمی، ذہنی، فکری اور سیاسی حیثیت سے جس سطح پر ہیں اس کی تاسیس و تعمیر میں کوئی ایک نہیں بلکہ سب ہی شریک اور حصّے دار ہیں، کسی نے مسلمانوں کی دینی اور مذہبی حیثیت کو سنبھالا اور کسی نے دنیوی اور سیاسی اور اقتصادی رُخ سے ان کے ابھرنے کا موقع فراہم کیا، اس لئے درحقیقت دونوں ہی مسلمانوں کے شکریے کے مستحق ہیں، یہ بات

واضح ہے کہ اس دور کے بدلے ہوئے حالات میں صرف دنیوی ترقی مسلمانوں کو اسلام سے بیگانہ بنا دیتی، اسی طرح صرف دینی علوم سے مسلمان ملک میں پیش آنے والے حالات میں ملکی اور انتظامی عہدوں سے محروم ہو جاتے۔

غرض کہ مسلمانوں میں دینی بیداری پیدا کرنے میں پہلی جماعت نے اہم کردار ادا کیا اور مسلمانوں کو دنیوی زندگی دوسرے گروہ کی بدولت ملی، مگر اس تقسیم کا بہت زیادہ افسوسناک نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ میں تعلیم کی طرح دینی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی کی راہیں بھی ایک دوسرے سے جدا ہو گئیں، مسلمانوں کے دو کیمپوں میں بٹ جانے سے ان کو سخت ترین نقصان سے دوچار ہونا پڑا ہے، اور ایک صدی سے زائد مدت گزر جانے کے باوجود اب تک اس کی تلافی نہیں ہو سکی ہے، یہ صورتِ حال صرف ہندوستان کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیائے اسلام کے ہر خطے کے مسلمان کم و بیش اسی نوع کے حالات سے گزر رہے ہیں۔

دینی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند میدانِ عمل میں آیا، اس نے دینی لحاظ سے اس زمانے کے چھا جانے والے خطرات سے مسلمانوں کو بچانے اور دینی قدروں کو محفوظ رکھنے میں مہتم بالشان خدمات انجام دیں، اس کے بزرگوں نے کتاب اللہ کی مشعل روشن کر کے تفسیر، حدیث، فقہ، اسلامی علم و ادب اور عقائد

واعمال کے تحفظ کے لئے ایک ایسا مضبوط حصار تیار کیا جو پیش آنے والے خطرات کے لئے مؤثر ضمانت ثابت ہوا، دیوبند کے بعد سہارنپور مرادآباد، دہلی، تھانہ بھون، گلاؤٹھی وغیرہ مقامات میں جابجا دینی مدارس کھل گئے، اور چند سال کی جدوجہد میں درّۂ خیبر سے لے کر برما تک، اور نیپال کی ترائی سے مالابار تک ہر طرف دینی علوم کے چشمے جاری ہوگئے اور ہندوستان کا گوشہ گوشہ قال اللہ اور قال الرسول کی صداؤں سے گونج اٹھا۔

دوسرے گروہ نے انگریزی زبان وادب اور مغربی علوم وفنون کے ذریعے سے برطانوی نظامِ حکومت میں شامل ہوکر مسلمانوں کو ان محرومیوں سے محفوظ کردیا جو انگریزی علوم سے دُور رہتے ہوئے ناگزیر تھیں، اس گروہ کی جدوجہد سے سارے ملک میں مسلم اسکول اور کالج کھل گئے، سرسیّد مرحوم نے ایجوکیشنل کانفرنس کے ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء کے سالانہ اجلاس میں کہا تھا کہ:-

"اس وقت ہمیں ضرورت ہے کہ جس قدر ہوسکے ایک کثیر تعداد ایسے نوجوانوں کی پیدا کریں جو اُن علوم میں جو اس زمانے کی حاجتوں کے لئے ضروری ہیں سربرآوردہ ہوں"[1] دونوں طبقوں کی اپنی اپنی جگہ کامیابی کے باوجود جدید نظامِ تعلیم

---

[1] روداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء مطبوعہ علی گڑھ

کے جاری ہونے سے مسلمانوں کو ایک زبردست نقصان اٹھانا پڑا، قدیم مدارس میں جو نصابِ تعلیم جاری تھا وہ اپنے زمانے کی دینی و دنیوی دونوں قسم کی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا، یہ نصاب دینی علوم تفسیر و حدیث اور فقہ و کلام کے ساتھ رائج الوقت دنیوی علوم ریاضی، منطق، فلسفہ، ہیئت اور فارسی ادب وغیرہ پر مشتمل ہوتا تھا، چنانچہ ان مدارس کے تعلیم یافتہ اپنے ذوق کے مطابق دینی یا دنیوی راہوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیتے تھے، وہ مسند دعوت و ارشاد اور منصبِ افتاء پر بھی فائز ہوتے تھے، اور دیوانِ حکومت کی زینت بھی یہی لوگ ہوتے تھے، انگریزی حکومت کے آغاز تک یہی صورت قائم رہی اور انیسویں صدی کے نصف تک بے شمار علماء اعلیٰ سرکاری عہدوں پر مامور نظر آتے تھے مگر جب انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیا گیا اور معاملاتِ زندگی میں جدید مغربی علوم نے اہمیت اختیار کی تو صورتِ حال بدل گئی، اور قدیم طرز پر تعلیم پانے والوں کے لئے نظامِ حکومت میں ملکی عہدوں اور منصبوں کی راہیں مسدود ہو گئیں۔

دوسری طرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اپنی پُرعظمت تاریخ، ملی روایات دینی علوم اور اسلامی ثقافت سے دُور ہوتا چلا گیا، اور حاکمانہ عظمت و اقتدار نے اس کے اندر اسلامی قدروں سے بے گانگی پیدا کر دی ہے۔

جدید نظامِ تعلیم کے جاری ہونے سے مسلمانوں کے تعلیمی نظام میں قدیم و جدید کے نام سے جو دو علمی طبقے پیدا ہو گئے ہیں اس نے فکر و نظر کی سابقہ وحدت کو ختم کر دیا ہے، جدید نظامِ تعلیم میں مذہبی علوم کے بجائے

جملہ عصری علوم کو اہمیت دی گئی ہے، انگریزی طریقۂ تعلیم کو چونکہ حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اس لئے یونیورسٹیوں سے فارغ ہونے والے طلبار کو زندگی کے ہر شعبے میں سہولتیں حاصل ہیں، اس کے برخلاف دینی تعلیم سے فارغ ہونے والے طلبار کا دائرہ بہت محدود ہوگیا ہے اس کے علاوہ ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ انگریزی داں طبقہ دینی علوم کے فضلاء سے بے پرواہ رہتا ہے، یہ اس خیال کی بنا پر ہے کہ علما کو انگریزی زبان سے واقفیت نہیں ہوتی اور وہ سائنس، معاشیات اقتصادیات، عمرانیات، سیاسیات اور دورِ حاضر کے دوسرے علوم سے باخبر نہیں ہوتے، اسی طرح دینی تعلیمی حلقوں میں یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ لوگوں کے بارے میں لائق تحسین جذبات نہیں پائے جاتے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی داں طبقہ دین سے بیگانہ ہوتا ہے اور اس کی قابلیت صرف دنیوی ضروریات کی تکمیل تک محدود ہوتی ہے، علما کے نزدیک مذہب سے کما حقہٗ واقفیت نہ صرف اس دنیا میں کامیابی کے لئے نہایت اہم ہے بلکہ آخرت کے لئے بھی ضروری ہے۔

اس طرح قدیم تعلیم یافتہ اور جدید تعلیم یافتہ کے نام سے دو مستقل گروہ بن گئے ہیں، دونوں گروہوں میں کوئی ذہنی ارتباط نہ ہونے کے سبب سے بُعد المشرقین پیدا ہوگیا ہے۔

اس صورتِ حال سے جو نقصان مسلمانوں کو پہنچا ہے اس سے

کوئی دانشمند صرفِ نظر نہیں کرسکتا ، اس صورتِ حال کا بدلنا ضروری ہے تاکہ علمار اور مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کا بُعد دور ہوسکے ، اور مذہبی اور دنیوی تعلیم کا فرق ختم ہوجائے اور علمار حکومت کے کاروبار میں شریک ہوسکیں اور انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ دینی مسائل سے بے خبر نہ رہے ۔!

اس صورتِ حال پر اس زاویے سے بھی غور کرنا ضروری ہے کہ مغربی ملکوں میں اسلام اور اسلامی مسائل پر مستشرقین کی تحریریں اور تبصرے جو انگریزی زبان میں ہوتے ہیں ، بعینہٖ وہی انگریزی تعلیم یافتہ طبقے تک پہنچتے ہیں ، یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ مستشرقین کا طبقہ اسلام پر عمیق مطالعہ نہ ہونے کے باعث نہ صرف یہ کہ وہ اپنی تحریروں کو زیادہ مفید نہ بنا سکا بلکہ ان کی تحریروں سے اسلام کی نسبت شدید قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں ، مستشرقین کے اس طبقے کی جانب سے اسلام اور اس کی تعلیمات کی نسبت جو بھی غلط رُخ پیش کیا گیا پڑھنے والوں کے سامنے نہ اُس کی تردید آسکی اور نہ انھیں صحیح معلومات بہم پہنچ سکیں ، ہمارا وہ طبقہ جو دینی تعلیم سے بہرہ ور ہے وہ انگریزی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے مستشرقین کے بیانات پر نقد و تبصرے سے قاصر رہا ، اس لئے ہمارے نوجوانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ اسلامی مسائل کی نسبت شکوک و شبہات میں مبتلا ہوگیا ، انگریزی لٹریچر نے اس کے ذہنوں کو مسموم کردیا ہے اور وہ اسلامی مسائل کو اسی رُخ سے دیکھنے کا عادی ہوچکا ہے جس رُخ سے مغربی مصنفین انھیں پیش

کرتے ہیں۔

گزشتہ نصف صدی میں اس صورتِ حال کو بدلنے اور قدیم وجدید کے مابین حائل وسیع خلیج کو پُر کرنے کے لئے متعدد مرتبہ کوشش کی جاچکی ہے، مگر افسوس ہے کہ اب تک اس پر قابو نہیں پایا جاسکا۔

تاسیس وقیام

۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ھ (۳۰ر مئی ۱۸۶۶ء) بروز پنجشنبہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا وہ مبارک ومسعود دن تھا جس میں مدارس دینیہ کے سابقہ طریق کے بجائے بالکل ایک نئے انداز سے دارالعلوم دیوبند کا آغاز ہوا، اس وقت اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے کوئی عمارت موجود نہ تھی، اس لئے مدارس کے قدیم طرز پر چھتہ کی تاریخی مسجد کے کھلے صحن میں انار کے ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے صرف ایک استاد اور ایک شاگرد سے تعلیم شروع کردی گئی، استاد دیوبند کے نامور عالم مولوی محمد محمود تھے، اتفاق سے شاگرد کا نام بھی محمود ہی تھا[1]، یہ وہی شاگرد تھے جو آگے چل کر استاذ الاساتذہ بنے اور شیخ الہندؒ کے لقب سے ملقّب ہوئے۔ شیخ محمود الحسن دیوبندی شاگرد مولانا

---

[1] مدرسہ اسلامی عربی دیوبند کا زریں ماضی ومستقبل ص ۲۲ مطبوعہ ۱۳۲۸ھ افضل المطابع دہلی ۱۹۱۰ء

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت حاجی سید محمد عابد مولانا ذوالفقار علی اور مولانا فضل الرحمان (رحمۃ اللہ علیہم) جیسے مشائخ وقت اور یگانۂ روزگار علماء کے مبارک ہاتھوں سے ایک تعلیم گاہ کا افتتاح عمل میں آیا اور "مدرسہ عربی و فارسی و ریاضی" نام تجویز ہوا حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں :۔

"منشی ممتاز علی صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ کیا، مولوی صاحب (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) کو پرانی دوستی کے سبب بلالیا، وہی تصحیح کی خدمت تھی، اس وقت میں ایک جماعت نے مسلم پڑھی، احقر بھی اس میں شریک رہا وہی زمانہ تھا کہ بنائے مدرسہ دیوبند کی پڑی، مولوی فضل الرحمٰن اور مولوی ذوالفقار علی صاحب اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں، مدرس کے لئے تنخواہ پندرہ روپے تجویز ہوئے، اور چندہ شروع ہوا، چند ہی روز گزرے تھے کہ چندے کو افزونی ہوئی اور مدرس بڑھائے گئے، اور مکتب فارسی اور حافظ قرآن مقرر ہوئے مولوی محمد قاسم صاحب شروع مدرسہ میں دیوبند آئے اور پھر ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہوئے"۔ [1]

---

[1] سوانح قاسمی ص ۲۲ مطبوعہ صادق الانوار بھاول پور ۱۲۹۷ھ

اس زمانے میں مدارسِ عربیہ کا اجرا کتنا دشوار کام تھا، اس کا اندازہ مولانا میاں سید اصغر حسین رح کے مندرجہ ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے :-

"دیوبند میں خدا تعالیٰ کے مقبول اور سراپا اخلاص بندوں کی تجویز سے ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو ایک عربی مدرسہ کا اجراء ہوا، موجودہ زمانے کی طرح اس وقت جا بجا عربی مدارس جاری نہ تھے، مدرسہ جاری کرنا ایک ایسا اہم دشوار کام سمجھا جاتا تھا جس کا کسی کو خیال بھی نہ آتا تھا، اور اس کا جاری رہنا ایک امرِ محال نظر آتا تھا، مگر چونکہ معتقد علیہ بے لوث بزرگوں اور مشہور مقتدا حضرات کی تجویز تھی اور اہلِ شہر نیک نیت و صاحبِ دین تھے، سب نے امید سے بڑھ کر اعانت فرمائی، رفتہ رفتہ اطلاع عام ہوئی، مالی امداد اور طلبار کا رجوع یومًا فیومًا زائد ہوا، کارکن حضرات کی ہمت بندھی اور کام بحسنِ اُسلوب جاری رہا، جب طلبا، کی کثرت ہوئی اور مسجد (چھتہ) اور اس کے حجروں میں درس و تدریس اور قیامِ طلبار کی گنجائش دشوار ہو گئی تو ایک مکان متصل مسجد قاضی کرایہ پر لیا گیا ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء کے آخر میں مدرسہ کے لئے تعمیرِ مکان کی تجویز ہو کر انتظام اہتمام چندہ شروع ہوا اور ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۷ء میں مبارک ہاتھوں سے

وسیع پیمانے پر بنیاد رکھی گئی اور بتدریج ترقی پاکر بعونہٖ تعالیٰ آج ایک اسلامی یادگار اور مسلمانوں کے لئے قابلِ فخر عمارت موجود ہے" [۱]

قیام دار العلوم کے موقع پر اکابر دار العلوم کی جانب سے جو اعلان شائع کیا گیا اس میں لکھا ہے :-

"الحمد للہ کہ دیوبند میں اکثر اہلِ ہمت نے جمع ہو کر کسی قدر چندہ جمع کیا، اور ایک مدرسہ عربی پندرہ تاریخ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ سے جاری ہوا، اور مولوی محمد محمود صاحب بالفعل بمشاہرہ پندرہ روپے ماہوار پر مقرر ہوئے، چونکہ لیاقت مولوی صاحب کی بہت کچھ ہے اور تنخواہ بسبب قلت چندہ کے کم، ارادہ مہتمان مدرسہ کا ہے کہ بشرط وصول زر چندہ قابلِ اطمینان جس کی امید کر رکھی ہے تنخواہ مولوی صاحب کی زیادہ کی جاوے اور ایک مدرس فارسی و ریاضی کا مقرر ہو، جملہ اہلِ ہمت و خیر خواہانِ ہند خصوصاً مسلمانان سکنائے دیوبند و قرب و جوار دیوبند پر واضح ہو کہ جو لوگ اب تک شریک چندہ نہیں ہوئے، بدل شریک ہو کر امداد کافی دیویں

---

[۱] حیات شیخ الہند ص ۹ و ۱۰ شائع کردہ مکتبہ اصغریہ دیوبند ۱۳۶۷ھ ۱۹۴۸ء

اور واضح ہو کہ سوائے چندہ مفصلۂ فہرست ہذا کے کہ جس کی میزان ۱۰۴ روپے ہے، دوسرا چندہ واسطے خوراک و مدد و خرچ طلباء بیرونجات کے جمع ہوا ہے اور سولہ طالب علموں کا صَرف جمع ہو گیا ہے، اور انشاء اللہ روز بروز جمع ہوتا جاتا ہے، اس میں سے طلباء بیرونجات کو کھانا پکا پکایا اور مکان رہنے کو ملے گا، کتابوں کا بندوبست بھی متعاقب ہو گا۔ نام مہتمان درج ذیل ہیں۔ جن صاحبوں کو روپیہ چندہ بھیجنا منظور ہو تو بنام ان کے بذریعہ خط بیرنگ ارسال فرماویں، رسید اس کی بصیغۂ پیڈ بھیجی جاوے گی، فقط

حاجی عابد حسین صاحب — مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی
مولوی مہتاب علی صاحب — مولوی ذوالفقار علی صاحب
مولوی فضل الرحمٰن صاحب — منشی فضل حق صاحب
شیخ نہال احمد صاحب

العبد فضل حق سررشتہ کار مدرسۂ عربی و فارسی دریاضی

قصبہ دیوبند، تحریر تاریخ ۱۹ محرم الحرام سنہ ۱۲۸۳ھ

مدرسہ کے قیام پر ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ اس معمولی درس گاہ میں ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے طالبانِ علم جوق در جوق دینی علوم کی طلب و تحصیل کے لئے جمع ہو گئے، اور

مختلف رنگ و بُو کے پھولوں سے اس کا صحن معمور نظر آنے لگا، چنانچہ ۱۲۸۳ھ کے اختتام پر جو روداد شائع کی گئی اس میں لکھا ہے :-

" الحمدللہ کہ ۱۲۸۳ھ بخیریت تمام ہوا، یہ وہ مبارک سال ہے جس میں بناء مدرسہ عربی دیوبند قائم ہوئی اور اس عرصۂ قلیل میں اتنی رونق اور ترقی پکڑی کہ ہرگز امید نہ تھی، ابتداء میں خیال میں نہیں آتا تھا کہ اس قدر طلبار جمع ہوں گے، چندہ اور خرچ اتنا ہو جاوے گا، جمعیت چند تو درکنار لوگوں کو تامل تھا کہ پڑھنے والے عربی کے کہاں سے آویں گے، مگر عنایتِ الٰہی سے بفور شروع ہونے کے طالب علم اطراف و جوانب اور ممالک دور دراز سے ایسے جمع ہو گئے، کہ گویا منتظر بیٹھے ہوئے تھے، فقط قصبات ضلع سہارنپور و اضلاع ممالکِ مغربی کے طلبار ہی نہیں آئے بلکہ پنجاب و کابل و بنارس وغیرہ تک کے لوگ جمع ہو گئے اور چونکہ ان کے کھانے اور مکان وغیرہ کی طرف سے یہاں بالکل اطمینان رہا بفارغ بالی تمام تحصیل علم میں مصروف رہے۔

ابتدائے محرم ۱۲۸۳ھ میں تعداد طلبار ۲۱ تھی اور آخر ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ میں ۷۸ ہو گئے، منجملہ ان کے ۵۸ طلبار بیرونجات کے ہیں، جن میں سے ۵۲ طلبار کو

اہلِ دیوبند کی طرف سے کھانا ملتا ہے اور ۶ طلبار اپنے پاس سے کھاتے ہیں، ۵۲ طلبار کی خوراک کا اگر تخمینہ کیا جاوے تو بہت کچھ ہوتا ہے، اس پر پکا پکایا کھانا ملنا موجبِ زیادتی آسائش اور اطمینان کا ہے۔

ہر چند اہلِ دیوبند کا یہ خیال اور ارادہ ہر آئینہ قابلِ تحسین و آفریں ہے کہ انھوں نے باوجود کم استطاعتی کے محض براہِ نیک نیتی اور خیر خواہی اہلِ وطن کے بنار اس مدرسہ کی ڈالی اور طلبار بیرونی کا خرچ خوراک وغیرہ اپنے ذمہ لے کر ان کو کمالِ عزت سے رکھا اور شرکائے چندہ نقد نے نہایت خوشی اور اخلاص سے چندہ ۱۲۸۳ھ پیشگی دیا اور چندہ سالِ آئندہ بکمال کشادہ پیشانی دے رہے ہیں اور جن سے ہنوز چندہ ادا نہیں ہوا ان کو روز و شب تکرار ادا ہے، لیکن کمال شکر ہے ان صاحبوں غیر اہلِ دیوبند کا جنھوں نے اس کام کو محض مفید عام سمجھ کر خود شریک چندہ ہوئے اور لوگوں کو اس طرف راغب کیا فی الحقیقت یہ مدرسہ ظاہر میں اگرچہ خاص بمقام دیوبند معلوم ہوتا ہے لیکن فائدہ اس کا دور دراز تک پہنچتا ہے اس لئے امداد و اعانت اس کی جملہ اہلِ ہند پر واجب ہے، پس امید ہے کہ جو صاحب شریک ہوں چندہ

سنہ ۱۲۸۴ھ جلد عطا فرمادیں اور ترقی کاروبار اور زیادتی
خرچ مدرسہ پر نظر کرکے جہاں تک ممکن ہو زیادتی چندہ
کا فکر کریں اور اپنے احباب واقارب کو بھی شامل اس
کارِ خیر کے فرمادیں "۔

آگے چل کر لکھا ہے :-

اب ہم واسطے انکشاف حال ترقی مدرسہ جمع وخرچ چندہ
وانتظام خواندگی وامتحان، انعام سالانہ سنہ ۱۲۸۳ھ کی
مجملاً کیفیت لکھتے ہیں، اور خلاصہ اُن آئین کا بھی جو اس
سن میں بتقاضائے وقت جاری ہوئے درج رپورٹ
کرتے ہیں تاکہ شرکار کو فرحت اور سامعین کو رغبت
ہووے اور یقین ہوجاوے کہ چندہ کو نہایت امانت
وکفائت سے خرچ کیا ہے، اس سال میں ۶۴۹ روپے
چار آنے وصول ہوئے۔

تعلیمی کارگزاری کی نسبت لکھا ہے کہ :-

اس سال میں کارگزاری اور محنت مدرسین ہر آئینہ
قابلِ تعریف ہے، یہ ایک عمدہ نتیجہ حسنِ سعی مدرسان ہے
کہ بعض طلبا، جو میزان پڑھتے ہوئے داخل ہوئے تھے وہ
کافیہ پڑھتے ہیں اور چند متوسط الاستعداد قریب
فارغ تحصیل ہونے کے ہوگئے، مولوی محمد یعقوب صاحب

نانوتوی مدرس اور مولوی محمد محمود صاحب دیوبندی کی محنت اور توجہ کا شکر ہم پر واجب ہے کہ ان کی توجہ سے اس تھوڑے سے عرصے میں بہت کچھ ترقی تعداد اور استعداد ہوئی، دیگر مدرسان مولوی محمد فاضل و مولوی میر باز خاں و مولوی فتح محمد و حافظ احمد حسن نے بھی بہت سرگرمی سے اپنے کام کو انجام دیا[1]

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے ابتداً صرف مولوی محمود صاحب ایک مدرس تھے، مگر جلد ہی چند دوسرے مدرسین مقرر ہوئے، طلبا کی تعداد ۸۰ تک پہنچ گئی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کو صدارت تفویض کی گئی۔

تیرھویں صدی ہجری کے اواخر میں اسباب و وسائل کی قلت اور بے سروسامانی کے عالم میں بظاہر یہ ایک معمولی مدرسہ کا آغاز تھا مگر اس وقت ہندوستان کے مسلمان بالعموم جس ذہنی اور فکری زوال و انحطاط کا شکار ہو چکے تھے اور جس بری طرح ان کی سیاسی اجتماعیت کا شیرازہ بکھر چکا تھا، اس کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ محض ایک تعلیم گاہ کا قیام نہ تھا بلکہ درحقیقت ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا تھا، ۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب

---

[1] روداد ۱۲۸۳ھ ص ۱ و ۲

کے بعد مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے ملک میں جتنی بھی تحریکیں اٹھیں وہ سب دارالعلوم دیوبند کے بعد منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں، ہندوستان کے سابقہ دینی مدارس جو ایک ایک کرکے خزاں کی نذر ہو چکے تھے، ان کے بجائے دوسرے مدارس نئی آب و تاب کے ساتھ عالم وجود میں آگئے، اور ملک کا کوئی قابلِ ذکر گوشہ ایسا نہ رہا جہاں دینی علوم کا غلغلہ بلند نہ ہوا ہو۔

دارالعلوم دیوبند ایک ایسی دینی درس گاہ ہے جو اپنی ایک شاندار اور تابناک تاریخ رکھتی ہے، اس نے علوم دینیہ کی وہ عظیم الشان اور گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں جو تاریخ کے صفحات میں زرّیں حرفوں میں لکھے جانے کے لائق ہیں، اس نے علم دین کی راہیں ہموار کیں، تالیفات و تصنیفات کے ذریعے سے علوم دینیہ میں گراں قدر اضافے کئے ہیں، دہلی کے سقوط کے بعد یہی درس گاہ تھی جو مسلمانوں کی توجہات کا مرکز بنی۔ طالبانِ علم و عرفان اسی حظیرۃ القدس میں جمع ہوئے اور تشنگانِ علم نے اسی چشمۂ شیریں سے اپنی پیاس بجھائی۔

غرض کہ حکومت ختم ہو جانے پر مسلمانوں نے اپنی تمام مجبوریوں کے باوجود دینی تعلیم کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا، انھوں نے حکومت پر بھروسہ کئے بغیر خود اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا اور وہ دینی مدارس کے قیام کے لئے کمربستہ ہو گئے، اور حتی الامکان مدارس قائم کرنے

اور ان کو چلانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

ہندوستان میں برطانوی نظامِ تعلیم سے پہلے جو بکتی نظامِ تعلیم جاری تھا وہ فارسی اور ریاضی وغیرہ کی تعلیم پر مشتمل ہوتا تھا، اس دور کے مکتبوں میں مسلمان بچوں کے دوش بدوش ہندو بچے بھی عام طور پر تعلیم پاتے تھے، ابھی کچھ عرصہ پہلے تک معمّر ہندوؤں میں ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے ایسے مکتبوں میں اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمّذ طے کیا تھا، بعد میں جب برطانوی تعلیمی اسکیم کا رواج بڑھا اور ملازمتوں کے لئے سرکاری اسکولوں کی سند لازمی قرار دیدی گئی، جس کے نتیجے میں مکاتب کے تعلیم یافتہ سرکاری ملازمتوں سے محروم ہو گئے تو صدیوں کی یہ ملی جلی روایت بھی رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔

دارالعلوم کا قیام اگرچہ اسلامی علوم و فنون کے تحفّظ اور بقا کے لئے عمل میں آیا تھا مگر چونکہ اس وقت تک قدیم روایتی اور تہذیبی قدریں باقی تھیں اس لئے دارالعلوم کے ابتدائی دور میں اس کے فارسی و ریاضی کے درجات میں مسلمان بچّوں کے ساتھ ہندو بچے بھی پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں [1]

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے روداد دارالعلوم سنہ ۱۲۹۲ھ طبع دوم ص ۳۷، ۴۷ و روداد ۱۲۹۴ھ طبع دوم ص ۱۳ و ۲۰ روداد سنہ ۱۲۹۹ھ ص ۴۰ و روداد سنہ ۱۳۰۶ھ ص ۲۰، روداد سنہ ۱۳۰۷ھ ص ۱۹ وغیرہ

مَصارف کے حل کا ایک کامیاب تجربہ

اوپر گزر چکا ہے کہ دارالعلوم کو چلانے کے لئے عوامی چندے کا طریقہ اختیار کیا گیا، روداد میں لکھا ہے :-

"تمام مدارس اسلامیہ میں مدرسہ اسلامی دیوبند کو یہ عزت حاصل ہے کہ وہ سب سے پہلا چندے کا مدرسہ ہے، جو عین ایسے وقت میں قائم ہوا کہ جب تک عام قلوب نے ان کی ضرورت کو محسوس بھی نہ کیا تھا، حق تعالیٰ مغفرت فرمائے بانیانِ مدرسہ کی کہ انھوں نے اپنی فراستِ ایمانی سے اس آنے والے سیلاب کا اندازہ کر کے سب سے اول یہ سدِّ سکندری قائم کی"[1]

دارالعلوم دیوبند سے قبل مدارس کے قیام اور ان کے مصارف کا ذریعہ امراء و سلاطین ہوا کرتے تھے جو اس مقصد کے لئے بڑی بڑی جائیدادیں مخصوص کر دیتے تھے، جو طلباء و اساتذہ کے خورد و نوش اور دوسری ضروریاتِ زندگی کی کفیل ہوتی تھیں، مگر دارالعلوم کا قیام جس وقت عمل میں آیا تو امراء و سلاطین کا دور گزر چکا تھا، اس لئے

---

[1] روداد دارالعلوم ۱۳۲۵ھ ص ۶

دارالعلوم کے مقدس اکابر نے اس کے قیام کے لئے غریب عوام کی جانب دستِ اعانت بڑھایا، اُنھوں نے حکومت کی پشت پناہی کے بغیر صرف اپنے تعلقِ قلبی اور جذبۂ ایمانی کی بنیاد پر اس کی داغ بیل ڈالی۔

حضرت حاجی محمد عابد رحمۃ اللہ علیہ نے جو دیوبند کے ایک صاحب نسبت بزرگ تھے اور با اثر شخصیت رکھتے تھے، سب سے پہلے خود چندہ پیش کیا اور رومال کی جھولی بنا کر چندے کے لئے کھڑے ہو گئے[1] حضرت حاجی صاحبؒ بڑے اثر و وجاہت کے مالک تھے، شام تک تین سو روپے جمع ہو گئے۔[2]

منشی فضل حق صاحب نے سوانح مخطوط میں لکھا ہے کہ:۔

"حاجی محمد عابد صاحبؒ ایک دن بوقتِ اشراق سفید رومال کی جھولی بنا اور اس میں تین روپے اپنے پاس سے ڈال چھتہ کی مسجد سے تن تنہا مولوی مہتاب[3] علی صاحب کے پاس تشریف لائے، مولوی صاحب نے کمال کشادہ پیشانی سے چھ روپے عنایت کئے اور دعا کی

---

[1] سوانح قاسمی مولانا مناظر احسن گیلانیؒ جلد دوم ص ۲۵۸

[2] " " " " ص ۲۵۹

[3] مولانا مہتاب علی (وفات ۱۲۹۳ھ) مولانا ذوالفقار علیؒ کے بڑے بھائی تھے، تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں دیوبند کے خاص استادوں میں تھے، دیوبند کے رئیس شیخ کرامت حسین کے دیوان خانے میں جو مدرسہ قائم تھا (باقی ص ۳۳۲ پر)

بارہ روپے مولوی فضل الرحمٰن صاحب نے اور چھ روپے اس مسکین (منشی فضل حق مصنف سوانح مخطوطہ) نے دیے، وہاں سے اٹھ کر مولوی ذوالفقار علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آئے، مولوی صاحب ماشاء اللہ علم دوست ہیں فوراً بارہ روپے دیئے، اور حسن اتفاق سے اس وقت سید ذوالفقار علی ثانی دیوبندی وہاں موجود تھے، ان کی طرف سے بھی بارہ روپے عنایت کئے، وہاں سے اٹھ کر یہ درویش حضرت

(باقی حاشیہ ص۳۳۱) اس میں عربی پڑھاتے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی عربی تعلیم کا آغاز اسی مدرسہ سے ہوا تھا۔ دارالعلوم قائم کرنے کے لئے پہلا چندہ حاجی محمد عابد صاحب کا تھا اور دوسرا چندہ انہی مولانا مہتاب علی نے دیا تھا، قیام دارالعلوم کے بعد اس کی مجلس شوریٰ کے رکن قرار پائے، دارالعلوم کے سالانہ امتحانات میں انھیں ممتحن بنایا جاتا تھا۔ (روداد ہائے دارالعلوم دسوانح قاسمی ص ۶)

۱؎ دارالعلوم کی جانب سے سب سے پہلے چندے کی جو فہرست شائع ہوئی ہے اس میں مولانا ذوالفقار علیؒ کے چندے کی تعداد ۲۴ روپے درج ہے۔

(اشتہار مدرسہ عربی دیوبند مجریہ ۱۹ محرم ۱۲۸۳ھ)

۲؎ سید ذوالفقار علی۔ پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے، ان کی شاندار حویلی کے ایک حصے میں آج کل اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول جاری ہے، ان کے فرزند مولوی ممتاز علی نامور عالم گزرے ہیں، جن کا لاہور میں قیام رہا۔ تہذیب نسواں کے نام سے خواتین کا ایک ماہانہ رسالہ نکالتے تھے (باقی حاشیہ ص۳۳۳ پر)

(حاجی محمد عابد صاحب) محلہ ابوالبرکات پہنچے، دو سو روپے جمع ہو گئے اور شام تک تین سو روپے، پھر تو رفتہ رفتہ خوب چرچا ہوا اور جو پھل پھول اس کو لگے وہ ظاہر ہیں۔ یہ قصہ بروز جمعہ ماہ ذیقعدہ ۱۲۸۳ھ میں ہوا۔" [1]

۱۸۶۶ء

یہ قومی چندے کی پہلی تحریک تھی، حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ نے جو قیام دارالعلوم کی تحریک میں شروع سے شریک تھے، اس واقعے کو ذیل کے شعر میں بیان کیا ہے [2]

مردِ حق عابدِ صداقت کیش

اولاً گستر اندر و مالش!

قومی چندے کے ذریعے مدرسہ قائم کرنے کی تجویز نہ صرف دارالعلوم کے لئے بلکہ عام قومی اداروں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ مدرسے کے اخراجات کی کفالت کے لئے ان لوگوں کے تھوڑے تھوڑے چندے کو پسند کیا گیا جو ناموری نہ چاہتے ہوں اس قسم کے عام چندوں سے مدرسے کا چلانا اس وقت بالکل ایک نئی بات تھی۔ دارالعلوم کی اس مثال نے ملک کے لئے مشعلِ راہ کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۲) کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی ایک اہم کتاب البیان فی مقاصد القرآن ہے، اس میں قرآنی مضامین کی تبویب چار جلدوں میں کی گئی ہے، سید امتیاز علی تاج انھی مولوی سید ممتاز علی کے فرزند تھے۔

[2] سوانح قاسمی مولانا گیلانی جلد دوم ص ۲۵۸ و ۲۵۹

کام دیا، اجتماعی اور قومی کاموں کے لئے سرمایہ حاصل کرنے کا یہ پہلا تخیل تھا جو عملاً بہت کامیاب ثابت ہوا۔ اس "نسخہ کیمیا" کا ہاتھ آنا تھا کہ جابجا اس کی تقلید میں مدارس جاری ہونے شروع ہو گئے چنانچہ قیام دارالعلوم کے چھ سات ماہ کے بعد سہارنپور میں مظاہر علوم اسی اصول پر قائم ہوا، اور پھر رفتہ رفتہ جگہ جگہ مدارس جاری ہو گئے، عوامی چندے کی یہ کامیاب ترکیب ایسی عمدہ اور سہل تھی کہ ہر جگہ اس پر عمل کیا جا سکتا تھا، چنانچہ آگے چل کر یہ طریقہ اس قدر کامیاب اور مقبول ثابت ہوا کہ چند ہی سالوں میں مدارس عربیہ سے متجاوز ہو کر اسکولوں، کالجوں انجمنوں اور دوسرے اداروں تک عام ہو گیا، چنانچہ دارالعلوم کے قیام کے آٹھ نو سال کے بعد ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج (مسلم یونیورسٹی) بھی اسی طریقے پر قائم ہوا، اور پھر جوں جوں اس تجربے کا تجربہ عام ہوتا گیا لوگوں کی ہمتیں بڑھتی گئیں، اور آج بے شمار قومی اداروں کی بنیاد اسی طریقے پر قائم ہے۔

دارالعلوم سے پہلے اجتماعی طریق پر مدارس و انجمن قائم کرنے چندہ جمع کرنے، سالانہ روداد شائع کرنے اور عوام کو بصورت جلسہ جمع کر کے عملی نتائج دکھلانے کے طریقے سے لوگ واقف نہ تھے دارالعلوم نے یہ مثالیں پیش کر کے ملک اور قوم کے لئے ایک نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔

اکابرِ دارالعلوم نے عوامی چندے کا طریقہ ایجاد کرنے کی

جد وجہد کے ساتھ ساتھ توکّل علی اللہ اور تعلق مع اللہ کو بھی اس سلسلے میں خاص اہمیت دی ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحؒ نے اپنے اصولِ ہشتگانہ میں اس پر بطورِ خاص زور دیا ہے اور دفعہ ۶ میں ہدایت کی ہے کہ :-

"اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرطِ توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانۂ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہوجائے گی اور کارکنوں میں نزاع پیدا ہوجائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے"

دارالعلوم کا اعتمادِ خداوندی

عام طور پر کسی ادارے کے کاموں میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس کے آمد وصرف کی کوئی حد معیّن ہو۔ مگر دارالعلوم کا آغاز بظاہر جس بے سروسامانی کے ساتھ محض اللہ کے توکّل پر عمل میں آیا تھا، اور جو آج تک اس کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے، اُس کو دیکھتے ہوئے کسی مستقل دوامی آمدنی کے مقرر

ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دارالعلوم کی آمدنی میں ہمیشہ مدّ وجزر رہتا آیا ہے کبھی سال آمدنی، مصارف سے بڑھی رہی، اور کسی سال مصارف آمدنی سے بڑھے رہے، دارالعلوم اسی طور پر ابتدائے تاسیس سے اس وقت تک قائم ہے! کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دارالعلوم میں اتنی زیادہ آمدنی ہوئی ہو جس کو دیکھ کر منتظمین دارالعُلوم مطمئن ہو جائیں، اور نہ کبھی ایسی کمی ہوئی کہ آمدنی نہ ہونے سے دارالعلوم کے ضروری کام رُک جائیں۔

اس لئے بجٹ کے سلسلے میں قدرتاً روشِ عام سے ہٹ کر ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا، وہ یہ کہ آمدنی کا کوئی متوقع معیار مقرر کرکے اخراجات کو اس پر متفرّع کیا جائے۔

یہ چیز واقعات کی دنیا میں کتنی ہی عجیب اور حیرت انگیز کیوں نہ سمجھی جائے، مگر واقعہ یہی ہے کہ دارالعلوم کا بجٹ کسی مقررہ اور یقینی آمدنی نہ ہونے کے باوجود بنایا جاتا ہے، اور ہمیشہ آئندہ سال کے مصارف کا تخمینہ صرف حق تعالیٰ کے فضل وکرم اور مخلص معاونین کے اخلاص وللّٰہیت کی توقع پر مرتب کر لیا جاتا ہے

اس بنا پر یہ بجٹ اپنی نوعیت کے لحاظ سے قدرتاً مستقل آمدنی رکھنے والے اداروں اور سرکاری محکموں کے برعکس ہوتا ہے بجٹ کا عام بُنیادی اُصول یہ ہے کہ سالانہ آمدنی کے پیشِ نظر مصارف قائم کئے جائیں، اور اگر مصارف کی اہمیت کے سبب سے ایسا اضافہ

کرنا ناگزیر ہوجائے، جس کی وجہ سے مصارف، مداخل کے مقابلے میں زیادہ ہوجاتے ہوں تو جدید ٹیکس یا دوسرے مستقل ذرائع آمدنی قائم کرکے مداخل میں بقدرِ ضرورت ایسا اضافہ کیا جاتا ہے جس سے حسبِ ضرورت مصارف کی تکمیل کی جاسکے، مگر یہاں کی صورتِ حال بالکل جداگانہ ہے، دارالعلوم کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے، اور نہ کبھی اس کی ضرورت سمجھی گئی کہ دارالعلوم کے لئے مستقل آمدنی پیدا کرنے کی سعی کی جائے۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ جو دارالعلوم کی تاسیس کے زمانے سے اس کے شریک کار تھے، اس خصوصیت کی نسبت فرماتے ہیں:

اس کی بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کیلئے ؎ کوئی سرمایہ بھروسے کا ذرا ہوجائے گا
پھر یہ قندیلِ معلق اور توکل کا چراغ ؎ یہ سمجھ لینا کہ بے نور و ضیا ہوجائے گا[1]

اس لئے منتظمین دارالعلوم کی نظر وسائل و ذرائع کے بجائے ہمیشہ خالقِ کائنات کے فضل و کرم پر مرکوز رہی ہے، اور دراصل یہی وہ سرمایۂ توکل ہے جس کے اعتماد اور بھروسے پر بڑے بڑے کام دارالعلوم میں شروع کردیئے گئے اور وہ بفضلہ تعالیٰ بغیر کسی رکاوٹ کے پورے ہوگئے، دارالعلوم کے خزانے میں کسی وقت بھی اتنی رقم جمع نہیں رہتی جو دو تین ماہ کے مصارف کے لئے کفایت کرسکے، ادارالعلوم کے آمد و صرف کی بنیاد ہمیشہ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ

---

[1] القاسم دارالعلوم نمبر ص ۳۳ سنہ ۱۳۴۷ھ

کے مطابق توکل، اللہ سے حسنِ ظن، اعتمادِ خداوندی اور توقع پر قائم رہی ہے، دارالعلوم کی زندگی کی سوسالہ تاریخ اس کی گواہ ہے کہ اس میں آمدنی کی قلّت وکثرت پر کبھی نظر نہیں رکھی گئی، جس چیز کے اضافے یا جس کام کے اجراء کی ضرورت محسوس ہوئی توکلاً علی اللہ اُس کو شروع کر دیا گیا، اور یہ قدرتِ خداوندی کا کرشمہ ہے کہ دارالعلوم کو کبھی اپنے متوقع تخمینے کے پورا کرتے اور اپنے مقاصد وعزائم کی تکمیل میں شرمندۂ تعبیر اور مایوس وناکام نہیں ہونا پڑا۔

روداد دارالعلوم میں مذکور ہے کہ:۔

"دارالعلوم میں کبھی اس قدر کثیر آمدنی نہیں ہوئی جو پس انداز ہو سکے، یا ذمّہ دارانِ دارالعلوم اس پر مطمئن ہو جائیں، یہ اطمینان وتوکل بر اسباب دارالعلوم کے اساسی اصول کے بھی خلاف ہے، بسا اوقات قلّتِ سرمایے سے یا فقدانِ بشریت فکر پیدا ہو جاتا ہے تو دعا اور تحریک اسباب کے ذریعے اُدھر ہی رجوع کیا جاتا ہے، یہ وسیع کارخانہ محض خداوندِ عالم کے بھروسے پر جاری ہے، اور الحمدللہ کبھی اس کی نوبت نہیں آئی کہ اس کے ضروری کام قلّتِ آمدنی کی وجہ سے رک جائیں، ایسی حالت میں خدّامِ دارالعلوم کی نظر بجائے ذرائع آمدنی کے خداوندِ عالم کے لطف وکرم پر رہتی ہے، اور یہی وہ سرمایۂ توکّل ہے جس کے اعتماد پر

بڑے سے بڑا کام شروع کر دیا گیا اور وہ بلا رکاوٹ اس
کے فضل کرم سے پورا ہو گیا، دار العلوم کی سالانہ رودادیں
اس کی سب سے بڑی شہادت ہیں۔" [1]

اس سلسلے میں ہمیشہ اکابر دار العلوم کی یہ رائے رہی ہے کہ "دار العلوم
کی سالانہ آمدنی حقیقتاً بقدرِ مصارف ہوتی ہے، جس قدر مناسب اور
ضروری اخراجات میں اضافہ ہو جاتا ہے اسی نسبت سے آمدنی بڑھ جاتی
ہے۔ یہ وہ بات ہے جس کا بے شمار مرتبہ مشاہدہ ہو چکا ہے۔"

سنہ ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء کی مجلسِ شوریٰ میں اس وقت کے مہتمم دار العلوم
حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ نے اپنی ایک رپورٹ میں دار العلوم
کے اس تعامل پر مجلس کو توجہ دلاتے ہوئے تحریر فرمایا تھا:-

"کاروبارِ مدرسہ میں ابتدا سے اسبابِ ظاہر پر نظر نہ تھی
بلکہ اللہ کے فضل اور بھروسے پر نظر رہتی تھی، ہمیشہ مدرسہ
کی حاجات و ضروریات کو پورا کیا جاتا تھا؛ بوقتِ ضرورت
و استحقاق مدرسین کی ترقیات ہوتی تھیں، موافقِ دستورِ قدیم
اب بھی یہی طرز اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ بحمد اللہ ہماری
آمدنی ہمارے اخراجات کے تابع رہی ہے، جس قدر
اخراجاتِ ضروریہ حسبِ ضرورت مدرسہ اختیار کئے گئے
اسی قدر آمدنی میں ترقی ہو کر آمدنی خرچ کے لئے متکفی ہوتی
رہی ہے، ہمارے اخراجات تابع آمدنی نہیں بنائے گئے

---

[1] روداد دار العلوم ۱۳۵۲ھ ص ۲

چنانچہ اس دعویٰ کے لئے شاہدِ عدل زمانۂ سابق کا دستورالعمل ہے، جو بزرگوں کے توکّل کا پورا مظہر و منتظر بنا ہوا ہے پس جب کہ عادت اللہ ہمارے مدرسہ کے ساتھ اسی طرح قائم ہو چکی ہے جس کا تجربہ اور مشاہدہ ہے تو اس حالت میں اہلِ مدرسہ کو اپنی عادت، برخلاف عادت اللہ بدل کر مصداق ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم بن جانا مناسبِ شانِ عباد نہیں ہے۔"[1]

سنہ ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء کا یہ واقعہ ابھی لوگوں کی نظروں میں ہے جب کہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں اشیاءِ خورد و نوش کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہو جانے کی وجہ سے ملازمینِ دارالعلوم کی ضرورتوں کے پیشِ نظر گرانی کا الاؤنس دیا جانا تجویز ہوا جس کی مقدار بارہ ہزار روپے سالانہ تھی تو کارسازِ حقیقی نے یہ بیٹی سے جس نے اب تک دارالعلوم کی اعانت میں کبھی حصّہ نہیں لیا تھا، چودہ ہزار روپے کا انتظام فرما دیا، گویا دارالعلوم کو بارہ ہزار دے کر بھی دو ہزار بچ گئے، اسی سنہ میں طلباء کے وظائف میں اضافہ ہوا تو آمدنی بھی اسی تناسب سے بڑھ گئی۔

سنہ ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء کے بجٹ میں مصارف کا اندازہ ۷۷ ہزار روپے کیا گیا تھا، مگر دورانِ سال میں غیر معمولی گرانی بڑھ جانے کے سبب سے

---

[1] رپورٹ اہتمام روئیداد سنہ ۱۳۶۱ھ

جب مصارف میں غیر معمولی اضافہ ہوا تو آمدنی بھی ڈھائی لاکھ تک پہنچ گئی اس سے قبل دار العلوم کو کبھی اتنی آمدنی نہیں ہوئی تھی، دُنیا جب کہ جنگ کے اقتصادی مصائب میں گرفتار تھی دار العلوم بحمد اللہ ان مصائب سے مامون و محفوظ رہ کر اپنی روایتی رفتار کے مطابق ترقی کی جانب گامزن تھا۔ یہ سب کچھ کیوں تھا؟ اور کون سی وہ طاقت تھی جو اس نظام کے چلانے کی ذمہ دار بنی ہوئی تھی؟ اس انکشاف کے لئے ذیل کا واقعہ سنئے! حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم نے رجب ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء کے جلسۂ تقسیم انعام میں اپنے زمانۂ اہتمام کا جو تجربہ بیان کیا وہ حضرت ممدوح کے الفاظ میں یہ ہے:-

"مجھے اپنے ۲۵، ۲۶ سال کے زمانۂ اہتمام کا جو تجربہ ہے اس میں یہ چیز نہایت شدّت کے ساتھ مجھے محسوس ہوتی رہی ہے کہ کوئی غیبی طاقت ہے جو اس ادارے کو چلا رہی ہے اور اس کا دار و مدار ظاہری جد و جہد سے بالاتر کسی غیبی قوت پر ہے جو اس کو تھامے ہوئے ہے، گو ہمارے اندر بہت سی خامیاں ہیں، مگر اکابر کا فیض ہے کہ کام برابر چل رہا ہے، عدمِ اعتنا، دین کے اس دور میں جب کہ علوم دینیہ سے شدید بُعد پیدا ہو چکا ہے، اس دار العلوم کا نہ صرف قائم رہنا بلکہ ترقی کرتے رہنا بلا شبہ اس کی علامت ہے کہ یہ من جانب اللہ قائم ہے! چنانچہ جب

کبھی مخالفین کی جانب سے ایسی سعی کی گئی کہ چندہ نہ آئے تو اُس سال میں چندہ فسبۃً زیادہ ہی آیا، اور مخالفین کو اپنے مقصد میں شرمندگی اٹھانی پڑی، یہ واقعہ ہے کہ اس دورِ پُرفتن میں دارالعلوم کا قائم رہنا اسباب کے درجے میں نہیں ہے بلکہ غیبی امداد و اعانت پر ہے، جو اس کو چلا رہی ہے، غالباً ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے، اور یہ میرے اہتمام کا پہلا سال تھا، مولوی گل محمد خاں صاحب جو خزانے کے تحویل دار تھے اور تنخواہ کی تقسیم کا کام اُن سے متعلق تھا رجب کی آخری تاریخ میں میرے پاس آئے اور بتلایا کہ خزانے میں ایک پائی نہیں ہے اور پرسوں کو ڈھائی ہزار روپے تنخواہ کا تقسیم کرنا ہے۔ میں نے کہا۔ اس میں فکر کی کیا بات ہے! جس کا کام ہے وہ خود چلائے گا، اُن کو رُخصت کر کے میں نے حضراتِ مدرسین کو بُلا کر دریافت کیا کہ آپ دارالعلوم میں کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ اور کیا مقصد ہے؟ آیا دین کی خدمت مقصود ہے، یا تنخواہ حاصل کرنا؟ سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ "ہمارا مقصد اُس امانت کی خدمت ہے جو اکابر نے ہمیں سونپی ہے، حاشا و کلا تنخواہ پر کبھی ہماری نظر نہیں رہی!" میں نے کہا اگر تنخواہ نہ ملے تو آپ کیا کریں گے؟ جواب دیا کہ "فاقے

کریں گے اور پڑھائیں گے"۔ میں نے کہا، الحمد للہ آپ مطمئن رہیں دار العلوم بھی انشاء اللہ چلے گا اور آپ کی تنخواہ بھی ملتی رہے گی! خزانے میں اس وقت ایک پیسہ نہیں ہے دعا کیجئے کہ اکابر کی اس امانت کے باقی رکھنے میں اللہ تعالیٰ ہمیں رسوائی سے بچائے۔

سب نے مل کر خضوع و خشوع کے ساتھ دُعا کی، جس کا اگلے ہی دن یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ ابھی تنخواہ کی تقسیم کا وقت بھی نہ آیا تھا کہ حق تعالیٰ نے ڈھائی ہزار روپے بھیج دیے دو ہزار کلکتہ کے ایک تاجر نے بمبے سے بھیجے تھے، اور پانچ سو میرٹھ کے ایک مشہور آرمی کنٹریکٹر خاں صاحب رشید احمد خاں صاحب نے خود دار العلوم میں تشریف لاکر عطا فرمائے۔

غرض کہ دار العلوم کی بنا رکھی غیبی اُمور کے اوپر ہے اور کاموں کا انصرام بھی من جانب اللہ ظہور پذیر ہوتا ہے اور اس طرح دار العلوم اپنی ترقیات کے ساتھ روز بروز آگے بڑھ رہا ہے" [1]

دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں جب غلّہ کی دستیابی کے مسئلے نے

---

[1] روئیداد جلسہ تقسیم انعام رجب ۱۳۶۶ھ ہجری۔

پیچیدہ صورت اختیار کی تو دار العلوم کی سال بھر کی غذائی ضرورت کے لئے ریاست بھاول پور سے ہر سال پانچ ہزار من غلہ آنا شروع ہو گیا، ملک کی تقسیم کے بعد جب ہندوستان و پاکستان کی کرنسی میں تفاوت پیدا ہوا تو بھاولپور سے (جو پاکستان میں واقع ہے) غلے کی آمد میں رکاوٹ پیدا ہو گئی، مگر فوراً ہی اس کا یہ حل نکل آیا کہ قرب و جوار کے اضلاع سے غلے کی فراہمی شروع ہو گئی، اور بحمداللہ ہر سال اتنا غلہ دار العلوم کو مہیا ہونے لگا جو فراغت کے ساتھ اس کی سال بھر کی ضرورت کے لئے کافی ہو جاتا ہے، زراعت پیشہ طبقے میں دار العلوم کی امداد و اعانت ایک ایسی سعادت سمجھی جاتی ہے جس کے حصول کی تمنا ہر مسلمان کے دل میں پائی جانی ضروری ہے۔

یہ واقعات بتلاتے ہیں کہ مشیتِ الٰہی ہمیشہ دار العلوم دیوبند کی تائید و اعانت کرتی رہی ہے اور وہ اتنی طاقت ور ہے کہ اسباب و ذرائع کی محتاج نہیں ہے بلکہ ان پر متصرف ہے۔

بظاہر یہ واقعات بڑے حیرت انگیز اور محیر العقول معلوم ہوتے ہیں، مگر یہ اوقات قدرتِ خداوندی ایسی ایسی راہوں سے کام بنا دیتی ہے جہاں عام حالات میں ہر کس و ناکس کا وہم و گمان بھی نہیں جا سکتا دار العلوم کی تاریخ کا یہ بڑا عجیب اور حیرت انگیز باب ہے، مگر کسی حقیقت کو محض اس وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حیرت انگیز ہے، محیر العقول واقعات کم و بیش ہر شخص کی زندگی میں دیکھنے میں آتے ہیں

اور ہم اُن پر اس لئے یقین کر لیتے ہیں کہ ہمارا مشاہدہ ہوتا ہے

سو سال سے بھی زیادہ سے دار العلوم کا سارا کاروبار اللہ کے توکل پر اسی طرح سے چل رہا ہے، بجٹ میں جو تخمینی آمد و خرچ رکھا جاتا ہے وہ نہ صرف پورا ہی ہوتا رہا ہے بلکہ ایک ایسے عمدہ توازن کے ساتھ پورا ہو جاتا ہے جو ایک کامیاب بجٹ کے لئے اچھی کامیابی کا نشان سمجھا جاتا ہے، دار العلوم کی روایات کے تحت اس کا متوکلانہ بجٹ ہمیشہ خرچ کے معیار سے بنتا ہے، نہ کہ آمدنی کے معیار سے آمدنی دار العلوم میں عموماً خرچ کے تابع رہی ہے، مقررہ خرچ ہی اپنی مقدار کی حد تک آمدنی کو کھینچ لاتا ہے، جیسا کہ اب تک کی روایات اس کی گواہ ہیں، جو ضرورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں، مسبب الاسباب اُن کی تکمیل کا سامان پیدا فرما دیتا ہے، گویا دار العلوم کا سب سے بڑا سرمایہ توکل علی اللہ اور صبر و استقامت کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول رہنا اور اپنی ہر قسم کی ضرورتوں کے لئے اسباب ظاہر سے بے نیاز ہو کر خدا تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرنا ہے۔

غرض کہ دار العلوم کے آمد و خرچ کے سلسلے میں شروع ہی سے اکابر دار العلوم کی نظر مادی اسباب و وسائل سے زیادہ قادر مطلق کے لطف و کرم اور کارسازِ حقیقی کے توکل و اعتماد پر رہی ہے، جس کی صراحت دستورِ ہشتگانہ میں موجود ہے، چنانچہ دار العلوم کی سو سال سے زائد تاریخ اس پر گواہ ہے کہ حق تعالیٰ کا اس کے

ساتھ ایک خاص طرح کا معاملہ رہا ہے جو ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کیلئے ناقابلِ فہم و یقین ہو، مگر جن لوگوں نے ان واقعات کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا ہے وہ کیوں کر انکار کر سکتے ہیں۔

جو لوگ صرف اسباب و وسائل پر نظر رکھتے ہیں ان کے نزدیک عالم اسباب میں جو کچھ ہے وہ محض اسباب و علل کے نتائج ہیں۔ دار العلوم کی ترقی میں ایسے لوگوں کے لئے بھی اطمینان کی وجوہ موجود ہیں، اور چونکہ مسلمانوں کو ابھی بہت سے مدارس قائم کرنے کی ضرورت ہے اس لئے ترقی کے اسبابِ ظاہری بیان کرنا بھی فائدے سے خالی نہیں ہے، دار العلوم کے حالات پر غور کرنے سے من جملہ اور بہت سے اسباب کے یہ چند اُمور زیادہ اہم معلوم ہوتے ہیں :-

(۱) مجموعی طور پر اُن سب حضرات میں جو دار العلوم کی بنا و تاسیس قیام اور اس کے کاموں کو جاری رکھنے میں شریک رہے اُن میں خلوص و للّٰہیت ایثار و ہمدردی کا ایسا بے پناہ جذبہ موجود تھا جس نے ہر قسم کے وقتی اور ہنگامی موانع و حوادثات اور مشکلات کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا اور راستے کے تمام سنگ ہائے گراں کو ہٹا کر دار العلوم کو آگے بڑھنے کا موقع بہم پہنچایا، آمدنی کا انحصار غریب عوام کے چندوں پر رکھا۔ جنھوں نے دار العلوم کی امانت کو اپنی سعادت سمجھا

(۲) دار العلوم نے قوم سے جو رقم چندے کے طور پر وصول کی اس کو نہایت احتیاط اور امانت و دیانت سے صرف کیا، اس کا باقاعدہ

حساب رکھا گیا اور سالانہ روداد کے ذریعے سے دارالعلوم کی مالی حالت اور تعلیمی نتائج سے قوم کو باخبر رکھا گیا، نیز اسی کے ساتھ مالی حسابات اور تعلیمی کارگزاری کی جانچ پڑتال کا موقع ہر مسلمان کو بہم پہنچایا گیا، دارالعلوم کے اس طرزِ عمل سے قوم کے دل میں اس کی جانب سے پورا پورا اطمینان اور اعتماد قائم ہوگیا۔

(۳) طلباء کے تعلیمی نتائج کی عمدگی بھی چندہ دہندگان کے لئے امید افزا ثابت ہوئی، اور انھوں نے پورے طور پر محسوس کرلیا کہ ان کا چندہ نہایت اعلیٰ مقاصد کے حصول میں صرف ہو رہا ہے۔

(۴) دارالعلوم کے قیام و بقا اور ترقی کے اسباب میں دیوبند کے اہلِ خیر مسلمانوں کی توجہات کو بھی بڑا دخل ہے، یہاں کے اہل خیر لوگوں نے شروع سے لے کر اب تک بیرونی طلباء کے قیام و طعام اور دوسری ضروریات میں دامے، درمے اور سخنے امداد و اعانت میں جس کمالِ فیاضی سے حصّہ لیا وہ بھی بڑی حد تک دارالعلوم کی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوا۔

(۵) اس سلسلے میں یہ بات بھی فراموش نہیں کی جانی چاہیے کہ دارالعلوم کے اساتذہ اور کارکنوں نے اپنی خدمات کا مناسب معاوضہ لینے میں ہمیشہ ایثار اور قربانی سے کام لیا ہے، انھوں نے دارالعلوم کے کام کو ہمیشہ دین کی خدمت سمجھا، سادہ اور غریبانہ زندگی بسر کی، اپنی خدمات کو دارالعلوم کے لئے وقف اور اپنے راحت و آرام کو اس پر قربان

کرتے رہے مگر دارالعلوم کے مالیہ پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنا گوارہ نہیں کیا، یہ حضرات تھوڑی تنخواہوں پر قناعت کرتے رہے، اس کا اندازہ اس وقت کی تنخواہوں سے ہوسکتا ہے دارالعلوم کے سب سے پہلے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم میں سب ڈپٹی انسپکٹر رہ چکے تھے، دارالعلوم میں ابتداءً اُن کا مشاہرہ صرف ۱۵ روپے ماہانہ تھا، مولانا محمد یعقوبؒ کی یہ مثال دوسرے لوگوں کے لئے رہنما ثابت ہوئی

دارالعلوم کے ہندو معاونین

اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ دارالعلوم کے ابتدائی درجات میں مسلمان بچوں کے دوش بدوش ہندو بچے بھی زیر تعلیم رہتے تھے، دارالعلوم میں جن قواعد پر عمل رہا ہے اُن میں سب سے پہلی دفعہ یہ ہے:-

"چندے کی کوئی مقدار نہیں اور نہ خصوصیت مذہب و ملت ہے"

اس بنا پر دارالعلوم میں غیر مسلموں کا چندہ بھی مسلمانوں کے چندے کی طرح ہمیشہ بے تکلفی سے قبول کیا جاتا رہا ہے۔

چنانچہ روداد ہائے دارالعلوم میں چندہ دہندگان کی فہرست میں جابجا ہندوؤں کے چندے بھی درج ہیں، ابتدائی سالوں کی رودادوں میں تو اکثر ہندو چندہ دینے والوں کے نام نظر آتے ہیں، مگر درمیانی اور آخری سالوں میں بھی کہیں کہیں ہندوؤں کے نام مل جاتے ہیں، اگرچہ

دارالعلوم کے چندے کو مذہب و ملّت کی تخصیص سے مبرّا رکھا گیا ہے مگر حکومت کی امداد کبھی قبول نہیں کی گئی، اس بارے میں حضرت نانوتویؒ کی اس بنیادی ہدایت پر عمل کیا گیا ہے کہ :-

"سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے" [1]

چنانچہ برطانوی دورِ حکومت میں بارہا ایسے مواقع پیش آئے، مگر دارالعلوم کے اکابر اپنی روایات پر سختی کے ساتھ قائم رہے، ۱۹۵۷ء / ۱۳۷۷ھ میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد جب دارالعلوم میں آئے تو انھوں نے دارالعلوم کی عظیم علمی خدمات کے پیش نظر اس خیال کا اظہار کیا کہ وہ حکومت کی جانب سے دارالعلوم کو ایک گرانقدر امداد دینا چاہتے ہیں، مگر دارالعلوم کی جانب سے سابقہ روایات کے مطابق شکریے کے ساتھ معذرت کر دی گئی، مگر جب صدر جمہوریہ نے اپنی ذات سے ایک ہزار روپے دینے چاہے تو ان کو خوشی سے قبول کر لیا گیا [2]

۱۸۷۰ء / ۱۲۸۷ھ میں جب کتابوں کی ضرورت کے لئے دارالعلوم کی جانب سے اہلِ مطابع کے نام اپیل کی گئی تو اس باب میں پیش قدمی کرنے کی سعادت ہندوستان کے مشہور ناشر منشی نول کشور [3] کو حاصل

---

[1] اصول ہشتگانہ دفعہ ۷۔ [2] صدر جمہوریہ ہند دارالعلوم دیوبند میں ص ۳۱

[3] آں جہانی منشی نول کشور ۱۸۳۶ء / ۱۲۵۲ھ میں متھرا کے قریب ایک گاؤں کے برہمن خاندان میں پیدا ہوئے، انھوں نے لاہور کے ایک پریس کوہ نور میں (باقی ص ۳۵۰ پر)

ہوئی ، منشی صاحب جب تک بقیدِ حیات رہے دارالعلوم کی روداد وں میں ان کی کتابی امدادوں کا بار بار تذکرہ کیا گیا ہے ، ۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۰ء کی روداد میں تحریر ہے :-

---

(بقیہ صفحہ گزشتہ) طباعت کے کام کی تربیت حاصل کی ، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز انقلاب کے بعد لکھنؤ میں اپنا مشہور پریس قائم کیا ، ہندوستان میں پریس کا یہ ابتدائی دور تھا ، فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کے بیان کے مطابق ممالک مغربی وشمالی میں سب سے پہلا لیتھوگراف مطبع ۱۸۳۷ء / ۱۲۵۳ھ میں دہلی میں قائم ہوا ، اور ۱۸۵۲ء / ۱۲۶۹ھ تک ۳۴ مطابع جاری ہو چکے تھے۔

(ترجمہ خطبات گارساں دتاسی ص ۱۷۸ مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی)

طباعت واشاعت کے لحاظ سے نول کشور پریس ہندوستان کا بہت مشہور مطبع ہے منشی نول کشور نے اردو ، فارسی ، عربی اور سنسکرت کے فاضل اہلِ قلم کے ذریعے اردو میں تصنیف وترجمے کا کام بڑے پیمانے پر انجام دیا ، اسی کے ساتھ وہ بڑی فیاضی سے علمی اور مذہبی اداروں کی امداد میں حصّہ لیتے تھے ، ان کے یہاں مذہب وملّت کی تفریق نہ تھی ، ہندوؤں کے پاٹھ شالے ، عیسائیوں کے اسکول اور مسلمانوں کے ادارے سب ہی ان کی علم دوستی سے فیض یاب ہوئے ، وہ سب کو اپنے مطبع کی کتابیں عطیے کے طور پر دیتے رہتے تھے۔

دارالعلوم کے آغاز ہی میں انھوں نے اپنی مطبوعات بھیجنی شروع کر دی تھیں اُن کے پریس سے سب سے پہلے جو کتابیں دارالعلوم کے کتب خانہ میں داخل ہوئیں (باقی ص ۳۵۱ پر)

"منشی نول کشور صاحب مالک چھاپہ خانۂ اعظم مقام لکھنؤ اس امر میں زیادہ قابلِ مشکوری ہیں کہ باوجود بُعدِ مسافت بہت سی کتب کارآمد سے معاونت کی، روداد میں ان کتابوں کی تفصیل یہ دی گئی ہے :-

مظاہر حق چہار جلد، مختصر المعانی، فتوح الشام عربی قطبی، میر قطبی، تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار، طب اکبر فلاح دارین، تحفۃ الاحبار، احکام تحریم النساء، ترجمہ تکمیل الایمان، قصہ گلاب چنبیلی، مذاق العارفین ترجمہ احیاء العلوم غزالی رح[1]"

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ان میں درسِ نظامی کی مختلف کتابوں کے علاوہ حدیث میں مظاہر حق اور مشارق الانوار کا اردو ترجمہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، منشی نول کشور کی زندگی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

اردو کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت کی بے شمار کتابیں نول کشور پریس میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں، درسِ نظامی کی جملہ کتابیں ان کے پریس میں چھپتی تھیں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ منشی نول کشور قرآن شریف کی طباعت میں ادب و احترام کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔

۱۹ فروری ۱۸۹۵ء / ۱۳۱۳ھ کو ۵۹ برس کی عمر میں منشی نول کشور نے لکھنؤ میں انتقال کیا۔

---

[1] روداد ۱۲۸۷ھ ص ۳ و ۶۰

۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء کی روداد میں منشی نول کشور اور راؤ امر سنگھ کے اخبارات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"جناب منشی نول کشور مالک "اودھ اخبار" لکھنؤ، اور جناب راؤ امر سنگھ صاحب مالک اخبار "سفیر" بڈھانہ کا بالخصوص شکریہ کہ باوجودیکہ یہ دونوں صاحب اہلِ ہنود سے ہیں مگر آفریں صد ہزار آفریں ان کی سخاوت اور اعانت پر کہ اپنے اپنے اخبارات گراں بہا اس مدرسہ کو مفت عنایت فرماتے ہیں، جملہ اربابِ شوریٰ مدرسہ ہذا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں، اور سب صاحبوں کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان کے اخبارات اور کارخانہ جات کو دمبدم ترقی عطا فرماوے، اور ان کی قوت اور آزادی کو قائم رکھے، اور آئندہ کو بھی حضرات موصوف سے امید کی جاتی ہے کہ اسی طرح پر ہمیشہ کو ایسی ہی عنایات سے اس مدرسہ کو ممنون و مشکور فرماتے رہیں اور جملہ اہالیانِ مدرسہ ہذا کو اپنا دعاگو و خیر خواہ سمجھیں"۔[1]

اوپر جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ذمہ دارانِ دارالعلوم نے عالمِ اسباب سے قطع نظر کرکے تکثیرِ چندے کے لئے کبھی کوئی جد و جہد نہیں کی، دارالعلوم کے اصولِ ہشتگانہ کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ:-

"تا مقدور کارکنانِ مدرسہ کو ہمیشہ تکثیرِ چندے پر نظر رہے

---

[1] روداد ۱۲۹۴ھ ص ۲۳

آپ کوشش کریں، دوسروں سے کرائیں، خیر اندیشانِ مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے "

چنانچہ ابتدا ہی سے سالانہ شائع ہونے والی رودادوں کے ذریعے سے دارالعلوم کی ضرورتوں کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جاتا رہا ہے، اس کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی توجہ دلائی جاتی رہی ہے، کچھ برسوں سے دارالعلوم میں ایک مستقل شعبہ تنظیم و ترقی کے نام سے تحصیلِ چندے کا کام انجام دیتا ہے ؎

ہے کوشش کرام سے، امیدِ فتح یاب
اور فضلِ ایزدی سے، یقینِ کشود کار

دارالعلوم کی آمدنی میں مدّ و جزر بھی رہتا ہے، کبھی آمدنی بڑھ جاتی ہے اور کبھی صرف میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات زیرِ تعمیر عمارت کو قلّتِ سرمایہ کی وجہ سے روک دینا بھی پڑتا ہے، مگر اس کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دارالعلوم کے کاموں اور اس کی ترقی میں ایسا اختلال پیدا ہو گیا ہو جس کی وجہ سے اس کے کام مستقل طور پر رک جائیں۔

بلکہ دارالعلوم کے سالانہ بجٹ میں سال بسال اضافہ ہوتا جاتا ہے، اور اضافے کے بقدر اسی رفتار سے آمدنی بھی بڑھتی رہتی ہے، مندرجہ ذیل نقشے سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سن	متوقع بجٹ	آمدنی	کمی	بیشی
سنہ ۱۳۸۰ھ	۵۸۸۶۵۰/۰۰	۵۹۷۱۲۵/۱۵	×	۸۴۷۵/۱۵
سنہ ۱۳۸۱ھ	۶۴۶۴۵۰/۰۰	۶۲۸۴۷۰/۲۲	۱۷۹۷۹/۷۸	×
سنہ ۱۳۸۲ھ	۶۷۸۹۵۰/۰۰	۶۸۷۲۲۶/۱۹	×	۸۲۷۶/۱۹
سنہ ۱۳۸۳ھ	۷۳۷۵۰۰/۰۰	۷۰۳۶۹۵/۹۴	۳۳۹۰۴/۰۶	×
سنہ ۱۳۸۴ھ	۷۴۰۰۰۰/۰۰	۸۰۸۶۸۰/۶۵	×	۶۸۶۸۰/۶۵
سنہ ۱۳۸۵ھ	۹۰۰۰۰۰/۰۰	۹۴۳۳۶۴/۵۴	×	۴۳۳۶۴/۵۴
سنہ ۱۳۸۶ھ	۱۰۰۰۰۰۰/۰۰	۹۰۷۰۲۱/۳۳	۹۲۹۷۸/۶۷	×
سنہ ۱۳۸۷ھ	۹۹۱۱۰۰/۰۰	۱۰۲۷۵۱۱/۴۲	×	۳۶۴۱۱/۴۲
سنہ ۱۳۸۸ھ	۱۰۴۳۶۰۰/۰۰	۱۰۲۰۹۱۶/۴۸	۲۲۶۸۳/۵۲	×
سنہ ۱۳۸۹ھ	۱۱۹۸۷۵۰/۰۰	۱۲۷۵۷۷۳/۳۰	×	۷۶۸۹۸/۳۰
		۱,۶۷,۵۴۶/۰۳		۲,۴۲,۱۰۶/۲۵

اعداد و شمار کے مذکورۂ بالا دس سالہ نقشے سے واضح ہے کہ چھ سالوں کے متوقع بجٹ میں ۰۳ — ۵۴۶ ,۱۶۷ کی کمی رہی، مگر دوسرے چار سالوں میں متوقع بجٹ سے ۲۵ — ۱۰۶ ,۴۲ ,۲ روپے کی زائد آمدنی ہوئی، گویا مجموعی طور پر ان دس سالوں میں ۲۲ — ۴۵۶۰ ۷ روپے زیادہ آئے، اس رقم کو اگر دس سالوں میں تقسیم کیا جائے تو اوسطاً ۰۲ — ۴۵۶ ۷ روپے سالانہ متوقع بجٹ سے زائد کی آمدنی ہوئی۔

سال بسال بجٹ اور طلباء کی تعداد میں اضافے سے معلوم ہوتا ہے کہ چندہ دہندگان اور طلباء کی دل چسپی میں کوئی کمی نہیں آئی، اور دونوں طبقے اپنی اپنی جگہ دارالعلوم کی ترقی میں دل چسپی لیتے رہے ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء سے ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء تک دارالعلوم کی مجموعی آمدنی ایک کروڑ ۸ لاکھ ۳۱ ہزار ۵۶۷ روپے اور مجموعی خرچ ایک کروڑ ۸ لاکھ ۴۶ ہزار ۹۴۷ روپے ہے۔

اہلِ دیوبند کی طلباء نوازی

اہل دیوبند نے دارالعلوم کی تحریک کا اپنے عدم تمول کے باوجود جس گرم جوشی سے استقبال کیا اس کا اعتراف نہ کرنا بہت بڑی ناانصافی ہوگی، پہلے سال میں ۵۸ بیرونی طلباء میں صرف ۶ طالب علم ایسے تھے جو خود اپنے اخراجات کا تکفل کر سکتے تھے، بقیہ ۵۲ طلباء کے خورونوش اور قیام وغیرہ کا تمام تر بار اہل دیوبند نے بخندہ پیشانی برداشت کیا سبقت الی الخیر کا یہ عمل بالیقین ان لوگوں کو "السابقون الاولون" کے شرف سے ممتاز کرتا ہے۔

دیوبند میں شیوخ اور سادات مسلمانوں کے سرآوردہ خاندان ہیں جو اپنی خاندانی شرافت کے علاوہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب تک دولت و تمول کے لحاظ سے بھی فائق اور ممتاز تھے، اگرچہ اس انقلاب کے

بعد ان کی مالی حالت نہایت زبوں اور خستہ ہوگئی تھی، مگر اس کے باوجود نہ صرف انھوں نے بلکہ دیوبند کے مسلمانوں کے ہر طبقے و برادری کے لوگوں نے دار العلوم کا یکساں گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا، اور ہر شخص نے اپنی بساط سے بڑھ کر دار العلوم اور طلبا، کی امداد میں حصّہ لیا۔

اور یہ کوئی وقتی جذبہ نہیں تھا بلکہ آج بھی باشندگانِ دیوبند اپنی اس دیرینہ خصوصیت میں پیچھے نہیں ہیں، چنانچہ ہر سال تقریباً دو ڈھائی سو طلبا، شہر کی مساجد اور دوسرے مقامات میں مقیم رہتے ہیں، ان کے قیام و طعام کا تکفّل دیوبند کے غریب مسلمانوں کی علم دوستی اور طلبا، نوازی کا ایک ایسا ثبوت ہے جسے مسلمانوں کی علمی تاریخ میں فراموش نہیں کیا جا سکتا، اس بارے میں دیوبند کے لوگوں کا طرزِ عمل نہایت مخلصانہ رہا ہے، اُن کا یہ ایثار صرف فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی حد تک محدود نہیں رہا بلکہ اس میں مادرانہ محبت اور پدرانہ شفقت بھی شامل تھی، حضرت مولانا محمد قاسم نور اللہ مرقدہٗ نے تقسیم اسناد کے ایک جلسہ میں باشندگانِ دیوبند کے ایثار و قربانی کی تعریف کرتے ہوئے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ :-

"سب دور و نزدیک کے رہنے والے جانتے ہوں گے کہ اس مدرسہ کی بنا دیوبند والوں نے ڈالی، اس امر میں وہ سب کے امام ہیں، ہر چند باہر کے صاحب اس کارِ خیر میں شریک

ہوئے مگر جو کچھ ہے وہ دیوبند والوں کا ہی طفیل ہے، اور اس وجہ سے اگر یوں کہا جائے کہ جتنا اور سب کو اس کارِ خیر کا ثواب ملے گا اتنا ہی تنہا دیوبند والوں کو ملے گا، تو عین مطابق قولِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم من سنّ بالسنّۃ حسنۃ فلہ اجرھا واجر من عمل بھا الیٰ یوم القیٰمۃ او کما قال ہوگا، واقعی اہلِ دیوبند نے وہ کام کیا ہے کہ قیامت تک صفحۂ روزگار پر ان کی یادگار رہے گی، یہ نامی مدرسہ ہمیشہ ہمیشہ اہلِ دیوبند کی یادگاری کا باعث رہے گا، چونکہ اور اکثر مدارس اس مدرسہ کی دیکھا بھالی مقرر کئے گئے ہیں یا کئے جاتے ہیں تو کوئی مدرسہ اس سے ترقی کرجائے پر اہلِ عقل کے نزدیک وہ دیوبند ہی کا پرتو ہوگا، اور اس پر جب یہاں کے باشندوں کی شکستہ حالی اور پریشان روزگاری پر نظر کی جائے تو یہ ان کی ہمت کی بات کسی طرح ان کاموں سے کم نہیں جو اہلِ سلطنت نے برفاہِ عام کئے ہیں، بایں ہمہ کھانے کی امداد میں طالب علموں کے ساتھ جو دل سوزی یہاں کے باشندوں نے کی وہ اتنی نہیں کہ ہم زبان سے ادا کریں، فرشتوں نے اگر طالبانِ علوم کے قدم کے نیچے پر بچھائے تو انھوں نے ان کے سر پر دستِ شفقت رکھا، ماں، باپ کو بھلا دیا،

دیوبند کو مثل گھر بنا دیا، یہ وہ خاص بات ہے جس میں شرکاء چندہ میں سے کوئی ان کا شریک و سہیم نظر نہیں آتا، اس کے عوض میں خداوندِ کریم یہاں کے باشندوں کو دارین میں جزائے کامل عطا کرے، بالجملہ اس دولتِ بے زوال سے بدولت اہل دیوبند عالم مستفید ہے"[1]

اہلِ دیوبند کے دینی جذبات اور دارالعلوم کے ساتھ غیر معمولی تعلق کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ قیام دارالعلوم کے تیسرے سال ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں جب کہ دارالعلوم کی شہرت ملک کے بیشتر مقامات تک پہنچ گئی تھی، اور ملک کے اطراف واکناف سے یہاں طلباء آنے شروع ہو گئے تھے اور اسی طرح چندہ دہندگان کا دائرہ بھی خاصہ وسیع ہو چکا تھا، اس سال ۱۲۸۵ھ کی آمدنی میں تقریباً نصف حصہ باشندگانِ دیوبند کا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے:-

۱۲۸۵ھ کی کل آمدنی ۲۱۹۰ روپے

(روداد ۱۲۸۵ھ ص ۲۳ و ۷۱)

باشندگانِ دیوبند کا چندہ ۳-۱۴-۶۳۸ روپے

(روداد ۱۲۸۵ھ ص ۳۵ لغایۃ ۵۷ و ۷۱)

اس سال کے کل چندہ دہندگان کی تعداد ۲۳۵ ہے

---

[1] روداد ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۴ء ص ۱۲

جس میں اہلِ دیوبند کی تعداد ۱۱۲ ہے۔
(روداد ۱۲۸۵ھ ص ۳۵ غایۃ ۵۷ و ۱۷)

اہلِ دیوبند کی جانب سے نقد چندے کے علاوہ ۳۷ طلباء کے خورونوش کا انتظام بھی تھا، اگر اس زمانے کی ارزانی کے پیشِ نظر ایک شخص کے کھانے کی قیمت کم از کم ایک روپیہ بھی لگائی جائے تو ۳۷ طلباء کے کھانے کی سال بھر کی قیمت ۱۳۵۰۵ ہوتی ہے، اس میں ۶۳۹ روپے چندے کی رقم شامل ہو کر یہ مقدار ۱۰۸۳ روپے ہو جاتی ہے، گویا پوری آمدنی کے لحاظ سے نصف کے قریب ہے۔[۵۱]

بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ شروع ہی سے ہندوستان کے ہر طبقے کے لوگ دارالعلوم کے چندہ دینے والوں میں شریک رہے ہیں۔

اور اب تو دارالعلوم کا حلقۂ اثر بیرونی ممالک تک وسیع ہو چکا ہے، چنانچہ ہندوپاک کے علاوہ حجاز، کویت، افغانستان، جنوبی و مشرقی افریقہ، برما، انگلینڈ اور امریکہ وغیرہ ممالک سے بھی دارالعلوم کو چندہ وصول ہوتا رہتا ہے۔

---

[۵۱] روداد ۱۳۸۵ھ ص ۶۸ مطبوعہ مطبع ضیائی میرٹھ)

دارالعلوم کی مقبولیت اور ترقی

دارالعلوم دیوبند جو شروع میں مدرسۂ عربی دیوبند کے نام سے جاری ہوا تھا اس نے اپنے قیام کے فوراً بعد جس سرعت کے ساتھ شہرت اور ترقی کی جانب قدم بڑھانا شروع کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قیام نہایت ضروری اور وقت کے تقاضے کے عین مطابق تھا، دارالعلوم کے قیام نے اطراف وجوانب میں چھوٹے بڑے مدارس قائم کرنے میں بڑی مدد دی اور جابجا دینی تعلیم کے مدرسے کھل گئے، سہارنپور، تھانہ بھون، میرٹھ، گلاؤٹھی، خورجہ، مرادآباد لکھنؤ اور دہلی وغیرہ مقامات میں مدارس جاری ہو گئے، دن بدن ان میں اضافہ ہوتا رہا اور اب ہند و پاکستان کے کونے کونے میں مدارسِ دینیہ موجود ہیں۔ دارالعلوم کی غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس کی شہرت بہت جلد نہ صرف دور دراز مقامات بلکہ ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں تک پہنچ گئی، چنانچہ پہلے ہی سال میں ہندوستان کے مختلف مقامات کے طلباء کے علاوہ افغانستان کا بھی ایک طالب علم دارالعلوم میں موجود تھا، سنہ ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء جو قیام دارالعلوم کا پانچواں سال ہے اس میں مکہ مکرمہ کا ایک طالب علم صفدر علی

نظر آتا ہے[۵۱] ابتداءً صرف عربی کا درجہ کھولا گیا تھا، اور ایک مدرس کا تقرر عمل میں آیا تھا، مگر آخر سال میں چار مدرس اور بڑھائے گئے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کو صدارتِ تدریس تفویض کی گئی فارسی و ریاضی اور درجۂ قرآن مجید کا اضافہ کیا گیا۔

دار العلوم نے ابھی اپنی عمر کی دوسری منزل ہی طے کی تھی کہ اس میں ایسے طلبار تیار ہو گئے جو تدریسی خدمت انجام دے سکتے تھے چنانچہ دار العلوم کے ایک فاضل طالب علم مولوی میر باز خاں سہارنپور کے مدرسہ مظاہر علوم میں مدرسِ دوم مقرر کئے گئے[۵۲]

طلبار اور مدرسین میں روز افزوں اضافے کی وجہ سے چھتہ کی مسجد جس میں دار العلوم کا آغاز ہوا تھا جلد ہی تنگ ہو گئی تو قاضی مسجد کے قریب کرایے کا ایک مکان لے کر درجاتِ عربی کو وہاں منتقل کر دیا گیا اور پھر چند سال کے بعد جامع مسجد میں جو اس وقت زیر تعمیر تھی، جس میں قدیم مدارس کے طرز کے مطابق صحنِ مسجد کے اطراف میں حجرے اور دالان بنائے گئے تھے، سنہ ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں دار العلوم جامع مسجد میں منتقل ہو گیا مگر یہ جگہ بھی جب ناکافی ثابت ہوئی تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تجویز کے مطابق آبادی سے باہر ایک کشادہ اور

---

[۵۱] روداد دار العلوم سنہ ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء ص ۶۵

[۵۲] روداد دار العلوم سنہ ۱۲۸۴ھ ص ۶

وسیع عمارت بنانا طے کیا گیا، چنانچہ ایک قطعۂ زمین جو دیوبند کی آبادی کے شمال مغرب میں چھتہ کی مسجد کے قریب تھا خرید لیا گیا[1] یہ جگہ آبادی سے قریب ہونے کے باوجود ایسی تھی جس میں دارالعلوم کی عمارتوں کے بڑھنے کے لئے کافی گنجائش تھی، چنانچہ بعد میں دارالعلوم کی جتنی عمارتیں تعمیر ہوئیں وہ اسی کے گرد و پیش بنی ہیں۔

مدرسۂ عربی سے دارالعلوم

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے دارالعلوم کا ابتدائی نام مدرسۂ عربی فارسی ریاضی رکھا گیا تھا، مگر جس حیرت انگیز رفتار اور سرعت کے ساتھ اس نے ترقی کی منزلیں طے کیں اس نے چند ہی سالوں میں اسے مدرسۂ عربی سے دارالعلوم کے بلند مقام پر پہنچا دیا، چنانچہ تقسیم انعام کے تیرھویں جلسے سے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"خداوند کریم کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے کہ تیرھواں سال اس مدرسہ کا جس کو دارالعلوم کہنا بجا ہے، بخیر و خوبی پورا ہوا"[2]

دارالعلوم دیوبند اس وقت ہند و پاک میں دینی تعلیم کی سب سے بڑی درس گاہ سمجھی جاتی ہے اور اپنی تعلیمی خصوصیت کے لحاظ سے

---

[1] روداد ۱۲۹۱ھ ص ۵۳ [2] روداد ۱۲۹۶ھ ص ۲۰ (۱۸۷۴ء)

منفرد حیثیت رکھتی ہے ، مدارسِ دینیہ کے معروف طریقے کے مطابق اس میں تعلیم کے کسی بھی مرحلے میں فیس نہیں لی جاتی ، بلکہ عام طور پر طلباء کے خورد نوش اور دوسری رہائشی ضرورتوں کی کفالت دارالعلوم کی جانب سے کی جاتی ہے ، بلامبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں کسی درس گاہ نے علوم اسلامیہ کے اتنے وسیع خطے اور اتنی کثیر تعداد کو اپنی علمی اور تبلیغی کوششوں سے متاثر نہیں کیا۔

دارالعلوم دیوبند نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے اسلام میں مسلمانوں کی دینی تعلیم کے لئے ایک بے مثال درس گاہ ہے، ایشیائی ممالک میں اسلامی علوم کا کوئی ایک ادارہ ایسا نہیں ہے جو اپنی قدامت مرکزیت اور طلباء کی کثرت کے لحاظ سے اتنی اہمیت رکھتا ہو جتنی دارالعلوم دیوبند کو حاصل ہے ، مختصر یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند شروع ہی سے عالم اسلام کا مرکزی ادارہ رہا ہے ، اس میں داخلے کیلئے ہر ملک کے طلباء کو مساوی حقوق حاصل رہے ہیں۔

ہندوستان کی ایک غیر معروف بستی میں اس ادارے کی بنیاد کچھ ایسے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی تھی کہ بہت تھوڑے عرصے میں اس کا نام تمام دنیا میں مشہور ہوگیا اور دنیائے اسلام کی یہ ایک نہایت ہر دل عزیز درس گاہ سمجھی جانے لگی ، اور بہت جلد ممالک اسلامیہ کے طالبانِ علم جوق در جوق دارالعلوم میں اپنی علمی تشنگی فرو کرنے کے لئے جمع ہوگئے ، اس وقت ہندو پاکستان کے طول و

عرض میں دینی علوم سے واقف جتنی ہستیاں نظر آتی ہیں اُن کا بڑا حصّہ اسی دریائے علم سے سیراب ہو کر نکلا ہے، اور ہندو پاک کے بیشتر نامور علماء نے اسی درس گاہ میں زانوئے تلمذ طے کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ علمی خدمات کی گراں مایگی میں ہندو پاک ہی نہیں دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ایک دو کے علاوہ کوئی تعلیم گاہ ایسی نہیں ہے جس نے اُمّتِ مسلمہ کی اتنی عظیم اور اہم علمی خدمات انجام دی ہوں، ایشیائی ممالک میں یہ واحد ادارہ ہے جو ہر سال تقریباً ۱۵ سو طلباء کی کفالت کی ذمہ داری لے رہا ہے، یہ دنیائے اسلام کا وہ عظیم دینی مرکز ہے جو حکومت کی امداد کے بغیر صرف خدا کے بھروسے پر عوامی چندے سے بارہ تیرہ لاکھ روپے سالانہ کا بجٹ پورا کرتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ یہ ادارہ ہندوستان میں ملّتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا پاسبان ہے، جس کے چشمۂ فیض سے علمی دنیا کا گلشن پُر بہار ہے، چنانچہ دار العلوم کے فضلاء ہندوستان کے بڑے بڑے مدرسوں میں بھی جا بجا نظر آتے ہیں اور ہندو پاک کے علاوہ ملائشیا، برما، سیلون، نیپال کی درس گاہیں بھی انھیں سے آباد نظر آئیں گی، افغانستان کے کوہستانوں تاشقند و بخارا کے مرغزاروں میں بھی یہی لوگ علم اور دین کی خدمت کرتے ہوئے نظر آئیں گے، حتیٰ کہ مکّہ مکرمہ اور مدینہ منوّرہ کی درس گاہیں بھی ان سے خالی نہیں ہیں، غرض کہ ایشیا کے بیشتر ممالک میں فضلائے دار العلوم ضرور نظر آئیں گے، جنھوں نے نسیم بہار بن کر دار العلوم کی

بوئے علم کو چار و انگِ عالم میں پھیلا دیا ہے۔

دارالعلوم اپنے یومِ تاسیس سے شریعت و طریقت دونوں کا مرکز رہا ہے، اس کے صدر مدرس اپنے اپنے دور کے بحر العلوم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کے شیخِ کامل بھی گزرے ہیں، گزشتہ سو سال کی مدت میں قرآن و حدیث کے سیکڑوں جلیل القدر مفسّر و محدّث اسی خاک سے اٹھے، بڑے بڑے اولیائے کاملین اور مشائخ کی مسندِ رُشد و ہدایت اسی کے فیض سے بچھی اور سلوک و معرفت کی منزلیں طے کی گئیں، انھوں نے اسلام کی اشاعت و ترویج اور علومِ دینیہ کے لئے اپنے تئیں وقف کر دیا تھا، چنانچہ دیوبند کا لفظ اسلام کی علمی لغت کا ایک جامع لفظ بن گیا ہے، اور جس طرح کوفہ، بصرہ بغداد، بخارا، ہرات، نیشاپور اور جامعۂ ازہر کا نام سنتے ہی علم و فن کے بے شمار اور یگانۂ روزگار علماء کی زندگیاں ذہن میں اُبھر کر آجاتی ہیں، اسی طرح دیوبند کا نام سنتے ہی علومِ دینیہ کے ابتدائی دور کی تاریخ کا اعادہ ہو جاتا ہے، ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں میں جو دینی آثار نظر آتے ہیں عام اندازے کے مطابق ان میں ۷۵ فی صدہ لوگ ہوں گے جنھوں نے کسی نہ کسی شکل میں اس درسگاہ سے فیض حاصل کیا ہے، برّصغیر کے مسلمانوں میں اسلامی کلچر اور اسلامی روایات کے ساتھ تعلق کے جو اثرات پائے جاتے ہیں غور سے دیکھا جائے تو اُن کے پسِ منظر میں یہی درسگاہ نظر آئے گی۔

دارالعلوم میں طلبار کے لئے چونکہ مفت تعلیمی اور رہائشی سہولتیں اور آسانیاں مہیّا کی جاتی ہیں اس بنا پر مسلمانوں کے غریب طبقے میں بھی تعلیم کی جانب رغبت پیدا ہوئی اور اس نے دارالعلوم کی سہولت سے فائدہ اٹھاکر بہت کچھ اپنی حالت سُدھار لی ہے ہندو بیرونِ ہند کے مسلمانوں نے اپنے نونہالوں کو دارالعلوم کی آغوش میں دے کر اطمینان محسوس کیا ہے اور دیوبند اور اس کی روایات سے محبت و احترام کا اظہار کرنے میں ہمیشہ روایتی فیّاضی سے کام لیا ہے۔

دارالعلوم کی نسبت ایک مغربی مفکّر کی رائے ہے کہ "دارالعلوم دیوبند دنیائے اسلام کا ایک اہم ترین ادارہ ہے، قدرتی طور سے اس کا اثر ہندوستان میں بہت زیادہ ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشی ترقی میں اپنی قدیم روایات کے مطابق کافی دلچسپی لی ہے، ان قدیم روایات کا مبدار شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحریک ہے، انھیں روایات کے پیشِ نظر دیوبندی علمار نے مختلف انقلابی تحریکوں میں حصّہ لیا ہے بریلوی طرزِ فکر کے برعکس دیوبندی طرزِ فکر اس سے مطمئن نہیں ہے کہ حالات جوں کے توں رہیں، بلکہ وہ حالات کو ترقی دینے کی جدوجہد میں پورے عزم اور جوش کے ساتھ کوشاں ہے، اس کا نقطۂ نظر حقیقی اسلام کا احیار ہے، یعنی مسلمانوں کو مذہبی رنگ کی بداعمالیوں

رسم و رواج کی پستیوں اور اُس مادّی دست بُرد سے نجات دلانا ہے جس کے وہ بریلوی تسلّط کے وقت سے شکار ہو رہے ہیں۔

دیوبند اسلام کی حدود کی نگہداشت میں بہت سخت ہے لیکن ان حدود کے اندر رہتے ہوئے وہ عقلیت پسند بھی ہے، وہ گمراہی نفاق اور ذہنی کاہلی کو شکست دینے کے لئے برابر کوشاں ہے، اس کا دینی ماحول مکمّل طور پر متکلّمانہ ہے، عملی میدان میں دیوبندی علماء عزمِ راسخ کے ساتھ اُس غلط کاری، اوہام پرستی اور لوازمِ جہالت کے خلاف کمربستہ ہیں جو پست دیہاتی سوسائیٹی کے رگ ریشے میں سرایت کئے ہوئے ہے، ان کا نقطۂ نظر روایتی اسلام ہے جو اپنی خالص ترین شکل میں ہو، وہ سختی کے ساتھ شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں، اسلامی تاریخ کے بارے میں ان کا تخیّل محقّقانہ ہے، بخلاف آزاد خیال طبقے کے جو اگرچہ زمانۂ ماضی میں ایک مثالی دور کا بہت خوشنما اور رنگین نقشہ پیش کرتا ہے، مگر اس نقشے میں تعلیماتِ اسلامی کی مہذّب معلومات کا رنگ بھرنے کے بجائے وہ موجودہ زمانے کے آزادانہ خیالات و نظریات کا رنگ بھر دیتا ہے۔

معاشرتی اعتبار سے دیوبند اس حد تک ترقی پسند ہے کہ وہ توہّمانہ خیالات کے امتزاج کو ختم کرنے کی کوشش میں بہت شدّت سے مصروف ہے"[1]

---

[1] ماڈرن اسلام اِن انڈیا مصنفہ ڈاکٹر کانٹویل اسمتھ ڈائرکٹر اسلامک اسٹڈیز میک گل، یونیورسٹی کناڈا ص ۳۲۰ و ۳۲۱

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں" دارالعلوم دیوبند کی ضرورت اور اہمیت کھلی ہوئی اور واضح ہے، آفتاب کے وجود کی سب سے بڑی دلیل تو آفتاب خود ہی ہے، دین و ملّت کی جو گراں بہا خدمتیں اس نے انجام دی ہیں کیا ان کا شمار کرانا کچھ آسان ہے؟ مولانا محمد قاسمؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد یعقوب مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمود حسن، مولانا انور شاہ اور مولانا حسین احمد، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا اعزاز علی، مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا کفایت اللہ اور بہت سے مرحومین، اور ماشاء اللہ زندہ سلامت ہستیوں میں مولانا محمد شفیع، مولانا محمد طیّب اور مولانا منت اللہ امیر شریعت بہار وغیرہم کے کارناموں کو گنانا:

سورج کو چراغ ہے دکھانا!

قرآن و حدیث اور فقہ و کلام اور تصوّف کے کتنے مخلص اور کارگزار بلکہ ان فنون کے امام تک یہ دارالعلوم پیدا کر چکا ہے، اس کے درسِ فضیلت کی شہرت ہندوستان گیر ہی نہیں بلکہ جہاں تک عالمِ اسلامی کا تعلق ہے عالم گیر ہو چکی ہے اور ہندوستان و پاکستان کا تو گوشہ گوشہ کہنا چاہیئے یہاں کے عالموں فاضلوں کے فیض سے منوّر ہو رہا ہے، ان کا اہم ترین مشغلہ درس و تدریس اور تبلیغ و ہدایت ہے"[1]

---

[1] صدق جدید مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۶۶ء

لاہور کے اخبار "زمیندار" نے لکھا تھا کہ :-

"اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں علوم دینیہ سے واقف جتنی ہستیاں نظر آتی ہیں اُن میں بڑا حصّہ اسی دریائے علم سے سیراب ہو کر نکلا ہے، ہندوستان کے بڑے بڑے علماء نے اسی مہتم بالشان مدرسہ میں زانوئے ادب طے کیا ہے، علمی خدمات کی گراں مایگی میں ہندوستان کی کوئی درس گاہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ دارالعلوم کس قدر قیمتی خدمات انجام دے رہا ہے اس کے اساتذہ اور طلباء غایت انہماک سے اپنے مقصد کی تکمیل میں سرگرم ہیں اور یہ کھلی حقیقت ہے کہ حقیقی درس گاہ وہی ہے جو وقت پر میدانِ عمل میں اترے" [1]

غرض کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کا یہ مرکز جو ایک صدی پہلے چھوٹا سا پودا تھا اسے خلوص سے سینچا گیا تو یہ پروان چڑھ کر آج باغ و بہار بنا ہوا ہے، اور اس کی خوشبو سے پورا ایشیا مہک رہا ہے۔

فضلائے دارالعلوم کی تعداد

۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء سے ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء تک سو سال کی مدت میں دارالعلوم سے جن طالبانِ علم نے فراغ حاصل کیا اُن میں ہند و پاک

---

[1] اخبار "زمیندار" ۲۴ جون سنہ ۱۹۲۳ء

اور افغانستان، ایران، عراق، چین، روس، انڈونیشیا ملائشیا، برما، سیلون اور جنوبی افریقہ وغیرہ ممالک ۔۔۔۔ کے فضلائے دارالعلوم کی خطّہ وار تفصیل یہ ہے :-

ہندوستان

(۱) یوپی	۱۸۹۶	(۱۰) مدھیہ پردیش	۲۸
(۲) مغربی بنگال	۱۵۱	(۱۱) مشرقی پنجاب	۱۹۶
(۳) آسام ومنی پور	۲۶۵	(۱۲) دہلی	۱۲
(۴) بہار واڑیسہ	۷۸۰	(۱۳) مہاراشٹر	۳۹
(۵) مدراس	۳۰	(۱۴) گجرات	۱۳۸
(۶) ٹراونکور	۴	(۱۵) راجستھان	۴۳
(۷) کیرالہ	۴۲	(۱۶) جموں وکشمیر	۱۱۰
(۸) آندھرا	۵۲	(۱۷) نیپال	۳
(۹) میسور	۶	میزان ہندوستان	۳۷۹۵
		پاکستان	۱۵۱۹
		بنگلہ دیش	۱۶۷۲
		کل میزان	۶۹۸۶

بیرونی ممالک

(۱) افغانستان	۱۰۹	(۸) کویت	۲
(۲) روس لشکول سائبریا	۷۰	(۹) ایران	۱۱
(۳) چین	۴۴	(۱۰) سیلون	۲
(۴) برما	۱۴۴	(۱۱) جنوبی افریقہ	۱۴
(۵) ملائشیا	۲۸	(۱۲) سعودی عرب	۲
(۶) انڈونیشیا	۱	(۱۳) سیام	۱
(۷) عراق	۲	(۱۴) یمن	۱

میزان بیرونی ممالک	۴۳۱
میزان ہند و پاک و بنگلہ دیش	۶۹۸۶
ہند و پاکستان اور بیرونی ممالک کے فضلاء کی مجموعی میزان	۷۴۱۷

مذکورہ بالا تعداد کے علاوہ ۵۸,۳۱۰ وہ طلباء ہیں جنھوں نے کم و بیش مدّت دارالعلوم میں رہ کر تعلیم پائی، مگر کسی وجہ سے وہ فراغت حاصل نہیں کر سکے۔

دارالعلوم میں تقریباً ڈیڑھ ہزار طلباء ہر سال زیرِ تعلیم رہتے ہیں دُور دُور کی علمی اولادیں اس کی آغوشِ درس میں تربیت پا رہی ہیں اور مختلف رنگ و بُو کے پھولوں سے اس کا دامن پُر ہے۔

چھوٹی بڑی ۵۱ درس گاہیں ہیں، جن میں ۳۴۳ اساتذہ درس و تدریس میں مشغول ہیں۔ طلبار کے قیام کے لئے ۲۱۰ کمرے ہیں، جن میں ہزار گیارہ سو طلبار مقیم رہتے ہیں، تعلیمی اور انتظامی شعبوں کی تعداد ۲۴ ہے، جن میں ۱۷۲ کارکن کام کرتے ہیں، ۱۶ دفاتر کی مستقل عمارتیں ہیں۔

سنہ ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء سے سنہ ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء تک طلبار کی تعداد میں جس رفتار سے اضافہ ہوا وہ مندرجہ ذیل نقشے سے واضح ہے:-

سن	تعداد
سنہ ۱۲۸۳ھ	۷۸
سنہ ۱۲۹۲ھ	۱۷۸
سنہ ۱۳۰۲ھ	۱۵۹
سنہ ۱۳۱۲ھ	۲۹۳
سنہ ۱۳۲۲ھ	۲۸۴
سنہ ۱۳۳۲ھ	۵۸۶
سنہ ۱۳۴۲ھ	۷۹۵
سنہ ۱۳۵۲ھ	۱۱۴۲
سنہ ۱۳۶۲ھ	۱۱۶۴
سنہ ۱۳۷۲ھ	۱۲۵۲
سنہ ۱۳۸۲ھ	۱۵۶۹

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ دار العلوم کے پہلے سال کی آمدنی چھ سو انچاس روپے چار آنے تھی، سو سال کی مدت میں اس کی آمدنی میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشے سے واضح ہوگا ذیل میں ہر دس سال کے فصل سے آمد و خرچ کے اعداد و شمار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دار العلوم میں کس طرح پر تدریجی ترقی ہوتی رہی ہے

سو سالہ آمد و صرف

از سنہ ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء لغایۃ سنہ ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء

سن	آمد	صرف
سنہ ۱۲۸۳ھ	۶۴۹-۴-۰	۳۹۳-۱۲-۳
سنہ ۱۲۹۲ھ	۲۲۰۰-۹-۹	۲۰۵۴-۱۱-۰
سنہ ۱۳۰۲ھ	۴۲۳۱-۱۰-۰	۴۶۶۳-۱۲-۳
سنہ ۱۳۱۲ھ	۵۵۱۱-۹-۰	۷۹۶۷-۱۱-۳
سنہ ۱۳۲۲ھ	۹۵۵۹-۱۰-۹	۸۵۱۳-۲-۶
سنہ ۱۳۳۲ھ	۵۳,۲۰۶-۱۵-۶	۴۸,۸۶۵-۱-۴
سنہ ۱۳۴۲ھ	۹۴,۴۵۹-۱۱-۲	۷۹,۱۲۱-۵-۳
سنہ ۱۳۵۲ھ	۵۴,۲۳۴-۰-۰	۵۴,۰۱۶-۰-۰
سنہ ۱۳۶۲ھ	۱,۷۵,۳۹۸-۴-۷	۱,۳۵۷۲۲-۶-۸
سنہ ۱۳۷۲ھ	۳,۷۰,۵۳۵-۱۵-۳	۴,۱۵۹۰۳-۰-۰
سنہ ۱۳۸۲ھ	۶,۸۷,۲۲۶-۹-۶	۶,۴۵۰۴۶-۵-۰

اس نقشے کا آخری سال سنہ ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء ہے، ان سطور کی تحریر کے وقت سنہ ۱۳۹۰ھ / ۱۹۷۰ء ہے اور اس عرصے میں دار العلوم کا بجٹ تیرہ لاکھ روپے سالانہ تک پہنچ چکا ہے۔

دار العلوم کی عمارتیں

مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ہندوستان میں جا بجا مکتب اور مدرسے قائم تھے، دہلی، لاہور، ملتان، گجرات، جون پور اور لکھنؤ وغیرہ مقامات علوم و فنون کے خاص مرکز تھے، یہ مکتب عام طور پر مسجدوں، خانقاہوں اور رؤسا کے دیوان خانوں میں ہوتے تھے، لیکن مدارس کے لئے مسجدوں سے علیحدہ بڑی بڑی عمارتیں بھی بنائی جاتی تھیں، تاریخ کے اوراق میں مدارس کی عظیم الشان عمارتوں کی تفصیلات ملتی ہیں، کہیں کہیں ان کے آثار اور کھنڈر بھی پائے جاتے ہیں، مگر جہاں تک ہمارے قدیم طرزِ تعلیم کی عمومیت کا تعلق ہے اس میں درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کے لئے عمارت کا ہونا لازمی اور ضروری نہ تھا، چنانچہ بہت سی ایسی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں کہ مسجدوں اور خانقاہوں کے علاوہ استاد کھلے میدانوں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر درس دیتے تھے، استاد اور شاگرد سب بے تکلّف فرشِ زمین پر بیٹھ جاتے اور وہیں علمی مجلسیں گرم ہو جاتی

تھیں، ہمارے قدیم طرزِ تعلیم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس کی علمی مجلسیں تکلفات سے بے نیاز اور مستغنی تھیں، خود دار العلوم کا آغاز بھی صحنِ مسجد ہی سے ہوا تھا۔

لیکن دار العلوم چونکہ صرف مقامی درس گاہ نہ تھی، اور شروع ہی سے اس کی حیثیت ایک اقامتی تعلیم گاہ کی بن گئی تھی، جس میں مقامی طلباء سے زیادہ بیرونی طلباء کا اجتماع بڑھتا گیا اس بنا پر ضرورت محسوس کی گئی کہ دار العلوم کے لئے علیحدہ ایک عمارت بنائی جائے، ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء کی روداد میں عمارت کے لئے اپیل کرتے ہوئے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے، لکھا ہے کہ :-

"جب سے بنا، مدرسہ قائم ہے، مکان کی نہایت تنگی ہے، علاوہ بریں اکثر ضروری امور رہ جاتے ہیں یا ناقص و ناتمام انجام پاتے ہیں، یہ اس پر ہے کہ مکتب حفظِ قرآن اور مکتبِ فارسی جداگانہ ہے، ورنہ دشواری اس سے زیادہ ہو جاتی، مدت سے مہتمم اور اہلِ شوریٰ کے دل میں یہ امر خلجان کرتا ہے، اور اس کی تدبیر سوائے اس کے کہ ایک مکان وسیع با فراغت جس میں قریب سو کے طلباء بآرام تمام رہ سکیں اور چار پانچ درس گاہ بھی ہوں تیار ہو"[1]

---

[1] روداد ۱۲۸۸ھ ص ۲، ۳

دارالعلوم سے دلچسپی رکھنے والے قدرتی طور پر یہ جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ دارالعلوم کی عمارتوں کا نقشہ کیا ہے؟ اور وہ کب اور کس زمانے میں تعمیر ہوئیں؟ دینی مدارس میں دارالعلوم دیوبند اپنی تعلیمی عظمت کے علاوہ اپنی عمارتوں کے لحاظ سے بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے، دارالعلوم کی عمارتیں تقریباً پچاس ہزار مربع میٹر کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء سے ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء تک جو عمارتیں تعمیر ہوئیں ان کی مجموعی لاگت ۱۱,۰۰,۸۹۵ روپے ہوتی ہے۔

تاریخ اقوام عالم میں اکثر بڑے بڑے اور نمایاں کاموں کی بنیاد چھوٹی چھوٹی چیزوں میں ملتی ہے، جس چیز سے بہت کم توقع کی گئی تھی اس سے عظیم الشان نتائج برآمد ہوئے، ٹھیک یہی حال دارالعلوم دیوبند کا ہے، جب یہ قائم ہوا تو اس کے پاس نہ وافر سرمایہ تھا اور نہ کوئی عمارت تھی، صحن مسجد میں درس و تدریس کا کام شروع کر دیا گیا اس وقت کون باور کر سکتا تھا کہ جس مدرسہ کی بنیاد اس بے سروسامانی کے ساتھ رکھی جا رہی ہے وہ مستقبل میں پندرہ سولہ ایکڑ رقبے میں پھیل جائے گا، اور لاکھوں روپے کے صرف سے اس کی ایسی عظیم الشان عمارتیں تعمیر ہو جائیں گی جس کی مثال پورے ایشیا کے دینی مدارس میں نہ ہو گی۔

باہر سے دیوبند آنے والے کو کئی میل کے فاصلے سے جو

عمارتیں سب سے پہلے نظر آتی ہیں اُن میں ایک جامع مسجد کے مینار ہیں اور دوسرا دارالتفسیر کا بلند و بالا گنبد ہے۔

نودرے کی تعمیر

۲ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء کو جمعہ کے دن جامع مسجد میں تقسیم انعام کے جلسے کے بعد دارالعلوم کی موجودہ عمارت کا سنگِ بنیاد حضرت مولانا احمد علی محدّث سہارنپوریؒ کے ہاتھ سے رکھا گیا، پھر ایک ایک اینٹ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد منظر نانوتویؒ، حضرت میاں جی منّے شاہؒ اور حضرت حاجی محمد عابدؒ نے رکھی۔ [1]

اس وقت دیوبند اور اطراف و جوانب کا بہت بڑا مجمع موجود تھا، سب لوگوں نے نہایت الحاح و زاری کے ساتھ دارالعلوم کی بقا و ترقی کے لئے دعا کی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے فرمایا کہ "عالمِ مثال میں اس مدرسے کی شکل ایک معلّق ہانڈی کی طرح ہے جب تک اس کا مدار توکل اور اعتماد علی اللہ پر رہے گا یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا"۔ [2]

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے اس تعمیر کا مادۂ تاریخ اشرف عمارات نکالا [3]

۱۲۹۲ھ

---

[1] روداد ۱۲۹۲ھ ص ۱۰ و ارواح ثلاثہ حکایت ۲۵۲ - - - - [2] "القاسم" دارالعلوم نمبر ص ۷۰ [3] سنگِ بنیاد اگرچہ ۱۲۹۲ھ میں رکھا گیا مگر تعمیر کا آغاز ۱۲۹۳ھ سے ہوا - روداد ۱۲۹۲ھ ص ۸۱

آٹھ سال کی مدت میں ۲۳ ہزار روپے کے صَرف سے یہ عمارت "نودرہ" کے نام سے بن کر تیار ہوئی، اس عمارت کے دو درجے ہیں ہر ایک درجے میں نو نو دروازے ہیں، دارالعلوم کی یہ سب سے پہلی عمارت ہے، نودرے کی یہ عمارت سادہ ہونے کے باوجود شاندار ہے، روداد میں لکھا ہے کہ "اس عمارت میں سادگی اور استواری کو مقدم رکھا گیا ہے، اس کا نقشہ منجانب اللہ قلوب پر الہام ہوا تھا" [1]

حضرت مولانا رفیع الدینؒ نے جن کے زمانۂ اہتمام میں یہ تعمیر ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ ارشاد فرما رہے ہیں کہ "یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے" یہ فرما کر خود غصلۂ مبارک سے ایک طویل و عریض نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے، چنانچہ اسی کے مطابق بنیاد کھدوا کر تعمیر شروع کرائی گئی [2]

دارالعلوم کا یہ مقام احاطۂ مولسری کے نام سے موسوم ہے اسی احاطہ میں وہ تاریخی کنواں ہے جو نودرے کے ساتھ بنا تھا یہ کنواں دارالعلوم میں بڑا بابرکت سمجھا جاتا ہے، اس کا پانی نہایت

---

[1] روداد سنہ ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۳ء ص ۱۲ [2] روداد جلسہ انعام سنہ ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء مندرجہ ماہنامہ دارالعلوم بابت ماہ رمضان سنہ ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء ص ۱۱ و ۱۲

ٹھنڈا اور شیریں ہے، حضرت مولانا رفیع الدینؒ ہی نے ایک دوسرے خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ "کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیالے سے دودھ تقسیم فرما رہے ہیں، بعض لوگوں کے پاس چھوٹے برتن ہیں اور بعض کے پاس بڑے ہیں، ہر شخص اپنا اپنا برتن دودھ سے بھروا کر لے جا رہا ہے، مولانا نے برتنوں کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی یہ تعبیر دی کہ اس سے ہر شخص کا "ظرفِ علم" مراد ہے"۔ [۱]

نودرے کی تعمیری خصوصیات کی نسبت روداد میں لکھا ہے کہ :-

"اس کی تعمیر میں ہندوستانی اور انگریزی عمارتوں کا لطف موجود ہے، اس کی پشت پر ایک عمدہ تالاب اور جانبِ جنوب سبزہ زار اور بجانبِ شمال باغ متعلقہ مدرسہ ہے، اور وسطِ صحن میں ایک مختصر اور نفیس چمن نہایت خوش نما جنگلے کے بیچ میں شگفتہ ہے اور جنگلے کے چاروں طرف گملوں میں ہر قسم کے مختلف الالوان پھولوں کے درخت موجود ہیں"۔ [۲]

---

[۱] روداد جلسہ انعام ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء مندرجہ ماہنامہ دارالعلوم بابت ماہ رمضان ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء ص ۱۱ و ۱۲ [۲] روداد جلسہ دستار بندی ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۳ء ص ۷

مسجد دارالعلوم

۱۳۲۷ھ / ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم کے مقدّس اکابر نے مسجد کی بنیاد رکھی، روداد میں سنگِ بنیاد کی تقریب کی نسبت تحریر ہے :-

"طلباء کے عام مجمع میں بزرگانِ دین نے مسجد کی بنیاد رکھی، اور پھر ہر ایک طالب علم نے اپنے اپنے ہاتھ سے اینٹیں رکھیں، اور نہ صرف اینٹیں رکھیں بلکہ اس کی دیوار کی کل بنیاد جو بہت گہری تھی طلباء نے خود اپنے ہاتھوں سے بھری، طلباء کے ساتھ کل مدرسین وارا کین مدرسہ نہایت ذوق وشوق سے خود اینٹیں اپنے سروں اور ہاتھوں پر لاتے تھے، اور بجائے معماروں کے تعمیر کرتے تھے۔ سبحان اللہ طلباء کا جوشِ مسرت کے ساتھ سنتِ خلیل اللہی میں مشغول ہونا اور ساتھ میں رجزیہ اشعار اور تعمیرِ بیت اللہ کے وقت کی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی دعائیں پڑھنا عجیب مؤثر اور پُرجوش سماں تھا۔" [1]

مسجد کی تعمیر سیٹھ غلام محمد اعظم صاحب کی تنہا فیاضی کی یادگار ہے مسجد کی رُوکار اور مینار سنگِ سرخ کے ہیں، جن پر نہایت حسین و دلآویز نقش و نگار بنے ہوئے ہیں، صحنِ مسجد کے آخر میں سنگِ مرمر کا حوض ہے

---

[1] روداد دارالعلوم ۱۳۲۶ھ ص ۱۰

جو ہر وقت شفاف پانی سے لبریز رہتا ہے، اس میں پانی برقی موٹر کے ذریعے سے بھرا جاتا ہے، یہاں پنجگانہ اوقات میں نمازیوں کی کثرت اور ہجوم کو دیکھ کر جمعہ و عیدین کا سماں نظر آتا ہے [1] مسجد کی رو کار میں سنگِ مرمر کا کتبہ نصب ہے، جس میں مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں۔

در مدرسہ مسجدے بنا شد — ایں مژدہ ز دوستاں شنیدم
بر لوحِ جبینش اسمِ اعظم — خواندم چو بصحنِ او رسیدم
در سجدۂ شکر چوں فتادم — در گوش رسید ایں شنیدم
مقرون شدہ عبادت و علم — در مدرسہ خانقاہ دیدم

۱۳۲۸ھ — ۱۳۲۸ھ

یہ مسجد دو منزلہ ہے، بالائی منزل ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء کی تعمیر ہے، یہ شاندار مسجد فنِ تعمیر کا ایک خوبصورت نمونہ ہے، رُو کار کی نقاشی بجید حسین اور کمالِ فن کی آئینہ دار ہے

---

[1] جامعہ ازہر (مصر) کے ایک استاذ شیخ محمود عبدالوہاب محمود، جو متحدہ عرب جمہوریہ کی جانب سے دار العلوم میں جدید عربی ادب و انشاء کی تعلیم کے لئے بھیجے گئے تھے، شیخ موصوف نے دار العلوم سے واپسی کے وقت اپنی الوداعی تقریب میں مسجد دار العلوم کے اس کیف آور اور روح افزا سماں کی نسبت اپنے جن تاثرات کا اظہار فرمایا وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے کہ "جو حظ اور کیف ہر جماعت کے ساتھ نماز میں بوجہ کثرتِ جماعت یہاں پایا تھا وہ نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی کسی مسجد میں حاصل نہیں ہوا بلکہ سوائے حرمین شریفین کی نمازوں کے یہ حظ و کیف میں نے کہیں محسوس نہیں کیا۔"

مسجد کی مشرقی جانب بالائی منزل پر دارالافتاء کی عمارت واقع ہے جو تین وسیع کمروں اور ایک کشادہ دالان پر مشتمل ہے۔

دارالحدیث

جس طرح دارالعلوم دیوبند کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ ہندوستان بھر میں یہ پہلی درس گاہ ہے جو عین اسلامی علوم کے زوال کے وقت عام مسلمانوں کے عام چندے سے قائم ہوئی، اسی طرح اس کو یہ تقدّم اور فضیلت بھی حاصل ہے کہ دارالعلوم کا دارالحدیث ہندوستان بھر میں پہلی عمارت ہے جو اس خاص نام سے عالم وجود میں آئی، اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد کے ہندوستان میں چپّے چپّے پر مدارس کا جال بچھا ہوا تھا اور ایک ایک ذرّہ علم کی روشنی سے منوّر تھا، لیکن مدارس کی اس کثرت و بہتات کے باوجود ہندوستان میں کوئی عمارت دارالحدیث کے نام سے اس سے پہلے نہیں بنی!

اسلام کی تاریخ میں دارالحدیث کے نام سے پہلے پہل عمارت بنانے کا شرف شام کے فرماں روا ملک عادل نورالدین زنگی (متوفی ۵۶۹ھ / ۱۱۷۳ء) کو حاصل ہے، ملک عادل نے یہ دارالحدیث دمشق میں تعمیر کرایا تھا، دوسرا دارالحدیث قاہرہ (مصر) میں سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس کے بھتیجے ملک کامل نے قائم کیا[1]، اور پھر یہ سلسلہ اس قدر پھیلا کہ صرف ایک شہر دمشق میں بیک وقت ۱۸ دارالحدیث

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب الخطط مقریزی اور حسن المحاضرہ سیوطی جلد ۲ ص ۱۵۹

موجود تھے، جن میں ہر ایک بجائے خود زبردست عظمت و شان کا مالک تھا۔

دارالعلوم میں دارالحدیث کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب میں ۲۰ ربیع الآخر ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۱ء کو ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں ملک کے مختلف مقامات کے لوگوں نے کثرت سے شرکت کی، طلباء نے باصرار مزدوروں کے ساتھ نہایت ذوق و شوق کے ساتھ والہانہ انداز میں بنیاد کے کھودنے میں حصّہ لیا، حضرت تھانویؒ نے مجمع سے فرمایا کہ:-

"سب صاحب ایک ایک، دو دو اینٹ اپنے ہاتھ سے رکھ دیں، نہ معلوم حق تعالیٰ کے یہاں کس کا خلوص مقبول ہو جائے"!

چنانچہ تمام شرکاء جلسہ نے دو، دو اینٹیں رکھیں[1]۔

---

[1] دارالحدیث کی تعمیر سے قبل مختلف حضرات نے عالمِ خواب میں دیکھا کہ موقع تعمیر دارالحدیث پر دارالعلوم کے اکابرِ مرحومین جمع ہیں اور خود اپنے ہاتھوں سے سامانِ تعمیر اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں، اور تعمیر میں مصروف ہیں، اسی زمانے میں ریاست ٹونک میں سردنج کے رہنے والے ایک صاحب، سید یوسف علی، ٹونک میں دارالعلوم کے لئے چندہ جمع کر رہے تھے، انھوں نے ایک نہایت مبارک خواب دیکھا جو انھیں کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔

"گزشتہ نصف شب کے بعد میں نے بعالمِ خواب دیکھا کہ میں (باقی حاشیہ ص ۳۸۴ پر)

دارالحدیث کی یہ پُرشکوہ عمارت ۱۹ سال کی طویل مدت میں سنہ ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء میں مکمل ہوئی، یہ طویل و عریض اور عظیم الشان عمارت نودرے کی پشت پر واقع ہے۔ دارالحدیث کے گرد و پیش ۱۳ کمرے ہیں جو درس کے کام میں آتے ہیں، دارالحدیث کا طول ۶۸ فٹ اور عرض ۳۵ فٹ ہے، اس کی رُو کار مغرب کی جانب ہے، حدیث کا درس اُس عمارت میں بھی ہوتا ہے جو نودرے کے اوپر واقع ہے اور "دارالحدیث فوقانی" کے نام سے موسوم ہے، یہ عمارت سنہ ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء کی تعمیر ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بسواری ریل ٹونک جارہا ہوں، ایک کفِ دست ریگستانی مقام میں یکایک ریل ٹھہر گئی، ایک شخص میرے پاس آئے اور کہا اُترو! حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف فرما ہیں، میں بکمالِ شوق ان کے ہمراہ ہوگیا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جگہ چند مکان سرکی کے اور دو تین خیمے استادہ ہیں، میں پہلے سرکی والے مکان میں گیا وہاں چند حضرات تشریف فرما تھے اُن میں سے ایک صاحب نے جو کسی قدر فربہ اندام اور کچھ سیاہ فام تھے، پیشانی پر سجدہ کا نشان تھا، کرتے کی گھنڈی کھلی ہوئی تھی اور چند مجلد چرمی کتابیں اُن کے پاس رکھی ہوئی تھیں مجھ سے فرمایا کہ "اول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں جاؤ!" میں نے عرض کیا کہ کیا حضور مجھ کو خیمے کے اندر بلوالیں گے؟ فرمایا "ہاں"! (باقی صفحہ ۳۸۵ پر)

دار التفسیر قدیم دارالحدیث کے اوپر دار التفسیر کی مربع عمارت ہے، یہ طول وعرض میں ۳۰ × ۳۰ فٹ ہے، اس کے اوپر نہایت خوش نما گنبد بنا ہوا ہے جو اپنی رفعت وعظمت کے لحاظ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں سلام کرکے خیمہ مبارک پر پہنچا، مجھ کو باریابی نصیب ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر میری جانب دستِ مبارک بڑھائے، میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بوسہ دیا اور رو تا رہا، بیٹھنے کا حکم صادر ہوا، میں بیٹھ گیا، ہنس کر فرمایا "تم نے کس قدر چندہ وصول کیا ہے؟" میں نے عرض کیا ۶۲ روپے، پھر ارشاد ہوا کچھ پڑھو! میں نے سورۃ فاتحہ سنائی فرمایا کہ "قرآن مجید صحیح پڑھا کرو"!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب دو صاحب اور تھے، ایک پورے قد آور جوان، خوب صورت چہرہ، سرخ وسفید رنگ، داڑھی سینے تک، بال سیاہ وسفید، دوسرے صاحب لانبے، لاغر جسم، ان کا پورا حلیہ یاد نہیں رہا"۔

اس خواب کو نقل کرکے موصوف لکھتے ہیں کہ:۔

"قبل ازیں مجھ کو دو مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی لیکن خاص صورت مبارک میں اس مرتبہ کی زیارت چندہ دارالحدیث جس کی بابت ۲۵ میں کوشاں ہوں اس کا خاص سبب ہے"۔ (رسالہ القاسم ص۲ بابت ماہ ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۰ء)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دارالعلوم کے سر پر تاج رکھا ہوا ہے، دارالتفسیر ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء کی تعمیر ہے، دارالحدیث اور دارالتفسیر کی یہ عمارت بہ ہیئت مجموعی اس قدر عظیم الشان اور پرشکوہ ہے کہ دیکھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کا بلند و بالا گنبد میلوں سے نظر آتا ہے۔

دارجدید

دارالحدیث کے سامنے دو منزلہ جدید دارالاقامہ ہے جو بڑے بڑے ۲۱۰ کمروں پر مشتمل[1] ہے، ہر کمرے کے سامنے اس کے تعمیر کرانے والے کے نام کا کتبہ لگا ہوا ہے، دارجدید کے کمروں کا سلسلہ دارالحدیث کی شمالی جانب سے شروع ہو کر مستطیل شکل میں مغرب سے گزرتا ہوا جنوب اور مشرقی سمت تک چلا گیا ہے، کمرے وسیع، کشادہ اور ہوادار ہیں، کمروں کے سامنے برآمدے ہیں جن کے سامنے کھلا اور پُر فضا صحن ہے، اس احاطہ کے شمال، جنوب اور مغرب میں تین دروازے ہیں

---

[1] یہ بات شاید عجیب معلوم ہوگی کہ دارالعلوم کے دارالاقامہ کے کمروں کا طرزِ تعمیر انگلستان کی مشہور یونیورسٹی آکسفورڈ کے دارالاقامہ (HOSTELS) جیسا ہے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنے مکتوب لندن میں لکھتے ہیں :-

"آکسفورڈ یونیورسٹی امتحان لیتی اور سند دیتی ہے، ہر کالج میں رہنے کے لئے کمرے ہیں، باہر سے وہ بالکل ہمارے عربی مدارس دیوبند وغیرہ کے حجروں کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں، کالجوں کی عمارتیں بہت قدیم ہیں، صدیوں سے اپنی اصلی شکل پر چلی آرہی ہیں۔" (مکاتیب یورپ۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص۴۵)

مغربی دروازہ جو عین دار الحدیث کے مقابل ہے "باب الظاہر" کے نام سے موسوم ہے، دارجدید کا یہ احاطہ دارالعلوم کا سب سے زیادہ پُر فضا مقام ہے، کئی ایکڑ زمین کا نہایت وسیع صحن ہے، جس کی تین سمتوں میں اقامت خانے اور مشرقی جانب دار الحدیث ہے، دارجدید میں دو کشادہ سڑکیں ہیں، ایک دار الحدیث سے شروع ہو کر باب الظاہر سے گزرتی ہوئی ریلوے اسٹیشن تک چلی گئی ہے، اور دوسری سڑک شمالی دروازے سے نکل کر جنوبی دروازے تک جاتی ہے، سڑکوں نے دارجدید کے احاطہ کو چار قطعوں میں تقسیم کر دیا ہے، ان قطعوں میں رنگ برنگ کے پُر بہار اور جاذب نظر پھول دار درختوں کی چمن بندی کی گئی ہے، جس نے منظر میں ایک ایسی دل کشی پیدا کر دی ہے جو بے ساختہ دیکھنے والے کو اپنی جانب کھینچتی ہے، ہری بھری گھاس سے پورا احاطہ خوش منظر اور نہایت پُر فضا نظر آتا ہے، یہاں آب رسانی کے لئے پائپ کے علاوہ بورنگ کے ہینڈ پمپ بھی لگے ہوئے ہیں۔

باب الظاہر

باب الظاہر دارجدید کا صدر دروازہ ہے، یہ دروازہ دار العلوم کی ایک نہایت خوش نما اور عالی شان عمارت ہے، ۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء میں اس کی تعمیر موجودہ تاجدار افغانستان محمد ظاہر شاہ کے شاہانہ عطیے سے ہوئی ہے اور دار العلوم سے افغانستان کی وابستگی کی ایک ایسی یادگار ہے جو تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

دارالقرآن

دارجدید کے جنوبی گوشے میں دارالقرآن کی عمارت ہے جو کولوٹولہ کلکتہ کے مشہور تاجر الحاج فیروزالدین صاحب کی فیاضی اور خدمتِ قرآن کی یادگار ہے، یہ عمارت پانچ کمروں پر مشتمل ہے، اس میں ہر سال کم وبیش دو سو بچے قرآن مجید پڑھتے اور حفظ کرتے ہیں، ۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۹ء میں اس کی تعمیر ہوئی۔

کتب خانہ

کتب خانے کی عمارت دو منزلہ ہے، نیچے کی منزل میں دارالعلوم کے مختلف دفاتر، صنعت وحرفت کا شعبہ اور درجاتِ فارسی کی درس گاہیں ہیں، اوپر کی منزل میں کتب خانے کی طویل اور وسیع عمارت واقع ہے، دارالعلوم کی دوسری عمارتوں کی طرح کتب خانے کی عمارت میں بھی وقتاً فوقتاً حسب ضرورت اضافہ ہوتا رہا ہے، موجودہ عمارت کا آغاز ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء میں ہوا، اس وقت صرف ایک ہال تعمیر کیا گیا تھا، اب یہ عمارت دو بڑے ہال اور آٹھ چھوٹے بڑے کمروں پر مشتمل ہے، یہ کتب خانہ ملک کے ممتاز کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔

کتب خانۂ دارالعلوم میں کتابوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے، اس میں تقریباً نصف کتابیں درسیات پر مشتمل ہیں، یہ عظیم علمی سرمایہ دارالعلوم کی جان اور ہندوستان کے مسلمانوں کی فیاضی اور علم دوستی کا بے نظیر کارنامہ ہے، کتابوں کا بیشتر ذخیرہ "دانہ دانہ ہمی شود انبار" کا مصداق ہے، یعنی زیادہ تر وہ کتابیں ہیں جو دارالعلوم کو عطیے کے طور پر

وقتاً فوقتاً ملی ہیں، متعدد زبانوں میں مختلف علوم وفنون پر کتابوں کی موجودگی اور ان کی غیر معمولی معنویت دیکھنے والے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی، ان کتابوں میں گو بڑی تعداد مطبوعات کی ہے مگر مخطوطات کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ یہاں موجود ہے، جس میں بہت سی کم یاب اور نادر الوجود کتابیں بھی موجود ہیں، بعض مخطوطات فنِ خطاطی کے لحاظ سے ممتاز ہیں اور بعض اپنی قدامت کی وجہ سے لائق توجہ ہیں۔ بعض کتابیں مصنفین کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہیں اور بعض وہ ہیں جو مصنّف کے اصل نسخے سے منقول ہیں۔ چند مخطوطات ایسے بھی ہیں جن کی نسبت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اور کسی دوسرے کتب خانے میں موجود نہیں ہیں۔ بعض کتابیں شاہی کتب خانوں کی زینت رہ چکی ہیں، اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ دار العلوم کا کتب خانہ ہند و پاک کے بہترین کتب خانوں میں سے ایک ہے تو اس میں مبالغہ نہ ہوگا۔

بعض مخطوطات پر چھ چھ سو اور سات سات سو برس گزر چکے ہیں، مگر کاغذ اپنی حالت پر قائم ہے، سیاہی کا یہ حال ہے کہ گویا لکھنے والا ابھی لکھ کر اٹھا ہے، کاغذ اور حسن تحریر دیکھنے کے لائق ہے، کیا مجال کہ سیکڑوں صفحات لکھنے پر خط کی یکسانیت اور سیاہی کے رنگ اور قلم میں ادنیٰ فرق پیدا ہو جائے۔

بہت سے مخطوطات کے نقوش سونے اور جواہرات کے محلول سے بنائے گئے ہیں، علم کی قدردانی اور اس کی تزئین و آرائش میں شاید ہی

کسی قوم نے مسلمانوں سے زیادہ دل چسپی کا مظاہرہ کیا، تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ کاغذ کی ساخت اور خط کی شان میں عہد بعہد ترقی ہوتی گئی ہے، ان کتابوں سے اسلامی ممالک کی تہذیب و تمدّن اور علمی کاموں سے مسلمانوں کی دلچسپی اور شغف کا فی الجملہ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

دارالعلوم کے کتب خانے میں کتابوں کا گو بڑا ذخیرہ عربی فارسی اور اردو زبانوں میں ہے، تاہم عبرانی، ترکی، لاطینی، انگریزی ہندی، گجراتی، سندھی، پنجابی، پشتو، بنگلہ، کنڑی، ٹیمل، سنسکرت اور بھاکا وغیرہ زبانوں کی کتابیں بھی موجود ہیں۔

کتب خانے میں کچھ کتابیں ترکی کے سلطان محمد رشاد خاں، سلطان ابن سعود ملک نجد و حجاز، بادشاہ افغانستان ظاہر شاہ شاہِ ایران، نظام دکن، اور صدر عرب جمہوریہ جمال عبدالناصر کی عطا کی ہوئی ہیں۔

قدیم مشرقی کتب خانوں کی طرح کتابوں کی تقسیم زبان اور علم کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنی ایک فن و موضوع سے تعلق رکھنے والے تمام کتابیں اس فن کے تحت رکھی گئی ہیں، عربی، فارسی، اور اردو کی کتابیں بلحاظ زبان علیٰحدہ علیٰحدہ کمروں میں رکھی ہوئی ہیں۔

دارالعلوم کے کتب خانے سے استفادے کے لئے تحقیقی کام کرنے والے اسکالر ہمیشہ آتے رہتے ہیں جن میں غیر مسلم اور غیر ملکی

سبھی ہوتے ہیں۔

جامعۂ طبّیہ

جامعۂ طبّیہ کی عمارت بھی وسیع اور کشادہ ہے، اس میں متعدد درس گاہوں کے علاوہ مطب، آپریشن اور دوا خانے کے کمرے علیٰحدہ علیٰحدہ ہیں، مریضوں کے لئے دو وسیع ہال ہیں یہ عمارت ابھی حال ہی میں تیار ہوئی ہے۔

مہمان خانہ

مہمان خانے کی عمارت بھی وسیع اور کشادہ ہے، یہ عمارت دو منزلہ ہے۔

ان عمارتوں کے علاوہ اور بھی متعدد درس گاہیں اور مختلف دفاتر کی عمارتیں ہیں، مطبخ کی بھی ایک مستقل عمارت ہے جو متعدد حصّوں پر مشتمل ہے۔

فضلائے دارالعلوم کی علمی خدمات

گزشتہ سو سال کی مدت میں جہاں تک فضلائے دارالعلوم کی کارکردگی اور خدمات کا تعلق ہے، اس میں مدرسین و مصنّفین کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ بہت سے مشائخ طریقت بھی ہیں اور مفتی و مناظر بھی، اہلِ قلم بھی ہیں اور صحافی بھی خطابت و قیادت کے شہسوار بھی ہیں اور طبیب و صنّاع بھی موجود ہیں، درج ذیل اعداد و شمار سے اس کی تفصیل معلوم ہو سکتی ہے، اس سے واضح ہوگا کہ فضلائے دارالعلوم نے مسلمانوں کی زندگی کے کن کن شعبوں میں کیا کیا خدمات انجام دی ہیں، یہ تفصیل سنہ ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء سے سنہ ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء تک

کی خدمات پر مشتمل ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اگر ایک شخص نے ایک سے زائد کاموں میں حصہ لیا ہے تو ہر کام میں اس کا نام شمار کیا گیا ہے [۱]

مشائخ طریقت	۵۳۶	خطیب و مبلّغ	۴۲۸۸
مدرسین	۵۸۸۸	صحافی	۶۸۴
مصنفین	۱۱۶۴	طبیب	۲۸۸
مفتی	۱۷۸۴	صنّاع و تاجر [۲]	۷۴۸
مناظر	۱۵۴۰		

فضلائے دارالعلوم دیوبند نے ہند و پاک میں جو چھوٹے بڑے مدارس و مکاتب قائم کئے ہیں ان کی مجموعی تعداد ۸۹۳۶ ہے۔

سنہ ۱۲۸۳ھ سے سنہ ۱۳۸۳ھ تک دارالعلوم کا سو سال کا مجموعی خرچ ۴۶۹۴۷،۱۰۸ روپے ہے، اس میں سے تعمیرات پر ۱۱،۰۰۸۹۵ روپے صرف ہوئے، اس رقم کو منہا کرنے کے بعد ۴۶،۰۵،۹۷ روپے باقی رہتے ہیں، اس رقم کو ۷۴۱۷ طلبار پر تقسیم کیا جائے جنھوں نے ایک سو سال میں فراغت حاصل کی ہے تو فی طالب علم ۱۳۱۴ روپے صرف ہوئے

---

[۱] دارالعلوم ص ۸۶ [۲] یہ ایسے صنّاع اور تاجروں کی تعداد ہے جنھوں نے صنعت و حرفت اور تجارت کے ساتھ ساتھ دینی خدمات بھی انجام دینے میں... حصّہ لیا ہے۔

اس رقم میں مدرسین وملازمین کی تنخواہوں کے علاوہ دوسرے تمام مصارف بھی شامل ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۳ سو روپے سے بھی کم فی طالب علم مصارف کا اوسط نکلتا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دارالعلوم دیوبند نے ۱۳ سو روپے میں ایک ایسا مکمل عالم تیار کر دیا جو مسلمانوں کی دینی ضرورتوں، تدریس وتبلیغ وعظ وتقریر، تصنیف وتالیف، افتاء اور مناظرے وغیرہ کے کاموں کو باحسن وجوہ انجام دے سکتا ہے،[1]

غالباً دنیا کی کسی بھی درسگاہ میں اس قدر قلیل ترین مصارف میں اس معیار کی تعلیم کی مثال موجود نہیں ہے؛ پھر نہ صرف یہ بلکہ فضلائے دارالعلوم میں آپ کو ایسی ایسی شخصیتیں بھی کچھ کم نظر نہیں آئیں گی جن پر اگر ہزاروں روپے کی رقم بھی محض ان میں سے کسی ایک پر ہی نچھاور کر دی جاتی تب بھی یہ سودا گراں ثابت نہ ہوتا۔[2]

---

[1] دارالعلوم ص ۹۰

[2] اس موقع پر امام مالکؒ کے استاذ امام ربیعۃ الرائے کا واقعہ بے ساختہ زبانِ قلم پر آگیا، اس واقعے سے مسلمانوں کے علمی ذوق اور قدر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

امام ربیعۃ الرائےؒ جلیل القدر تابعی گزرے ہیں، فقہ میں خاص امتیاز حاصل تھا، یہ بطن مادر میں تھے کہ ان کے والد فروخ سلطنت کی جانب سے خراسان کی مہم کے افسر بنا کر بھیجے گئے، یہ اسلامی فتوحات کے (باقی صفحہ ۳۹۴ پر)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن ، مولانا محمد انور شاہ کشمیری ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ، مولانا عزیز الرحمٰن مفتی دار العلوم ، مولانا عبید اللہ سندھی ، مولانا منصور انصاری ، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی ، علامہ شبیر احمد عثمانی ، مولانا سید حسین احمد مدنی ، مولانا حفظ الرحمٰن رحمہم اللہ ، مولانا محمد طیب مہتمم دار العلوم ، مولانا منت اللہ رحمانی ، مولانا محمد منظور نعمانی ، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی ، مولانا سعید احمد اکبر آبادی وغیرہم علمائے کرام اس کی روشن اور تابناک مثالیں ہیں ۔

(بقیہ صـ۳۹۳ کا حاشیہ) شباب کا دور تھا ، لوگ تبلیغ اسلام کی روح سے سرشار تھے ، فروخ کو اس مہم میں ۲۷ برس لگ گئے ، اس عرصے میں ربیعۃ الرائے پیدا ہوئے اور علم دوست ماں کی آغوش تربیت میں جوان ہوئے ۔

فروخ نے سفر پر جاتے ہوئے ۳۰ ہزار اشرفیاں جوان کی عمر کا اندوختہ تھیں ، بیوی کے سپرد کی تھیں ، مدینہ اس زمانہ میں مدینۃ العلم بنا ہوا تھا ، صحابۂ کرام رضؓ کی علمی مجلسیں جا بجا قائم تھیں ، نیک بخت خاتون نے یہ تمام اشرفیاں بیٹے کی تعلیم و تربیت پر صرف کر دیں ، فروخ جب تک لوٹے بیٹا امام وقت بن چکا تھا اور امام مالکؒ اور خواجہ حسن بصریؒ جیسے ائمہ اُن کے تلمذ کا فخر حاصل کرنے میں مصروف تھے ۔

فروخ جب لوٹ کر آئے تو سیدھے گھر پہنچے ، دروازہ کھٹ کھٹایا ربیعہ باہر آئے ، دروازہ کھولا ، نہ باپ نے بیٹے کو پہچانا (باقی صـ۳۹۵ پر)

اساتذہ وطلباء کی معاشرتی زندگی

کسی ادارے کی صلاحیت اور کارکردگی کا اندازہ کرنے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس نے کیسے افراد پیدا کئے ہیں اور انھوں نے ملّی زندگی کو کیا دیا ہے؟

(بقیہ صـ۳۹۴ سے آگے) اور نہ بیٹے نے باپ کو، فروخ نے بے تکلف گھر میں داخل ہونا چاہا تو ربیعہؒ نے سختی سے ڈانٹا کہ "او دشمنِ خدا! غیر کے گھر میں کیوں گھسا جاتا ہے؟" فروخ کو یہ سن کر طیش آگیا، بولے خدا کے دشمن! تو کون ہے جو مجھ کو اپنے گھر میں جانے سے روکتا ہے"! غرض بات بڑھی، محلّے کے لوگ جمع ہو گئے، امام مالکؒ بھی استاد کا معاملہ سمجھ کر تشریف لائے اور نرمی سے فروخ کو سمجھانا چاہا، انھوں نے کہا "میرا نام فروخ ہے یہ میرا مکان ہے"، ربیعہؒ کی والدہ نے نام سن کر پہچانا اور پکار کر کہا "یہ تو ربیعہ کے باپ ہیں، اب باپ بیٹے گلے ملے اور گھر میں آئے، جب اطمینان سے بیٹھے تو ۳۰ ہزار اشرفیاں یاد آئیں، بیوی سے پوچھا کہ "اشرفیاں جو میں نے تمھیں دی تھیں وہ ہیں؟" بیوی نے جواب دیا کہ "حفاظت سے رکھی ہوئی ہیں"!

فروخ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے گئے تو دیکھا کہ ربیعہ مسندِ درس پر بیٹھے ہوئے ہیں، چاروں طرف شاگردوں کا ہجوم ہے، فروخ نے یہ عالم دیکھا تو فرطِ مسرت سے بے خود ہو گئے، خوش خوش گھر آکر بیوی سے کیفیت بیان کی، بیوی نے کہا "آپ کو کیا زیادہ پسند ہے بیٹے کی یہ شان و شوکت یا ۳۰ ہزار اشرفیاں؟" فروخ نے جواب دیا "واللہ! اس جلالتِ شان کے مقابلے میں ۳۰ ہزار اشرفیوں کی کیا قیمت ہے"! بیوی نے کہا کہ "میں نے وہ اشرفیاں ربیعہ کی تعلیم و تربیت میں صرف کر دی ہیں، کہیئے! برا تو نہیں کیا؟" فروخ بے ساختہ بول اٹھے "خدا کی قسم تم نے میرا مال ضائع نہیں کیا" (علماءِ سلف صفحہ ۵۸-۶۰)

دارالعلوم کے قیام کا مقصد علوم اسلامیہ کے ایسے ماہرین تیار کرنا ہے جو اپنے اخلاق وکردار، بے نفسی، للّٰہیت اور ایثار وقربانی کا نمونہ بن کر اُمّت کے سامنے آئیں، دینی علوم کی تحصیل کا مقصد رضائے الٰہی، تفقّہ فی الدین، دعوت وتبلیغ اور نیابتِ انبیاء کے فرائض انجام دینا ہے۔

دارالعلوم میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک تعلیم کا مفت انتظام ہے، ہر سال تقریباً ڈیڑھ ہزار طلباء زیر تعلیم رہتے ہیں، ایک ہزار کے قریب طلباء کے خورونوش، گرمی وسردی کے کپڑے، دارالاقامہ میں جگہ، روشنی، پانی، علاج اور زیر درس کتابوں کا بھی مفت انتظام کیا جاتا ہے، چونکہ یہ سارے مصارف عوامی چندے سے پورے ہوتے ہیں، اس لئے دارالعلوم دنیا میں ایک ایسی آزاد تعلیم گاہ ہے جس سے ہر شخص بقدرِ ہمّت واستعداد فیضانِ علم حاصل کر سکتا ہے۔

ماہنامہ "دارالعلوم" اور سہ ماہی عربی مجلّہ "دعوۃ الحق" کے علاوہ دارالعلوم میں طلباء کی متعدد انجمنیں قائم ہیں، جو اپنے اپنے ماہانہ یا ہفتہ وار قلمی رسائل نکالتی ہیں، یہ قلمی رسائل شیشے کے فریم میں لگا کر صدر دروازے کے اندر آویزاں کر دیئے جاتے ہیں، یہ انجمنیں رسالے نکالنے کے علاوہ تقریری اجتماعات بھی کرتی ہیں اور سال کے آخر میں سالانہ جلسے شاندار طور پر منعقد کرتی ہیں۔

دارالعلوم کی سب سے بڑی انجمن "جمعیۃ الطلباء" ہے، بعض انجمنوں کی اپنی اپنی لائبریریاں بھی قائم ہیں، جن میں کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے، اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

احاطۂ دارالعلوم میں علی الصباح اٹھنے کے ساتھ ساتھ طلباء کی مصروفیات شروع ہوجاتی ہیں جو کم ازکم بارہ ایک بجے رات تک جاری رہتی ہیں، اسباق کے اوقات کے علاوہ دوسرے اوقات میں بھی طلباء کتاب کے مطالعہ اور سبق کی تکرار میں مصروف رہتے ہیں۔

دارالعلوم کی یہ زندگی کیا ہے؟ اس کا کسی قدر اندازہ ذیل کے موازنہ سے کیا جاسکتا ہے، یہ ایک ایسے شخص کے تأثرات ہیں جس نے مال و دولت کی آغوش میں راحت و آرام کے ساتھ اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا، یہ شخصیت جنوبی افریقہ کے مولانا عبدالحق اسمٰعیل عمرجی کی ہے، مولانا موصوف نے ۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۹ء میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، وطن پہنچ کر راقم سطور کے نام اپنے ایک والا نامے میں تحریر فرماتے ہیں:-

"دارالعلوم کے دورانِ تعلیم میں اکثر دارالعلوم کی دال روٹی دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ خوش حال گھرانے کا ایک فرد ہونے کے باوجود گھر سے دور رہنے کا یہ نتیجہ ہے کہ دارالعلوم کی دال پر زندگی کے دن گزارنے پڑتے ہیں، اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ صعوبت

ومصائب کی اس زندگی کا نہ جانے کب خاتمہ ہوگا؟ اور آج یہ حال ہے کہ اچھے سے اچھا کھانا دستر خوان پر ہوتا ہے، ہندوستان میں اس کا تصوّر بھی نہیں تھا، کھانے پینے کے سلسلے میں یہاں کا معیار دیکھ کر ہندوستان کا انسان دنگ ہوجائے گا، اس سے اندازہ لگائیے کہ پانچ سو آدمیوں کی دعوت پر ایک وقت میں دس دس ہزار روپیہ خرچ ہوجاتا ہے، ایک آدمی کے سامنے بسا اوقات دس بارہ قاب ہوتی ہیں، ہر چیز کے کھانے کا برتن علیحدہ ہوتا ہے، یہ یہاں کے کھانے کا معیار ہے، رہنے کا طرز اس قدر شاہانہ ہے کہ یہاں کے ملازم پیشہ لوگ بھی ہندوستان کے رئیسوں سے بہت آگے ہوتے ہیں، صرف شادی میں ڈھائی تین ہزار روپے کے دو پلنگ دے جاتے ہیں، موٹروں کا یہ عالم ہے کہ ڈربن جیسے شہر میں جس کی آبادی پونے پانچ لاکھ ہے پینتالیس ہزار موٹریں ہیں، اس قسم کا آرام مجھے بھی حاصل ہے، گھر کی موٹر ہے، کھانا بھی طالب علمی کے زمانے سے بہت اچھا ہوتا ہے۔

اب بتائیے کہ ایک ملاّ کو جسے دارالعلوم میں رسّی کی چارپائی پر زندگی گزارنی پڑی ہو، جس کی قیمت زیادہ سے زیادہ آٹھ روپے ہوگی اسے ہزار ڈیڑھ ہزار روپے کے پلنگ کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ یہاں ہر قسم کا آرام ہے، اسی سے اندازہ لگائیے کہ یہاں آنے کے بعد پچاس رطل کا وزن میں اضافہ ہوگیا ہے،

یہاں کے اعتبار سے کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہوں، پھر بھی ایک سب سے بڑی چیز کی کمی ہے اور وہ ہے "ماحول" یہاں آکر اس کا احساس بہت زیادہ ہوتا ہے، اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ دارالعلوم کی واں زحمت نہیں بلکہ بہہ وجوہ رحمت و رافت تھی، یہاں سب کچھ ہے، مگر وہ ماحول نہیں، ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ کچھ بھی نہیں ہے، اور دارالعلوم میں کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ تھا، کاش کوئی تبادلۂ مقام پر آمادہ ہو جائے یہاں آکر دل بجھ گیا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آنے کے بعد گم ہو گیا ہوں" [1]

علمائے اسلام کی ہمیشہ یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ علم کو دین کے لئے حاصل کرتے تھے، چنانچہ اسلامی تاریخ کا یہ زرّیں واقعہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جب بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم ہوا اور اس کے اساتذہ اور طلباء کے لئے گراں قدر مشاہرے اور وظائف مقرر ہوئے اور اسی کے ساتھ ہر قسم کا سامانِ آسائش مہیا ہو گیا تو علمائے بخارا نے "زوالِ علم" کی مجلسِ ماتم منعقد کی، اور اس پر اظہارِ افسوس کیا کہ اب علم، علم کے لئے نہیں بلکہ جاہ و ثروت کے لئے حاصل کیا جائے گا!

---

[1] مکتوب مولانا عبدالحق اسماعیل عمرجی، مؤرخہ ۶ اگست ۱۹۵۳ء / ۱۳۷۳ھ، بنام راقم سطور، سید محبوب رضوی۔

دارالعلوم کے علماء و طلباء کے پیش نظر بھی حصولِ علم کا اصل مقصد دین اور آخرت ہی رہا ہے، چنانچہ جس زمانے میں دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا، ہندوستان میں برطانوی نظامِ حکومت قائم ہو چکا تھا اور ملک میں عربی و فارسی کے بجائے انگریزی تعلیم نے لے لی تھی، جس کے سبب سے معاش کی وہ تمام راہیں جواب تک اُن علوم کے ذریعے سے کھلتی رہی تھیں یکسر بند ہو چکی تھیں۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اکثر اپنے درس میں فرمایا کرتے تھے کہ :-

"جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں اُن کا مقصد تحصیل علم سے یا تو دین ہوتا ہے یا فقط دنیا، ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو علم کو محض علم کے لئے حاصل کرتے ہیں، یہ بھی غنیمت ہے، لیکن علم سے معاش کا کام لینا اور اسی مقصد کے لئے اسے حاصل کرنا ایک بدترین معصیت ہے! اُن لوگوں کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو بازار سے ایک قیمتی شال اس لئے خرید کرتا ہے کہ وہ اس سے اپنے جوتے صاف کیا کرے گا"!

اس کے بعد طلباء سے تاکیداً فرماتے کہ "تم لوگوں کو سب سے پہلے اپنی نیت اور ارادے کا جائزہ لینا چاہیئے اور یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ تم میں سے کون شخص کس طبقے میں شامل ہونا چاہتا ہے"۔

علمائے دارالعلوم نے اپنی خدمات کا مناسب معاوضہ لینے میں ہمیشہ للّٰہیت اور عالی ہمتی سے کام لیا ہے، انھوں نے دارالعلوم پر کم سے کم مشاہرے کا بار ڈالا، اور اپنی اعلیٰ ترین قابلیتوں کے باوجود جن کی بنا پر وہ کسی دوسری درس گاہ میں بیش قرار تنخواہیں پا سکتے تھے، دین کی خدمت کو ترجیح دی، سادہ اور غریبانہ زندگی بسر کی چنانچہ حضرت مولانا رفیع الدینؒ جو دارالعلوم کے دوسرے مہتمم تھے، صرف ۲۰ روپے ماہانہ تنخواہ لیتے تھے، حضرت شیخ الہندؒ نے مجلسِ شوریٰ کے اصرار کے باوجود ۵۰ روپے سے زیادہ مشاہرہ لینا پسند نہیں فرمایا، حضرت شاہ صاحبؒ نے متاہلانہ زندگی سے پہلے تنخواہ ہی لینا گوارہ نہیں کیا، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے کبھی تنخواہ نہیں لی، لیکن اگر یہاں کے کسی مدرس نے دارالعلوم کے رشتے کو منقطع کر کے کسی دوسری جگہ تعلق پیدا کیا تو اسی شخص کو جسے دارالعلوم میں ۷۰ یا ۸۰ روپے ملتے تھے چار چار اور پانچ پانچ سو کی جگہ مل گئی، دارالعلوم کے پانچویں مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کو جب نظامِ دکن نے ریاست حیدرآباد کے منصب افتاء کے لئے طلب فرمایا تو اس گہرے تعلق کی بنا پر جو فرماں روائے دکن کو دارالعلوم سے تھا، مجلسِ شوریٰ نے مناسب نہیں سمجھا کہ انکار کر دیا جائے، خود مفادِ دارالعلوم کا تقاضا بھی یہی تھا، جس کے .... خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہوئے، چنانچہ حضرت ممدوح نے اس منصب کو قبول

فرمالیا، اس منصب کا مقررہ مشاہرہ ایک ہزار روپے تھا۔

یہ تھی قیمت اُس شخص کی جس کو دارالعلوم میں صرف ۸۵ روپے ماہانہ ملتے تھے، اسی کے ساتھ اگر اس فرق کو بھی ملحوظ رکھا جائے جو تعلیمی حیثیت سے کالجوں، یونیورسٹیوں اور دارالعلوم کے درمیان میں پایا جاتا ہے تو یہ چیز اور زیادہ نمایاں ہوجاتی ہے، کالجوں میں زیادہ سے زیادہ ایک پروفیسر کو ۳ گھنٹے پڑھانا پڑتا ہے جبکہ دارالعلوم میں مسلسل چھ گھنٹے ہوتے ہیں اور بعض بعض اساتذہ تو خارج اوقات میں بھی کئی کئی سبق پڑھاتے ہیں، یہاں بعض ایسے اساتذہ بھی ملیں گے جن کا دن رات کا مشغلہ درس وتدریس ہی نظر آئے گا۔

دارالعلوم کا طرز زندگی ابتدا سے سادگی اور بے تکلفی پر مشتمل رہا ہے، اس نے اپنے طرز تعلیم میں جفاکش، صحت مند، پاکیزہ اور روح پرور معیار زندگی کو پیش نظر رکھا، جو ہندوستان کی قدیم علمی روایات کا طغرائے امتیاز رہا ہے، اس کی درس گاہیں اور دفاتر ظاہری شان وشوکت سے ہمیشہ مستغنی رہے ہیں، اس کے کارکن اساتذہ اور طلباء اپنی سادہ وضع کے ساتھ اپنی زندگی گزارنے اور اپنے فرائض ادا کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، دارالعلوم کے ماحول میں لوگ اپنے کاموں کو بالعموم اپنے ہاتھوں سے انجام دینے کے عادی ہیں، کپڑے دھونا ان کے نزدیک عار نہیں ہے، مسجد دارالعلوم کی بنیاد کی تعمیر میں علماء وطلباء نے جس جوش وخروش کا اظہار کیا

وہ آپ گزشتہ صفحات میں ملاحظہ فرما چکے ہیں، ایسا ہی واقعہ دارالحدیث کی بنیاد کے وقت پیش آیا، اس موقعہ پر بھی طلبار اور اساتذہ نے جس مخلصانہ ہمّت ۔ ۔ ۔ اور جوشِ عمل کا مظاہرہ کیا وہ علمار کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ ہے جسے بھلایا نہیں جاسکتا، روداد میں لکھا ہے :-

"جلسۂ دارالحدیث کے دن سنگِ بنیاد تو رکھ دیا گیا مگر بنیاد تعمیر کرنے کے لئے پہلے کنکریٹ کٹوانا ضروری تھا، اس کے علاوہ کسی قدر بنیاد بھی کھودنی باقی رہ گئی تھی، ابھی کنکریٹ ڈال کر کوٹنا ہی شروع کیا تھا کہ زور شور کی بارش ہوگئی، اور قریبی تالاب پانی سے بھر گیا حتیٰ کہ دارالحدیث کی بنیادیں تک پانی سے لبریز ہوگئیں، یہ قطعۂ زمین تالاب ہی کا ایک حصہ تھا، جو تھوڑی مدت پہلے ہی اٹوایا گیا تھا مٹی چونکہ ابھی پختہ نہ ہوئی تھی اس لئے گر گئی اور بنیاد کا حال دَل دَل کا سا ہوگیا، درس گاہوں تک پانی کے پہنچ جانے سے عمارتوں کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔

اِدھر تو یہ حالت تھی اُدھر مزدور بالکل نہیں ملتے تھے بارش کے تواتر سے یہ احتمال بھی نہ تھا کہ پانی دو چار روز میں خشک ہوجائے گا، ڈال لگوا کر پانی نکلوانا شروع کیا مگر سارے دن میں بمشکل بہت تھوڑا سا پانی نکل سکا بالآخر نمازِ عصر کے بعد اساتذہ و طلبار نے کمرِ ہمت باندھی

بالٹیاں لے کر کھڑے ہو گئے اور ایک گھنٹہ میں تمام پانی نکال کر تالاب میں ڈال دیا، پانی نکل جانے پر معلوم ہوا کہ ابھی ایک سخت مرحلہ اور باقی ہے، بنیاد میں نصف قد آدم دلدل ہو گئی تھی، اس موقع پر اساتذہ و طلبار کی محنت و جانفشانی کا منظر قابلِ دید تھا، کئی سو طلبار لگے ہوئے تھے اور قطاریں بنا کر آناً فاناً میں گارے کی بالٹیاں بھر بھر کر تالاب میں پہنچا رہے تھے، رجزیہ اشعار پڑھتے جاتے تھے اور ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی فکر میں لگا ہوا تھا، اس مقابلے و مسابقت میں اور بھی لطف تھا، طلبار نے دو جماعتیں بنا کر کام کو نصف نصف تقسیم کر لیا تھا اس طرح جو کام مزدوروں سے مہینے بھر میں ہونا مشکل تھا وہ طلبار نے دو دن میں پورا کر دیا، کنکریٹ کی کٹائی میں بھی طلبار نے حصہ لیا، یہ کام تنہا معماروں اور مزدوروں سے شاید ایک ماہ میں ختم ہوتا، لیکن طلبار نے اس جد و جہد سے کنکریٹ، اینٹ اور چونا موقع پر پہنچایا کہ ایک ہفتے میں بنیادیں اوپر آ گئیں"۔ [1]

غرض کہ علم و عمل کی سادگی، بے تکلفی اور جفاکشی اس جماعت کا

---

[1] روداد ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۱ء ص ۳۲

شعار رہی ہے، اسی سادگی، بے تکلفی اور کفائت شعاری کا اثر ہے کہ دار العلوم کے علما، و طلبا، کا لباس بجز معمولی کرتے، پاجامے اور دوپلی ٹوپی کے کوئی مخصوص اور امتیازی لباس نہیں ہے، یہی حال کھانے کی سادگی کا ہے، آرائشی فرنیچر کی انھیں چنداں ضرورت پیش نہیں آتی، صرف چارپائی اور بوریہ یا ٹاٹ کا معمولی فرش ان کے بیٹھنے، مطالعہ کرنے اور سونے کے لیے کافی ہے۔

جدید تہذیب و تمدّن کی طرح جس میں زندگی کے لئے گوناگوں بے شمار تکلفات پیدا کر لئے گئے ہیں وہ اپنے آپ کو کم کر دینے کے عموماً عادی نہیں ہوتے، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ بڑی سے بڑی تکلیف برداشت کر لینے کے خوگر ہو جاتے ہیں۔

دار العلوم کے ابتدائی زمانے ہی میں فضلائے دار العلوم کے بارے میں یہ تصور قائم ہو گیا تھا کہ فراغت کے بعد طلبائے دار العلوم کے لئے عزت و وقار کے ساتھ حصولِ معاش کے ذرائع پیدا ہو جاتے ہیں، چنانچہ ۱۲۹۸ھ کی روداد میں لکھا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے دار العلوم سے فراغت حاصل کرنے والوں کو عوام و خواص میں بڑی قدر و عظمت اور فراغت و مقبولیت عنایت فرمائی ہے، معاش کے لحاظ سے بھی ان کی حالت بہتر ہے، وہ پندرہ روپے سے لے کر پچیس روپے تک تنخواہ پاتے ہیں اور برابر ملک سے ان کی طلب آتی رہتی ہے"[1]

---

[1] روداد جلسۂ انعام ۱۲۹۸ھ ص ۱۵

اب تک دارالعلوم کی آغوش علم و تربیت سے ہزاروں علماء و فضلاء پیدا ہو چکے ہیں، جو اسلام کا کلمہ بلند کرنے کے لئے دنیائے اسلام کے بیشتر ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں، روس کی شمالی سرحد سے لے کر افغانستان، ایران اور مغربِ اقصیٰ تک اور مشرقی ترکستان یعنی چین سے لے کر کشمیر و چترال کی وادیوں، آسام کی پہاڑیوں اور سیلون برما، ملایا، جاوا، سماٹرا، مارشیس، جنوبی افریقہ اور یوگنڈا تک پہنچ کر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت انجام دے چکے ہیں، حتیٰ کہ دنیائے اسلام کے مرکز مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں مدرسۃ الشرعیہ وغیرہ اسلامی علوم کی درس گاہیں قائم کر کے اسلامی تعلیمات کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں، ان میں صاحبِ درس و افتاء بھی ہیں اور مصنّف و مبلّغ بھی، امراضِ روحانی کے معالج بھی ہیں اور امراضِ جسمانی کے طبیب بھی، واعظ بھی ہیں اور ادیب بھی، لیڈر بھی ہیں اور اخبار نویس بھی، قاضی بھی ہیں اور مجالسِ مقنّنہ کے رکن بھی، مفکر بھی ہیں اور فلسفی بھی، غرض کہ مسلمانوں کی علمی، اخلاقی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کا کوئی گوشہ نہیں جس میں دارالعلوم کے فیض یافتہ موجود نہ ہوں، ایک مرتبہ لاہور کے مشہور روزنامہ "سیاست" نے لکھا تھا کہ :-

"جہاں تک تحفّظِ دین، تردیدِ مخالفین اور اصلاحِ مسلمین کا تعلق ہے، دارالعلوم دیوبند کے مدرسین و مبلّغین کا حصّہ سارے ہندوستان سے بڑھ چڑھ کر ہے، مثال کے طور پر

ان غیر محدود کوششوں کو ملاحظہ کرلیا جائے جو آریہ سماج نے اسلام کے خلاف کیں، تو آپ کو روزِ روشن کی طرح نظر آئے گا کہ ان مساعی کے مقابلے میں سب سے نمایاں طریق پر جو سینہ سپر ہوا وہ مدرسۂ عالیہ دیوبند ہی ہے، اور دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں دینِ حنیف، علوم عربیہ، تفسیر، حدیث اور فقہ کے چرچے بعونہ تعالیٰ بہت حد تک دیوبند کے وجودِ مسعود کی وجہ سے قائم ہیں۔" [1]

کلکتہ کے اخبار "عصرِ جدید" نے علمائے دارالعلوم کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"دارالعلوم دیوبند اسلام کی جو مذہبی اور تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے، اور مغربی تہذیب و تمدن کے سیلاب سے جس طرح اُس نے اسلامی ہند کی روحانی عمارت کو محفوظ رکھا ہے ہندوستان کے طویل و عریض برِّ اعظم کا ایک ایک گوشہ اس کی گواہی دے سکتا ہے، ایسے وقت میں جب کہ علومِ جدیدہ کی روشنی نے ظاہر بیں نظروں کو خیرہ کر دیا تھا، جب کہ دنیاوی عزت اور مناصب کی کشش اچھے اچھے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی، جب کہ لوگ مذہب سے بے پروا اور

---

[1] روزنامہ "سیاست لاہور، ۲۷ جون ۱۹۲۳ء

مذہبی تعلیم کی طرف سے غافل ہو چکے تھے، اور قال اللہ و قال الرسول کی مقدّس آواز نئی تعلیم کے نقار خانہ میں دب گئی تھی اور مغربی تعلیم و تمدّن کے شور و غوغا سے مغلوب ہو چکی تھی اس نازک وقت میں دیوبند اور صرف دیوبند تھا جو قرآن و حدیث کے عَلَم کو سنبھالے ہوئے کھڑا رہا، ملک کی غفلتوں اور سرد مہریوں کی آندھی نے رہ رہ کر اس کو گرانا چاہا مگر وہ پہاڑ کی طرح قائم رہا، فاتح تہذیب کی خندہ زنی اس کو اپنی قدامت سے منحرف نہ کر سکی، نئی تعلیم کے سیلاب نے چاہا کہ اپنی رو میں اسے بہا لے جائے مگر کس مپرسی کے باوجود وہ ایک طرف اپنے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا اور دوسری طرف اپنی روحانیت کی روشنی ملک کے ہر ہر گوشے میں پہنچاتا رہا، یہاں تک کہ مسلسل جد و جہد کے بعد آج نہ صرف پشاور اور رنگون بلکہ قفقاز، موصل، بخارا اور اسلامی دنیا کے ہر حصے سے فدائیان قرآن و حدیث آ آ کر پروانہ وار اس کے گرد مجتمع ہیں۔"[1]

اب سے تقریباً نصف صدی پہلے ہندوستان کے ایک بڑے تاجر نے لکھا تھا کہ :-

"میں دیکھتا ہوں کہ ہندوستان کے اکثر حصّوں میں جہاں

---

[1] روزنامہ "عصرِ جدید" کلکتہ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۳۶ء

کہیں کسی درس گاہ، انجمن یا مدرسہ و مکتب میں کسی ذی استعداد عالم کی ضرورت ہوتی ہے تو دارالعلوم دیوبند ہی سے بلایا جاتا ہے، اور وہیں کے تعلیم یافتہ عالم اور مدرس یہ قابلیت رکھتے ہیں کہ ہر قسم کی کتابیں بخوبی پڑھا سکیں، کلکتہ، بمبئی، دہلی، کانپور، الٰہ باد، بنارس، بریلی، آگرہ میرٹھ جس جگہ بھی آپ دیکھیں گے آپ کو دارالعلوم ہی کے فیض یافتہ مسندِ درس پر بیٹھے ہوئے ملیں گے۔"[1]

مشہور علمائے کرام

دارالعلوم کے ہزاروں فرزندوں میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا احمد حسن محدّث امروہیؒ مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، مولانا عبدالعلی محدث دہلویؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا صدیق احمد انبہٹویؒ، مولانا خلیل احمد مؤلف بذل المجہود شرح ابوداؤد، مولانا منصور علی خاں مراد آبادی

---

[1] دارالعلوم دیوبند کی سیر اور اس کی مختصر تاریخ از محمد رفیع میرٹھی، مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی ص ۲ سنہ ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۶ء۔

مولانا نواب محی الدین خاں قاضی ریاست بھوپال، مولانا عبدالرزاق قاضی القضاۃ دولت افغانستان، مولانا عبدالحق پور قاضوی، مولانا حافظ محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی، مولانا سید مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولانا سیف الرحمٰن کابلی، مولانا عبداللہ امبیٹوی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مولانا ماجد علی پرنسپل دینیات مدرسہ عالیہ کلکتہ، مولانا محمد ابراہیم آروی، مولانا حافظ عبدالرحمٰن محدث امروہی، مولانا شاہ وارث حسن لکھنوی، مولانا محمد یحییٰ سہسرامی پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ، مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی محدث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، مولانا غلام رسول ہزاروی، مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری، مولانا عبیداللہ سندھی مولانا محمد میاں منصور انصاری، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا سید احمد بانی مدرسۃ الشرعیہ مدینہ منورہ، مولانا سعید احمد محدث چاٹگام، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری، صدر مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، مولانا فضل ربی رکن ہیئۃ تمیزیہ حکومت افغانستان مولانا عبدالعزیز خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ، مولانا نجم الدین پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور، مولانا میاں سید اصغر حسین دیوبندی، مولانا رسول خاں ہزاروی، مولانا محمد اعزاز علی امروہی مدرس دارالعلوم

مولانا سید فخر الدین شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا عبد السمیع دیوبندی، مولانا سراج احمد میرٹھی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا مفتی محمد سہول پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، مفتی محمد نعیم لدھیانوی، مولانا محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند مولانا احمد علی مفسر لاہور، مولانا مناظر احسن گیلانی، سابق صدر دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا حفظ الرحمٰن ناظم جمعیۃ علماء ہند، مولانا شائق احمد ایڈیٹر اخبار "عصر جدید" کلکتہ، مولانا مظہر الدین ایڈیٹر "الامان" دہلی، مولانا حبیب الرحمٰن خیری ایڈیٹر اخبار "نجات" بجنور، مولانا احسان اللہ خاں تاجور" ایڈیٹر "ادبی دنیا" لاہور، مولانا شمس الحق افغانی، مولانا عبد الحق اکوڑہ خٹک، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ناظم اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر "برہان" دہلی و سابق صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مولانا سید محمد میاں دیوبندی سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا معظم علی نگینوی، مولانا سید منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ، مولانا محمد منظور نعمانی ایڈیٹر "الفرقان" لکھنؤ، مولانا حامد الانصاری غازی سابق ایڈیٹر "مدینہ بجنور"، مولانا قاضی زین العابدین سجاد قاضی شہر میرٹھ، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا قاضی سجاد حسین صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتح پور دہلی، مولانا محمد سالم قاسمی رئیس جامعہ دینیات اردو

مولانا اسعد مدنی ناظم اعلیٰ جمعیۃ علما، ہند، مولانا انوار الحسن شیرکوٹی
مولانا حفظ الرحمن مؤسس جامعہ شریفیہ دہلی، مولٰنا
عبدالصمد صارم وغیرہم جیسے علماء کرام جو آسمانِ علم کے
آفتاب و ماہتاب ہیں ——— اسی درس گاہ
کے فیض یاب اور اسی مے خانے کے جرعہ نوش ہیں!

یہ وہ حضرات ہیں جو اپنے علم و فضل، درس و تدریس، رُشد
و ہدایت، دعوت تبلیغ، سیاسی قیادت، تصنیفی اور صحافتی
کمالات کے باعث دنیائے اسلام سے خراجِ تحسین وصول کر چکے
ہیں، ان ... مشاہیر کارناموں سے ان کے مقامی خطّے اور ملک
کے دینی و غیر دینی حلقے ہی واقف نہیں بلکہ ہندوستان و پاکستان کا
کونہ کونہ اور چپّہ چپّہ ان کے فیوضِ علمیہ سے سیراب ہو رہا ہے

دارالعلوم سے فارغ ہونے والوں کا سالانہ اوسط
ڈھائی سو سے زائد ہوتا ہے، مگر جہاں تک ان کی مانگ کا تعلق
ہے وہ روز بروز بڑھ رہی ہے، بلکہ بعض اوقات مانگ کا
پورا کرنا دارالعلوم کے لئے مشکل ہو جاتا ہے، اس لحاظ
سے دیکھا جائے تو فضلائے دارالعلوم کا مستقبل روشن اور
لائق اطمینان ہے۔

دارالعلوم کا عالم اسلامی سے رابطہ

دارالعلوم دیوبند ایک دینی تعلیم گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا علمی اور ثقافتی مرکز بھی ہے، جس میں ہندوستان کے علاوہ ایشیا، اور افریقہ کے بہت سے ملکوں سے آئے ہوئے طلبا، کی ایک بڑی تعداد ہر وقت موجود رہتی ہے، اس بنا، پر دارالعلوم ایک ایسا ثقافتی مرکز بھی بن گیا ہے جو غیر ممالک میں ہندوستان کی شہرت اور دوسرے ایشیائی ممالک میں رابطہ کا ایک بڑا ذریعہ ہے، اس میں مسلم ممالک کے طلبا، دینی علوم حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں اور واپسی پر ہندوستان کے تعارف اور عظمت کا سبب بنتے ہیں۔

اوپر گزر چکا ہے کہ دارالعلوم کے قائم ہوتے ہی اس کی شہرت کا آوازہ دور دراز ممالک تک پہنچ گیا تھا، چنانچہ پہلے ہی سال میں افغانستان کا ایک طالب علم نظر آتا ہے، اور پھر چند سال کے بعد مکہ مکرمہ کے ایک طالب علم صفدر علی کو ہم دارالعلوم میں زیر تعلیم دیکھتے ہیں [1]، دارالعلوم میں اعزازی طور پر آنے والے ہندوستان

---

[1] روداد ۱۲۸۹ھ ص ۶۵

کے اردو اخبارات کے علاوہ ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء میں جو دارالعلوم کی عمر کا نواں سال تھا قسطنطنیہ کا ایک اخبار "الجوائب"[1] آنا شروع ہو گیا تھا یہ ترکی کا ایک مؤقر اخبار تھا[2] اسی طرح بیروت سے "البلاغ" اور "روضۃ المعارف" کے پرچے دارالعلوم میں آتے تھے[3]۔

۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء میں ترکی کے ایک عالم احمد حمدی نے اپنی ایک گراں قدر

---

[1] یہ ہفتہ وار اخبار تھا، جو ۱۸۶۰ء / ۱۲۷۷ھ میں قسطنطنیہ سے ترکی کے مشہور و معروف انشا پرداز احمد فارس کی ادارت میں نکلتا تھا، یہ بڑا وقیع اور مؤقر اخبار تھا ترکی کے حکمرانوں اور اراکین حکومت کے لئے اس زمانے میں "الجوائب" کا مطالعہ ایک ضروری کام تھا، اس کی تحریروں میں قوت اور تنقید میں اثر پایا جاتا تھا، سلطان عبدالعزیز (۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء - ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء) اس کو گراں قدر مالی امداد دیتے تھے، ہندوستان میں نواب بھوپال سید صدیق حسن خاں بھی اس اخبار کی مادّی اور معنوی امداد میں شریک تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے جب کلکتہ سے اپنا ہفتہ وار اخبار "الہلال" جاری کیا تو ان کے سامنے غالباً اسی "الجوائب" کا نمونہ تھا، اس لئے کہ "الہلال" کے عنوانات اور ترتیب وغیرہ میں "الجوائب" کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

[2] روداد ۱۲۹۱ھ ص ۵۲

[3] روداد ۱۳۲۶ھ ص ۱۶۶ و ۱۳۲۸ھ ص ۲۰۱

تالیف النجم الدراری فی ارشاد الساری[1] کا ایک قلمی نسخہ دارالعلوم کے لئے عنایت کیا، اس نسخے کی خصوصیت یہ ہے کہ مؤلف نے اس کتاب کے صرف تین نسخے قلم بند کرائے تھے، ایک نسخہ قسطنطنیہ کے کتب خانے کو دیا گیا، دوسرا مصر کے کتب خانے کے لئے بھیجا گیا اور تیسرے نسخے کے لئے دارالعلوم کا انتخاب کیا گیا[2]۔ عبدالحق حامد کے ذریعے سے جو بمبئی میں ترکی کے قونصل تھے۔ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں صحیح بخاری کی شرح قسطلانی مطبوعہ استنبول کا ایک مکمل نسخہ دارالعلوم کے لئے عنایت کیا گیا[3]

---

[1] یہ کتاب صحیح بخاری کے الفاظ کی ایک نادر فہرست ہے، الفاظِ بخاری کی یہ فہرست بخاری کی شرح ارشاد الساری قسطلانی کے مطابق بنائی گئی ہے، علم حدیث میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے الفاظ حدیث کی یہ ایک گراں قدر فہرست ہے، النجوم الدراری کا یہ مخطوطہ دارالعلوم کے کتب خانے میں موجود ہے، اس پر وزارتِ تعلیم ترکی کی تصدیق اور ترکی علماء کی تقریظیں ترکی زبان میں درج ہیں۔

[2] روداد ۱۲۹۵ھ طبع اول ص ۱۷

[3] روداد ۱۳۰۸ھ ص ۷۷۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ قسطلانی کے اس نسخے کی صحت پر بڑا اعتماد فرماتے تھے، درس بخاری کے وقت یہی نسخہ حضرت مدنیؒ کے سامنے رہتا تھا، یہ نسخہ دس جلدوں پر مشتمل ہے

۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۱ء میں مصر کے مشہور ترین عالم سید رشید رضا، دارالعلوم کی شہرت سن کر تشریف لائے اور اپنے تأثرات کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا :-

"میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں دارالعلوم دیوبند کو نہ دیکھتا تو میں ہندوستان سے غم گین جاتا، میں نے اس مدرسہ کی نسبت جو کچھ سنا تھا اس سے بہت زیادہ پایا، مولانا انور شاہ نے جو اصول اور جو مسلک اپنے مشائخ کا مجھے بتلایا ہے میں اس سے متفق ہوں، اس زمانے میں طریقۂ تعلیم کی اصلاح اور اسلام کی اشاعت مسلمانوں کی ضروریات میں سب سے اہم اور ضروری ہیں، مجھے یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ آپ ان کی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہیں اور ان کی طرف توجہ فرما رہے ہیں۔

آپ حضرات کی سادگی اور طلباء کے زہد و تقشّف کے بارے میں میری یہ رائے ہے کہ مرشدوں اور ہادیوں کو جو دوسروں کے لئے نمونہ ہوں ضرور ایسا ہی ہونا چاہیئے" [1]

عالم اسلام سے دارالعلوم کے رابطے کے سلسلے میں آپ دیکھیں گے کہ ممالکِ اسلامیہ نے بھی دارالعلوم دیوبند کو قابلِ قدر نظر سے

---

[1] روداد ۱۳۳۰ھ ص ۴۰ ضمیمہ

دیکھا اور دار العلوم سے بھی جہاں تک بن پڑا اس نے عالم اسلام سے ہمدردی کے اظہار میں کبھی کوتاہی نہیں کی، ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں جلسہ تقسیم انعام کے موقع پر دار العلوم کے طلباء نے طے کیا کہ انھیں سالانہ انعام میں جو کتابیں دی جاتی ہیں ان کو فروخت کرکے ان کی قیمت طلبار کی جانب سے چندے کے طور پر ترک مجروحین کی اعانت کے لئے قسطنطنیہ بھیج دی جائے [1] یہ جنگ ترکی اور روس کے مابین ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں پلونا کے مقام پر ہوئی تھی۔

جنگِ بلقان کے زمانے میں ترک مجروحین اور شہداء کے ورثار کی امداد کے لئے دار العلوم کی جانب سے ہندوستان میں عام چندہ جمع کیا گیا اور ۶۵ ہزار روپے کی خطیر رقم قسطنطنیہ بھیجی گئی، اسی کے ساتھ علمائے دار العلوم نے ترکوں کی حمایت کے لئے ہندوستان میں رائے عامہ کو بیدار کرنے میں بڑے جوش اور سرگرمی سے حصہ لیا، مسلمانانِ ہندوستان اور بالخصوص دار العلوم کے اس مخلصانہ اسلامی جذبے سے متاثر ہوکر ترکی کے فرماں روا سلطان محمد پنجم (۱۳۲۴ھ/۱۹۰۸ء - ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جبۂ مبارک سے مَس کیا ہوا رومال دار العلوم کو عنایت فرمایا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] روداد ۱۲۹۴ھ ص ۱۵

کا ایک جبّہ مبارک قسطنطنیہ کے "خرقۂ سعادت" کے خزانے میں محفوظ ہے، یہ تبرکاتِ نبوی ترکی کے سلطان سلیم اول (۹۲۳ھ - ۹۲۶ھ / ۱۵۱۷ء - ۱۵۲۰ء) کو عباسیہ مصر کے آخری خلیفہ المتوکّل علی اللہ سے حاصل ہوئے تھے، سلاطینِ عثمانیہ ہر سال رمضان المبارک میں جبّہ مبارک کی زیارت کا شرف حاصل کرتے تھے، جبہ مبارک قسطنطنیہ کے جس میوزیم میں محفوظ ہے وہ توپ کاپی کے نام سے موسوم ہے اس میوزیم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند تبرکات رکھے ہوئے ہیں، خلیفہ المتوکل عباسی نے حقوق خلافت کے ساتھ جو تبرکات سلطان سلیم کے سپرد کئے تھے اُن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار، مُہر، عَلَم اور جبّہ مبارک کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

توپ کاپی کا یہ میوزیم ایک قدیم محل ہے جس کو سلطان محمد فاتح نے فتح قسطنطنیہ کے بعد ۸۶۳ھ / ۱۴۵۸ء میں تعمیر کرایا تھا، یہ محل ایک عرصے تک ترکی سلاطین کا قصرِ خلافت رہا ہے، بعد میں اسے میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا، اس میوزیم کے مختلف کمروں میں مقدّس یادگاریں محفوظ ہیں، ایک ہال میں سونے کے دو صندوق رکھے ہوئے ہیں، ایک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جبّہ مبارک ہے اور دوسرے میں عَلَم نبوی رکھا ہوا ہے، یہ ہال میوزیم کا سب سے مقدّس حصّہ سمجھا جاتا ہے، دونوں صندوقوں کے

گرد چاروں طرف چاندی کی جالیاں بنی ہوئی ہیں، زائرین جالی کے قریب کھڑے ہو کر زیارت کرتے ہیں [1]

جبۂ مبارک کی حفاظت کے لئے اس پر ایک مہین کپڑا ڈال دیا جاتا ہے، یہ رومالِ مبارک وہی کپڑا ہے جو جبۂ مبارک سے مدت تک مَس کیے رہا ہے، رومالِ مبارک کے وسط میں جلی قلم سے یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

نُورُ الہُدیٰ نِلنَا بِہٖ تکرِیما صَلُّوا عَلَیہِ وَسَلِّمُوا تَسلِیمَا

(سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نورِ ہدایت ہیں، اُنھیں سے ہمیں عزت و شرافت ملی ہے پس آپ کے اوپر درود و سلام بھیجیے)

مندرجہ بالا شعر رومالِ مبارک کے وسط میں بخط نستعلیق لکھا ہوا ہے اور چاروں طرف کناروں پر ترکی زبان کے شعر مرقوم ہیں، ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۳ء میں دولتِ عثمانیہ کے سفیر مقیم بمبئی خالد خلیل بک اس رومالِ مبارک کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ لے کر دارالعلوم میں آئے اور فرمایا کہ "اس کو دارالعلوم کے خزانے میں رکھا جائے، انشاء اللہ مدرسہ میں ہر طرح کی خیر و برکت ظاہر ہوگی" [2]

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے مجلّہ "العربی" کویت بابت ماہ جنوری ۱۹۶۸ء

[2] روداد دارالعلوم ۱۳۳۲ھ ص ۲۹

یہ رومالِ مبارک ایک خوش نما چوبی بکس میں خزانۂ دارالعلوم میں رکھا ہوا ہے اور خاص اہتمام کے ساتھ اس کی زیارت کرائی جاتی ہے۔

سنہ ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء میں پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں خلافتِ عثمانیہ کے تحفظ و بقاء کے لئے ہندوستان میں تحریکِ خلافت شروع کی گئی تو علمائے دارالعلوم نے اس میں زبردست حصہ لیا، انھوں نے ترکوں کی حمایت میں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی رائے عامہ کو بیدار کیا بلکہ دارالعلوم کی جانب سے پورے ملک میں ترکوں کی امداد کے لئے چندہ جمع کیا گیا، اس تحریکِ خلافت کے ذریعے سے انڈین نیشنل کانگریس پہلی مرتبہ ہندوستان کے عوام میں روشناس ہوئی، ورنہ اس سے پہلے کانگریس کی سرگرمیاں ایک مخصوص حلقے تک محدود تھیں، تحریکِ خلافت نے کانگریس کو ہمہ گیر بنانے میں بڑی مدد دی۔

سنہ ۱۹۶۷ء / ۱۳۸۷ھ کی عرب اسرائیل جنگ میں قبلۂ اوّل ریلیف فنڈ کے نام سے متحدہ عرب جمہوریہ شام اور اردن کے لئے دارالعلوم نے ملک گیر پیمانے پر چندے کی فراہمی کا کام کیا [1]

---

[1] اس موقع پر عرب ملکوں کی مالی امداد کے لئے دارالعلوم میں ایک مستقل دفتر قائم کیا گیا تھا، اس دفتر کی نگرانی کے فرائض راقم سطور کے سپرد کئے گئے تھے،

(باقی صـ ۴۳۱ پر ملاحظہ ہو)

حکومت سعودیہ، متحدہ عرب جمہوریہ، ایران اور افغانستان کی جانب سے وقتاً فوقتاً دارالعلوم میں بیش قیمت کتابیں آتی رہی ہیں، شاہ سعود نے اپنے دورۂ ہندوستان کے موقع پر شاہی عطیے سے دارالعلوم کو نوازا، ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند افغانستان تشریف لے گئے، اس موقع پر شاہ افغانستان نے پچاس ہزار روپے افغانی دارالعلوم کے لئے پیش کئے، دارالعلوم کا مغربی دروازہ "باب الظاہر" اسی افغانی عطیے کی یادگار ہے۔ [1]

۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء میں مؤتمر اسلامی قاہرہ کی جانب سے استاذ عبدالمنعم النمر اور استاذ عبدالحال العقبادی اور ان کے بعد شیخ محمود عبدالوہاب محمود کو دارالعلوم میں جدید عربی زبان کی مشق وتمرین کے لئے بھیجا گیا، دارالعلوم میں ان حضرات کے قیام سے عربی زبان کی مشق وتمرین کا طلبائے دارالعلوم میں ایک خاص جوش اور ولولہ پیدا ہوا، اور دارالعلوم میں "صفِ عربی" کے نام سے اب ایک مستقل شعبہ قائم ہوگیا ہے، جس میں ہر سال طلبا کی ایک

(بقیہ صفحہ ۴۲۰ سے آگے) کارکنانِ دارالعلوم نے اس دفتر کی خدمات بغیر کسی معاوضے کے بڑے شوق سے انجام دیں۔

[1] سفرنامہ افغانستان مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ص ۳۴ مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی۔

بڑی جماعت حصّہ لیتی ہے۔

علمائے دارالعلوم نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں دینی علوم کی درس گاہیں قائم کرکے دنیائے اسلام سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے، سب سے پہلے اکابرِ دارالعلوم میں شیخ الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجرِ مکیؒ نے مکہ مکرمہ میں رُشد و ہدایت کی مسند بچھائی، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے سالہا سال حرمِ نبوی میں حدیث کا درس دیا، ان کے برادر بزرگ مولانا سید احمد نے مدینہ منورہ میں مدرسہ شرعیہ کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی۔

غرض کہ شروع سے لے کر اب تک عالمِ اسلامی سے دارالعلوم کا رابطہ قائم رہا ہے، ریشمی خطوط کی تحریک میں ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے لئے بیرونی ملکوں میں جو مختلف مراکز قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا اس کا صدر مقام مدینہ منورہ کو تجویز کیا گیا تھا۔

جامعہ ازہر کے ایک استاد شیخ عبدالتوّاب نے عالم اسلام سے دارالعلوم کے تعلق کی نسبت کہا تھا کہ:۔

"جس طرح جامعہ ازہر دنیائے اسلام میں ایک پرانی یونیورسٹی ہے اسی طرح یہ دارالعلوم دیوبند بھی ایشیا کی ایک پرانی اور عظیم درس گاہ ہے، اس بنا پر دونوں اداروں کے مابین دینی و علمی اور ثقافتی روابط قائم ہونا ضروری تھے، ان روابط کی ابتدا مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا محمد طیب صاحب کی تحریک پر

عمل میں آئی ہے، جامعۂ ازہر کی جانب سے ہندوستان کے مختلف مقامات پر مبعوثین کے بھیجے جانے کا فیصلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی ہی جد وجہد کا نتیجہ ہے جس کا سلسلہ کئی سالوں سے جاری ہے"۔ [۵۱]

۱۳۶۹ھ / ۱۹۵۰ء میں افغانستان کے سفیر سردار نجیب اللہ خان نے دارالعلوم کو عالم اسلامی کی میراث قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ :-

"افغانستان کے عوام کی نظر میں دارالعلوم ایک عوامی علمی درس گاہ ہے، مگر میں اپنے مشاہدے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک درس گاہ ہی نہیں ہے بلکہ اسلامی ثقافت کا مرکز بھی ہے، افغانستان کے عوام اور علماء اور علم دوست اس کے قدرداں ہی نہیں بلکہ علماء کے مددگار اور بہی خواہ بھی ہیں، علماء کی یہ محفل ثقافتِ اسلامی کی ایک ممتاز ترین محفل ہے اور آپ اپنی نظیر ہے، ثقافتِ اسلامی کی بنیاد سچّائی، محبّت، مساوات اور حقیقت شناسی پر مبنی ہے، اور یہ محفل انہی اجزاء پر مشتمل ہے، دارالعلوم دیوبند تنہا ہندوستان کا ورثہ نہیں ہے بلکہ تمام عالم اسلامی کی میراث ہے"۔ [۵۲]

---

۵۱ شیخ عبدالتوّاب استاد جامعۂ ازہر مصر کی تقریر دارالعلوم میں۔

۵۲ ضمیمہ کوائف دارالعلوم ۱۳۶۹ھ

دارالعلوم کا سیاسی موقف

دارالعلوم کی سیاسی تاریخ تین مختلف ادوار پر منقسم ہے :-

پہلا دور وہ ہے جس کا اظہار ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ کی جنگِ آزادی کے موقع پر ہوا، یہ دور اُن حضرات سے تعلق رکھتا ہے جو آگے چل کر اکابر جماعت دارالعلوم کے نام سے موسوم ہوئے، اس دور کے اکابر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ وغیرہ حضرات شیخ الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی قیادت میں شمشیر بدست اور کفن بردوش جنگ شاملی[1] کے میدانِ کارزار میں نظر آتے ہیں، اس لحاظ سے دارالعلوم کی سیاسی تاریخ قیامِ دارالعلوم سے نو سال پہلے شروع ہو چکی تھی، ۱۸۵۷ء کے اس ہنگامہ خیز انقلاب میں اگرچہ اکابر دارالعلوم نے ضلع مظفر نگر کی تحصیل شاملی کو فتح کر لیا تھا مگر آخر میں

---

[1] شاملی ضلع مظفر نگر کا ایک قصبہ اور تجارتی منڈی ہے جو مظفر نگر سے ۲۴ میل کے فاصلے پر جنوب مغرب میں سہارنپور، شاہدرہ ریلوے لائن پر واقع ہے، ۱۸۵۷ء میں یہاں تحصیل تھی، مگر بعد میں شاملی کو تحصیل کیرانہ میں شامل کر دیا گیا، تحصیل کی عمارت کا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے البتہ جس میدان میں شاملی کی جنگ لڑی گئی وہ میدان اب تک محفوظ ہے اور گنجِ شہیداں کہلاتا ہے۔

انھیں انگریزی فوجوں کے مقابلے میں شکست اٹھانی پڑی، بدقسمتی سے اس موقع پر کسی ٹھوس سیاسی اتحاد کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اہلِ ہند اپنی طاقت کو منظم نہ کر سکے، تاریخ کا ہر طالب علم یہ بات جانتا ہے کہ برطانوی دورِ حکومت میں اس کے اقتدار کا سب سے بڑا مخالف علماء کا طبقہ رہا ہے، علماء کا یہ طبقہ ہندوستان میں برطانوی تسلّط کے ابتدائی دور سے لے کر ۱۹۴۷ء / ۱۳۶۶ھ تک انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کے لئے ہمیشہ مصروفِ عمل رہا ہے۔

۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ کی جنگ آزادی میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں قوموں کے افراد دوش بدوش شریک جنگ تھے، اور ہر چند دونوں قوموں نے بقدرِ استعداد اس جنگ میں حصّہ لیا تھا، مگر انگریزوں کی نظر میں اس کا اصل حریف اور مدّ مقابل مسلمان ہی تھا۔

اس لئے جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد برطانوی حکومت نے اسی کو سب سے بڑا "باغی" سمجھ کر زیادہ سے زیادہ اپنے استبداد کا تختۂ مشق بنایا، علماء کو سنگین ترین مظالم کا نشانہ بنایا گیا، ملک کی ہر سربلندی اور آسودہ حالی سے مسلمانوں کو محروم رکھنے کی پالیسی اختیار کی گئی، یہ زخم ایسا گہرا لگایا گیا تھا جو جلد مندمل ہونے والا نہ تھا، انگریزوں کی زبردست طاقت اور اس کے بے پناہ مظالم نے مسلمانوں میں مایوسی کی ایک عام فضا پیدا کر دی، عام مسلمان مرعوب اور خوف زدہ ہو کر سیاست سے کنارہ کش ہو گئے

اوران کے دماغ سے سے آزادی کا تصور نسیاً منسیا ہو گیا۔
اکابر دارالعلوم کی ۱۸۵۷ء کی جدوجہد اگرچہ بظاہر ناکام ہو گئی تھی مگر اس کے اثرات فنا نہ ہو سکے، کسی کوشش کے ناکام ہو جانے سے وہ روح فنا نہیں ہوتی جو اس کوشش کا باعث ہوتی ہے وہ اندر ہی اندر اپنا کام کرتی رہتی ہے اور حالات کے سازگار ہونے کی منتظر رہتی ہے، جس طرح ایک بڑے طوفان کے بعد مکمل سناٹا چھا جاتا ہے اسی طرح ۱۸۵۷ء کے عالم آشوب ہنگامے میں ناکامی کے بعد مدت تک دارالعلوم کی سیاسی فضا خاموش رہ کر مناسب وقت کی منتظر رہی، تا آنکہ طرابلس اور بلقان کے خوں چکاں واقعات نے دنیائے اسلام کے مسلمانوں کو مضطرب اور بے چین کر دیا شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کی قیادت میں جماعتِ دارالعلوم نے ملک میں انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد شروع کر دی بیسویں صدی کے اوائل میں دوسرے دور کا آغاز اسی خفیہ تحریک سے ہوتا ہے جو ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں "ریشمی خطوط" کے نام سے موسوم ہے یہ تحریک نہایت رازدارانہ طور پر چلائی گئی تھی، اس کا مقصد یہ تھا کہ صوبہ سرحد کے آزاد قبائل کو برطانوی حکومت کے خلاف صف آرا کر کے اور بیرونی طاقتوں کی مدد لے کر برطانوی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے، اس سیاسی سرگرمی کے سلسلے میں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے چند جاں نثار شاگردوں حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عزیر گل وغیرہ کو گرفتار کر کے بحر روم کے جزیرہ مالٹا

میں نظر بند کر دیا گیا، اور مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا منصور انصاری کو جلا وطنی کی زندگی اختیار کرنی پڑی، اس تحریک کی تفصیلات اوپر گزر چکی ہیں۔

یہ دوسرا دور حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری اور پہلی جنگِ عظیم میں ترکی اور جرمنی کی شکست کے بعد (جن کی امداد کے بھروسے پر دوسرے دور کی تحریک شروع کی گئی تھی) ختم ہو گیا، ان دونوں دوروں میں مسلح طاقت کے ذریعے سے انقلاب لانے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔

مذکورہ بالا دونوں دوروں کے برعکس تیسرے دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس دور میں پُرامن جد وجہد کے ذریعے سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی گئی، اس دور کا آغاز ۱۹۱۹ء (۱۳۳۸) میں تحریکِ خلافت سے شروع ہوتا ہے، اس زمانے میں اس امر کا شدید خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ برطانوی حکومت دارالعلوم کی سیاسی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے دارالعلوم کو بند کر دینا چاہتی ہے، مگر دارالعلوم کی جانب سے اس خطرے کو نظر انداز کر دیا گیا، اساتذہ اور طلباء نے تحریکِ خلافت کے جلسوں اور جلوسوں میں شریک ہو کر اپنی پرجوش تقریروں سے عوام و خواص کو ایک مرکز پر جمع کرنے میں بڑی مدد دی، اُس زمانے میں ہندوستان کی دوسری قوموں کے سامنے صرف آزادیٔ وطن کا مسئلہ تھا، مگر مسلمانوں کے سامنے دو مسئلے تھے، ایک آزادیٔ وطن کا اور دوسرا مسئلہ خلافت عثمانیہ کے تحفظ و بقا کا تھا، اس لئے جس طرح مسلمانوں

کے فرائض دو چند تھے اسی طرح دوسری قوموں کے مقابلے میں ان کی جدوجہد بھی زیادہ تھی، اس غرض سے سیاسی جدوجہد کے لئے ایک دوسرے پلیٹ فارم کی ضرورت محسوس کی گئی، چنانچہ سنہ ۱۹۱۹ء / ۱۳۳۸ھ میں علماء کی ایک مستقل سیاسی جماعت قائم کی گئی جو جمعیۃ علماء ہند کے نام سے موسوم ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے رہا ہو کر ہندوستان پہنچے تو برطانوی حکومت نے پوری قوت سے اس امر کی کوشش کی کہ وہ ہندوستان کی سیاسی تحریکات میں حصہ نہ لیں، مولوی رحیم بخش صاحب ایڈیشنل کونسل ریاست بھاولپور کو گورنمنٹ نے بمبئی بھیجا، مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلیں[1]، مگر حضرت شیخ الہندؒ ہندوستان پہنچتے ہی تحریک خلافت میں سرگرمی کے ساتھ شریک ہو گئے، سنہ ۱۹۲۰ء / ۱۳۳۹ھ میں جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی اور ایک بصیرت افروز خطبہ دیا، جس میں ہندوستانی سیاست کے نقوش و خطوط متعین کئے گئے تھے، اسی دوران میں انڈین نیشنل کانگریس نے ترک موالات کی تجویز پاس کی تو حضرت شیخ الہندؒ نے پوری قوت کے ساتھ اس کی تائید کی، نقش حیات میں لکھا ہے کہ "حضرت شیخ الہندؒ نے ترک موالات کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی اور تمام مسلمانوں اور

---

[1] نقش حیات جلد دوم ص ۲۳۵

مسلم یونیورسٹیوں کے طلبار کو زور دار مشورہ دیا کہ وہ اس پر عمل کریں[1]
چنانچہ مسلم یونیورسٹی کے بہت سے طلبار نے یونیورسٹی کو خیرباد کہہ دیا۔
اس طرح جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی بنیاد پڑی جو حضرت شیخ الہند رح کے ہاتھوں سے رکھی گئی، جامعہ ملیہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ ایک ایسی آزاد یونیورسٹی قائم کی جائے جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیٰحدہ ہو اور جس کا تمام نظام قومی محسوسات پر مبنی ہو۔

جمعیۃ علمار ہند کا سوادِ اعظم ہمیشہ علمائے دیوبند ہی پر مشتمل رہا ہے، اس لئے جمعیۃ علمار ہند کی تاریخ درحقیقت دارالعلوم دیوبند ہی کی سیاسی تاریخ کا ایک باب ہے، جمعیۃ علمائے ہند نے ملک کی آزادی کے لئے جو عظیم خدمات انجام دی ہیں وہ اپنی ایک مستقل تاریخ رکھتی ہیں ان کے تفصیلی ذکر کا یہ موقع نہیں ہے، اس موضوع پر جمعیۃ علمار ہند کی جانب سے کافی لکھا جا چکا ہے۔

یہاں یہ تاریخی حقیقت بھی یاد رہنی چاہیئے کہ آل انڈیا نیشنل کانگریس نے ۱۹۲۹ء/۱۳۴۸ھ میں اپنے اجلاس لاہور میں آزادیٔ کامل کا اعلان کیا جبکہ جمعیۃ علمار ہند اس سے دو سال پہلے ۱۹۲۷ء/۱۳۴۶ھ میں اس قسم کی تجویز اپنے اجلاس پشاور میں پاس کر چکی تھی، جمعیۃ علمار ہند کا یہ اجلاس حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔

---

[1] نقش حیات جلد دوم ص ۲۵۷

اکابر دارالعلوم کا معرکۂ شاملی، حضرت شیخ الہندؒ کی سیاسی تحریک اور جمعیۃ علماء کی جانب سے ہندوستان کی آزادیٔ کامل کی تجویز پاس کرنا، جماعتِ دارالعلوم کی فکری بصیرت اور سیاسی خدمات کی روشن مثالیں ہیں، یہ دارالعلوم کے دورِ قدیم کی تاریخ ہے، اس کی حالیہ سیاسی تاریخ میں بھی بہت سے فضلائے دارالعلوم کی ملکی اور سیاسی سرگرمیاں اور جدوجہد تحریکِ آزادی کی تاریخ کا ایک روشن اور تابناک باب ہے، یہ تفصیلات جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ میں دیکھی جاسکتی ہیں، دارالعلوم کی قومی اور ملکی خدمات کا اعتراف نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ہندو رہنماؤں نے بھی ہمیشہ کیا ہے، ۱۹۶۴ء کے قومی جمہوری کنونشن کے موقع پر ڈاکٹر تاراچند نے کہا تھا کہ :-

"علمائے دین اس وقت بھی جنگِ آزادی لڑ رہے تھے جب ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی تشکیل عمل میں آئی تھی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں وہ نہ صرف شریک تھے بلکہ اس کی قیادت کر رہے تھے، سیاست میں انھوں نے ہمیشہ انقلابی رویّہ اختیار کیا ہے، پورا دیوبند اسکول آغاز ہی سے قومی اور انقلابی رہا ہے"۔ [1]

دارالعلوم کے سیاسی موقف کو سمجھنے کے لئے اس کا مندرجہ ذیل بیان

---

[1] روزنامہ الجمعیۃ قومی جمہوری کنونشن نمبر مورخہ یکم دسمبر ۱۹۶۴ء ص ۲

ایک واضح دستاویز ہے، آزاد ہندوستان کے پہلے الیکشن کے موقع پر دارالعلوم کی سیاسی پالیسی کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"دارالعلوم دیوبند نے من حیث الادارہ سیاسیات سے احتراز کیا ہے، البتہ اس نے اپنے کارکنوں اور علماء کی شخصی حیثیتوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی، علمائے دیوبند ہمیشہ ملکی اور قومی خدمات میں حصّہ لیتے رہے ہیں، اور آج بھی وہ اپنی ذاتی حیثیت میں ملک کی بہی خواہی سے الگ نہیں رہ سکتے"۔[1]

دارالعلوم نے اپنے اساتذہ اور کارکنوں کو جہاں سیاسی تحریکات میں شرکت کی آزادی دی ہے وہیں چونکہ طلباء کے لئے عملی سیاسیات میں حصّہ لینا تعلیمی مقاصد کے لئے ضرر رساں سمجھا گیا ہے اس لئے دارالعلوم کی جانب سے ہمیشہ طلباء کو سیاسیات سے کنارہ کش رہنے کی تلقین کی گئی ہے، ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء میں دارالعلوم کی جانب سے جو اعلان کیا گیا اس میں لکھا ہے:۔

"نوعمر طلبائے علوم کا سب سے اہم فریضہ علوم حاصل کرنا اور اپنی تمام تر مساعی اور جد وجہد کو علم کی راہ میں مصروفِ عمل رکھنا ہے، اس لئے طلباء کو چاہیئے کہ وہ

---

[1] بیان اہتمام دارالعلوم دیوبند مندرجہ روزنامہ الجمعیۃ دہلی مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۵۱ء ۱۳۷۱ھ

اپنے مشاغلِ علمیہ میں پورے طور پر انہماک اور انتہائی جد وجہد کو
عمل میں لائیں اور ایسے اعمال کی طرف ہرگز متوجہ نہ ہوں جو
اُن کے فرائضِ علمیہ میں سدِ راہ ہو سکیں، سیاسی تحریکات میں
ان کا عملی طور پر حصہ لینا ان کے فرائضِ علمیہ کے لئے ضرور
بالضرور سنگِ راہ ہوگا، جس سے اُن کے مقاصدِ حیات میں
انتہائی ضرر کا اندیشہ ہے، اس لئے طلبار کو چاہیئے کہ وہ
سیاسی تحریکات سے دامن کشاں رہیں"۔ [1]

بحیثیت ایک علمی ادارے کے دارالعلوم سیاسیات سے علیحدہ رہا ہے
مگر شخصی حیثیت سے اس کے علمار میدانِ سیاست میں ہمیشہ سرگرم حصہ لیتے
رہے ہیں، بہت سے قومی رہنما جو قومی آزادی کی تحریک میں ملک کی رہنمائی کرتے
رہے ہیں، ان میں سے بیشتر حضرات ایسے ہیں جن کا شمار فضلائے دارالعلوم
میں ہوتا ہے، مثال کے طور پر چند نام پیش ہیں :-

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا
منصور انصاری، مولانا ثنار اللہ امرتسری، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا
حسین احمد مدنی، مولانا محمد عرفان پشاوری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حبیب الرحمٰن
لدھیانوی، مولانا سید فخر الدین احمد، مولانا اطہر علی سلہٹی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی، مولانا نور الدین بہاری، مولانا مفتی محمود، مولانا مفتی
عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا سید منت اللہ رحمانی
مولانا سید محمد میاں، مولانا حامد انصاری غازی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا اسعد مدنی وغیرہم

---

[1] روداد ۱۳۴۸ھ ص ۹/ب

نصابِ تعلیم

تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں ہندوستان میں علم کے تین مرکزِ فکر تھے، دہلی، لکھنؤ اور خیرآباد، گو نصابِ تعلیم تینوں کا قدر مشترک تھا، تاہم تینوں کے نقطہ ہائے نظر مختلف تھے، دہلی میں علمِ حدیث و تفسیر پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی، حضرت شاہ ولی اللہؒ کا خاندان کتاب و سنت کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن مشغول تھا، علومِ معقولہ کی حیثیت ثانوی درجے کی تھی۔ لکھنؤ میں علمائے فرنگی محل پر ماوراء النہر کا ساتویں صدی ہجری والا قدیم رنگ چھایا ہوا تھا، فقہ اور اصولِ فقہ کو ان کے ہاں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ خیرآبادی مرکز کا علمی موضوع منطق اور فلسفہ تھا، اور یہ علوم اس قدر اہتمام سے پڑھائے جاتے تھے کہ جملہ علوم کی تعلیم ان کے سامنے ماند پڑ گئی تھی۔

دارالعلوم دیوبند کے نصابِ تعلیم میں ان تینوں مقامات کی علمی خصوصیات کو جمع کیا گیا ہے، ان تینوں کے امتزاج سے جو نصاب تیار ہوا ہے ایک سو سال سے وہی بالعموم مدارسِ عربیہ میں زیرِ درس ہے، اس نصاب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے طالبِ علم میں قوتِ مطالعہ اور امعانِ نظر پیدا کرنے کا

لحاظ رکھا گیا ہے، جس سے علوم منقول و معقول میں توازن قائم ہو گیا ہے۔
ہر ایک طالب علم کے لئے لازمی ہے کہ وہ علوم آلیہ کو اس معیار تک
حاصل کرے جس پر پہنچ کر علوم عالیہ کی تحصیل اس کے لئے آسان
ہو جائے، اس کے لئے کچھ کتابیں لازمی قرار دی گئی ہیں، لیکن اگر
کوئی طالب علم علوم عالیہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس
کے لئے بھی موقع دیا جاتا ہے، مگر علوم آلیہ کی اعلیٰ تعلیم دار العلوم
کے نصب العین میں داخل نہیں ہے۔

دار العلوم کی تعلیم کا اصل مقصد قرآن شریف، تفسیر، حدیث
فقہ اور عقائد و کلام وغیرہ علوم کی تعلیم دینا ہے، اس کے لئے فقہ کی
ابتدا نور الایضاح اور قدوری سے کی جاتی ہے اور ہدایہ تک فقہ کی
تعلیم ہوتی ہے، دورانِ تعلیم میں طالب علم کو ائمہ اربعہ کے مذاہب
پر پوری بصیرت حاصل ہو جاتی ہے، اسی کے ساتھ تدریجی طور پر
اصولِ فقہ کی تعلیم بھی جاری رہتی ہے۔ ائمہ اربعہ کے دلائل، ان کے
اصول استخراجِ مسائل، اور حنفیہ کی جانب سے ائمہ ثلاثہ کے دلائل
کے جوابات اس طریق سے طلباء کے ذہن نشین کرائے جاتے ہیں جس سے
ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کی وقعت و عظمت کم نہ ہونے پائے،
یہی طریقہ کتب حدیث کے درس میں بھی برتا جاتا ہے، چنانچہ
نصابِ تعلیم میں حدیث کی کتابیں طحاوی کے علاوہ شوافع و مالکیہ

کی مدوّن کی ہوئی ہیں، اس لئے ان ائمہ کے دلائل طلبار کے سامنے آجاتے ہیں، استاذِ حدیث حنفیہ کے مسلک کو دلائل وشواہد کی روشنی میں پیش کر کے راجح قرار دیتا ہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ ائمہ ثلاثہ کی مجتہدانہ عظمت کو بھی برقرار رکھا جاتا ہے۔

دارالعلوم نے صرف دینی علوم ہی کو زندہ نہیں رکھا بلکہ یونانی علوم کی بھی خدمت انجام دی ہے، اسلام کی ابتدائی تاریخ میں یونانی علوم دم توڑ چکے تھے، عربوں نے ان کے اندر تازہ روح پھونکی اگر عرب قدیم یونانی علوم کو زندہ نہ کرتے تو آج دنیا ان علوم سے محروم ہو چکی ہوتی، عربوں نے یونانی علوم کو پوری خوش اسلوبی اور دقیقہ سنجی کے ساتھ مرتب کیا، دارالعلوم نے یونانی علوم کو اپنے نصاب میں جگہ دے کر ان کو زندہ رکھا ہے۔

دارالعلوم میں سب سے پہلے قرآن شریف اور اردو دینیات سے تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، اس کے بعد فارسی پڑھائی جاتی ہے بعدازاں اصل نصاب شروع ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) **اردو دینیات**: سے اولاً بچے کی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، اس درجے کا نصاب تعلیم چار سال کا ہے، اس میں قرآن شریف کے علاوہ اردو میں فقہ و عقائد، سیرت و تاریخ اور حساب و جغرافیہ کی تعلیم دی جاتی ہے، دورانِ تعلیم میں اسلامی تہذیب اور معاشرتی امور زبانی تعلیم کے ذریعے سے بچوں کے

ذہن نشین کرائے جاتے ہیں۔

(۲) **درجاتِ فارسی:** کی مدّتِ تعلیم چار سال ہے، اس درجے میں فارسی زبان وادب کے ساتھ ابتدائی عربی، صرف ونحو اور ادبِ عربی، فقہ، تاریخ، جغرافیہ، ہندی اور حساب وغیرہ مضامین داخلِ درس ہیں۔

(۳) **درجاتِ عربی:** کے نصابِ تعلیم میں ۲۳ علوم شامل ہیں۔ ان میں ۹ علوم عالیہ ہیں جو دارالعلوم کی تعلیم کا اصل مقصد ہے ان علوم کی تفصیل یہ ہے :-

تفسیر، اصولِ تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، فقہ، اصولِ فقہ عقائد وکلام، فرائض، تجوید۔

علوم آلیہ جن کو علوم عالیہ کے لئے ذریعہ اور معاون کی حیثیت سے رکھا گیا ہے وہ یہ ہیں :-

صرف ونحو، معانی وبیان، عروض، ادبِ عربی، منطق، فلسفہ ہیئت، مناظرہ، جغرافیہ، تاریخ، جنرل سائنس، معلوماتِ عامہ، مبادیٔ معاشیات۔

علوم عالیہ اور علوم آلیہ کا نصابِ تعلیم ۸ درجات پر مشتمل ہے پہلے چار سال میں طالب علم علوم آلیہ کے علاوہ فقہ میں نورالایضاح قدوری، کنزالدقائق، شرح وقایہ۔ اصولِ فقہ میں اصولِ الشاشی اور منار، قرآن مجید کا ترجمہ اور حدیث کے دو مختصر مجموعے پڑھ لیتا ہے۔

دوسری منزل سالِ ہشتم پر ختم ہوتی ہے، اس منزل کی انتہا پر حدیث میں مشکوٰۃ صحاحِ ستّہ، فقہ میں ہدایہ، تفسیر میں جلالین و بیضاوی سورہ بقرہ مع نور الانوار اور سراجی کے علاوہ علوم جدیدہ میں مبادی جنرل سائنس، مبادی معاشیات، مبادی سیاسیات اور تاریخ، جغرافیہ وغیرہ علوم سے بھی قدرے واقفیت حاصل کرادی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا نصاب دار العلوم کا لازمی نصابِ تعلیم ہے، اس کے علاوہ بعض اور علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں وہ اختیاری حیثیت رکھتے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:-

(۴) درجہ حفظ قرآن: اس درجے میں بچوں کو قرآن شریف حفظ کرایا جاتا ہے، اس کے لئے کوئی مدت معیّن نہیں ہے، عموماً دو سال سے لے کر چار سال تک کی مدت میں اس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

مختلف علوم میں تخصّص حاصل کرنے کے لئے چار درجات تکمیل ہیں، جن میں ہر ایک درجے کا نصاب ایک ایک سال کا رکھا گیا ہے، ان کی تفصیل یہ ہے:-

تکمیلِ تفسیر ——— تکمیلِ دینیات

تکمیلِ ادب ——— تکمیلِ معقولات

(۷) درجۂ تجوید : اس درجے میں حفص اردو اور حفص عربی کی مشق وتمرین کے لئے دو، دو سال کی مدّت مقرر ہے، اسی طرح نصاب سبعہ اور نصاب عشرہ کی مشق وتعلیم کے لئے دو، دو سال درکار ہوتے ہیں۔

(۸) طب : تعلیم طب کے لئے جامعۂ طبّیہ کے نام سے ایک مستقل شعبہ رکھا گیا ہے، اس میں چار سال کا نصاب تعلیم ہے، اس میں طبِّ یونانی کے ساتھ ایلوپیتھی اور تشریح اعضاء کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشی مقاصد کے لئے طلباء کو خطّاطی خیّاطی اور جلد سازی وغیرہ صنعتیں بھی سکھلائی جاتی ہیں، ان کے لئے مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ شعبے جاری ہیں۔

اردو کی اشاعت وترویج

مدارس عربیہ اور خصوصاً دارالعلوم کے نصاب کی ایک یہ خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ یہاں درس وتعلیم کی زبان اردو قرار دی گئی ہے، جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، کتابیں عربی زبان میں ہیں مگر اساتذہ کی تقریریں اردو میں ہوتی ہیں، علوم وفنون کی تعلیم میں مادری زبان کو جو اہمیت حاصل ہے اس کو عصری نصاب تعلیم میں بڑی مدّت کے بعد سمجھا جا سکا ہے، یہ حقیقت ہے کہ علمی مسائل جس آسانی سے مادری زبان میں سمجھ میں آتے ہیں اور حافظے میں

محفوظ رہتے ہیں وہ دوسری زبان میں ممکن نہیں، مگر انگریزی اقتدار کے غلبے نے قوم کے دماغوں کو اس قدر متاثر اور مغلوب کر دیا تھا کہ وہ ایک عرصے تک اس حقیقت کا سراغ نہ پا سکی، بعض باتیں بظاہر معمولی دکھائی دیتی ہیں اور لوگ انھیں حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ اس قدر اہم ہوتی ہیں کہ اُن سے بڑی بڑی باتوں کے لئے بنیاد کا کام لیا جا سکتا ہے اور ان کے ذریعے پورے نظامِ زندگی کو استوار کیا جا سکتا ہے، اگرچہ بعض دفعہ حقائق تو سامنے ہوتے ہیں مگر ان کی اہمیت کا ادراک نہیں ہوتا، ان کی اچھائی اور بُرائی بھی پیشِ نظر ہوتی ہے، لیکن طبیعت اس کا زیادہ احساس نہیں کرتی، چنانچہ طویل مدت کے بعد ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کو سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن اور جامعہ ملّیہ دہلی نے محسوس کیا اور اس پر عمل درآمد شروع کر دیا، جس میں دونوں جگہ نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور انھوں نے دوسری یونیورسٹیوں کے لئے ایک قابلِ تقلید مثال پیش کر دی ہے

عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد نے اس سلسلے میں دارالترجمہ قائم کر کے انگریزی اور عربی و فارسی کی بہت سی کتابوں کے ترجمے کرا کر اردو کے علمی سرمایے میں بیش قرار اضافہ کیا ہے، اسی طرح جامعہ ملّیہ دہلی نے بھی اس سلسلے میں قابلِ تعریف کام انجام دیا ہے۔

بہر حال اس سلسلے میں اوّلیت کا سہرا دارالعلوم ہی کے سر ہے

مدارس عربیہ میں اس چیز کو سو سال پہلے سمجھ لیا گیا تھا، مدارسِ عربیہ میں اردو کے درسی زبان ہونے سے اردو کو جو عظیم فائدہ پہنچا ہے وہ بجائے خود بڑی اہمیت کا حامل ہے

دار العلوم چونکہ عالم اسلام کے مسلمانوں کی مرکزی درس گاہ ہے اور اس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے علاوہ مختلف ممالک کے طلبار تحصیل علم کی غرض سے آتے ہیں، وہ اپنے دورانِ قیام میں خاصی اردو سیکھ لیتے ہیں، چنانچہ چند سال کی بات ہے کہ ایک صاحب جنھوں نے مختلف ممالک کی سیاحت کی تھی، دار العلوم میں آئے تھے، وہ کہتے تھے کہ "میں جب بخارا پہنچا جو وسط ایشیا کا مشہور مقام ہے تو وہاں ایک ایسے شخص سے میری ملاقات ہوئی جس نے مجھے ہندوستانی سمجھ کر ہمدردانہ لہجے میں اردو میں مجھ سے گفتگو کی، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ہندوستان سے اس قدر دُور دراز اتنی صاف اردو اس کو کیوں کر آئی ہوگی! میرے دریافت کرنے پر اس نے بتلایا کہ:

"یہ دار العلوم دیوبند کا تعلیمی فیض ہے، اور میں ہی نہیں بلکہ یہاں کا علمی حلقہ بالعموم اردو بولتا اور سمجھتا ہے۔"

اس شخص نے نہایت اخلاق اور محبت سے مجھے اپنے یہاں مہمان ٹھہرایا اور میرے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی دی، جس کی

یہ خصوصیت میں کبھی نہیں بھولوں گا، کہ اس میں جس نے بھی تقریر کی وہ میری خاطر سے اردو میں بولا۔

اسی طرح کا واقعہ ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ ان کے دورۂ روس کے دوران میں پیش آیا، پنڈت نہرو کو تاشقند کے ہوائی اسٹیشن پر وہاں کے باشندوں کی طرف سے جو سپاسنامہ پیش کیا گیا وہ اردو میں تھا، جسے وہاں کے ایک اُزبک نے پڑھ کر سنایا، پنڈت نہرو نے سپاس نامہ کا جواب بھی اردو ہی میں دیا، جسے اخبارات کے بیان کے مطابق حاضرین نے بخوبی سمجھا اور جواب کے دوران میں انھوں نے متعدد مرتبہ تالیاں بجائیں [1]

غرض کہ اس طرح دارالعلوم نے اردو کے دائرے کو اپنے غیر ملکی طلبار کے ذریعے سے تقریباً تمام ایشیائی ممالک تک وسیع کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات ایشیائی ممالک میں ہندوستان کی عظمت میں اضافے کا ذریعہ بھی بنی ہے۔

---

[1] روزنامہ الجمعیۃ، ۱۸ جون ۱۹۵۵ء صفحۂ اوّل

صدر مدرسین

دارالعلوم دیوبند میں دو عہدے ہمیشہ سے نہایت ممتاز رہے ہیں، ایک صدارتِ تدریس اور دوسرا اہتمام، اہتمام کے لئے ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جاتا ہے جو ذی علم اور صاحبِ اثر و رسوخ ہونے کے علاوہ متدیّن اور اعلیٰ درجے کی انتظامی قابلیت کی مالک ہو۔ صدارتِ تدریس کے لئے ایسی شخصیت منتخب کی جاتی ہے جو علم و فضل کے زبردست کمالات کے ساتھ ساتھ زُہد و تقویٰ میں بھی یگانۂ روزگار ہو۔

دینی علوم خصوصاً علمِ حدیث میں سلسلۂ روایت و سند کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لئے نامناسب نہ ہوگا کہ یہاں مختصر طور پر روایت و سند کے سلسلے کی وضاحت کردی جائے۔

دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس یعنی موجودہ منصب کے لحاظ سے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ تھے، انھوں نے اگرچہ دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی مگر علمِ حدیث کی تکمیل شاہ عبدالغنی مجددیؒ (وفات ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء) سے کی تھی، سلسلۂ ولی اللّٰہی میں جن کی درس گاہ ہندوستان بھر میں علم حدیث کا سب سے بڑا مرکز تھی، ملک کے گوشے گوشے سے طالبانِ علم حدیث

آتے اور اس خرمنِ کمال کی خوشہ چینی کو فخر سمجھتے تھے، شاہ عبدالغنیؒ نے حضرت شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ (وفات ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۵ء) سے اکتسابِ فیض کیا تھا جو حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے نواسے اور تلمیذِ رشید تھے خود شاہ عبدالعزیز (وفات ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۳ء) نے اپنی زندگی میں ان کو اپنا جانشین بنا دیا تھا، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اپنے نامور والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (وفات ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) سے مستفیض تھے ایک غیر ہندوستانی عالم کا بیان ہے کہ اسے سارے ہندوستان کی سیاحت میں علمِ حدیث کا کوئی ایسا عالم نہیں ملا جو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے واسطے سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کا شاگرد نہ ہو۔" [۱]

ان علماء کے علم و فضل کی نسبت حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی رائے تھی کہ "حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے شاگرد ایسے باکمال تھے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب و مصر اور شام وغیرہ میں بھی اس وقت ان کا نظیر و مثیل نہ تھا اور نہ تبحّر و تفقّہ، تصوف اور تحریر و تقریر میں پایا جاتا تھا، ان کی تصانیف اور تقریریں اس کی گواہ ہیں۔" [۲]

---

[۱] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک از مولانا عبیداللہ سندھی، شائع کردہ سندھ ساگر اکیڈمی لاہور ۱۹۴۴ء ص ۸۲

[۲] نقشِ حیات جلد دوم ص ۲۵

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے جملہ علوم و فنون اپنے والد ماجد شاہ عبدالرحیمؒ (وفات ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء) سے حاصل کیے تھے، جن کا سلسلۂ تلمذ علامہ جلال الدین محقق دوانی (وفات ۹۲۸ھ / ۱۵۲۱ء) تک پہنچتا ہے، حدیث کی تکمیل مدینہ منورہ میں شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے نامور مشائخ عرب سے کر کے قرأت و روایت حدیث کی سند حاصل کی ان کی غیر معمولی ذہانت اور جودت طبع کے متعلق ان کے استاد شیخ ابوطاہر کردیؒ کا یہ قول بڑی اہمیت رکھتا ہے:-

قال فیہ انہ کان یُسند عنّی اللفظ و کُنتُ اُصحّح منہ المعنیٰ [1]	ولی اللہ الفاظ حدیث کی سند مجھ سے حاصل کرتے ہیں اور میں ان سے احادیث کے معنی کی تصحیح کرتا ہوں۔

مولانا یعقوب نانوتویؒ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ استاذ العلماء حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ [2] کے فرزند رشید اور ممتاز شاگرد تھے، ۱۳ صفر ۱۲۴۹ھ / ۸۳-۱۸۳۴ء تاریخ پیدائش

---

[1] الیانع الجنی فی اسانید شیخ عبدالغنی مطبع صدیقی ۱۲۸۷ھ ص ۱۱۷

[2] استاذ العلماء مولانا مملوک علی صاحبؒ مشہور متکلم عالم مولانا رشید الدین خاں دہلویؒ کے (جو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد تھے) ممتاز تلامذہ میں تھے، علماء دیوبند اسی "سلسلۃ الذہب" میں منسلک ہیں (باقی حاشیہ صـ۴۴۵ پر دیکھئے)

اور منظور احمد تاریخی نام ہے، وطن میں قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد دہلی میں والد ماجدؒ سے علوم متداولہ کی تکمیل کی، سوانح قاسمی میں خود لکھتے ہیں کہ :-

"حقیر کے اور مولوی صاحب (حضرت مولانا محمد قاسمؒ) کے علاوہ قربِ نسب کے بہت سے روابطِ اتحاد تھے ایک مکتب میں پڑھا، ایک وطن، ایک نسب، ہم زلف ہوئے، ایک استاد سے ایک وقت میں علم حاصل کیا، اور بعض کتابیں مولانا سے بھی پڑھیں، ایک پیر کے مرید ہوئے، دو مرتبہ حج میں ہم سفر رہے اور ایک زمانہ دراز تک ساتھ رہے"

علم معقول و منقول میں اپنے والد ماجد کے مثل تھے، ذہن نہایت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مولانا مملوک علی نانوتویؒ (وفات ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء) دہلی کالج میں عربی کے استاذ تھے، دہلی کالج دراصل مدرسہ غازی الدین کا نام ہے، یہ مدرسہ غازی الدین خاں فیروز جنگ (وفات ۱۱۷۲ھ / ۱۷۵۸ء) نے جو نظام الملک آصف جاہ اول کے والد تھے، اجمیری دروازے کے پاس قائم کیا تھا، اس مدرسہ کا دوسرا دور ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۲ء میں شروع ہوا، اور ۱۲۴۱ھ / ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ سے پہلے یہ دھلی کی ایک مشہور درس گاہ تھی۔

رسا پایا تھا۔

والد ماجد کے انتقال کے بعد گورنمنٹ کالج اجمیر میں مدرس مقرر ہوئے، پانچ سال تک وہاں رہے، کچھ مدت بنارس، بریلی اور لکھنؤ میں قیام رہا، پھر سہارنپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوگئے، اسی زمانے میں ۱۸۵۷ء کا غدر ہوگیا، اس زمانے میں نانوتہ قیام رہا، پھر میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے مطبع میں ملازم ہوگئے، ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں دیوبند تشریف لائے اور یہاں صدارت تدریس کی مسند پر فائز ہوئے، یہ دارالعلوم کے پہلے شیخ الحدیث تھے، ان کے فیض تعلیم و تربیت نے بہت سے ممتاز علماء پیدا کیے، جو آسمان علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے، ۱۹ سال کی مدت میں ۷۷ طلباء نے آپ سے علوم نبویہ کی تحصیل کی، جن میں مولانا عبدالحق پور قاضوی، مولانا عبداللہ انبہٹوی، مولانا فتح محمد تھانوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا خلیل احمد انبہٹوی، مولانا احمد حسن امروہوی، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا حکیم منصور علی خاں مراد آبادی، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حافظ محمد احمد اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمہم اللہ جیسے مشاہیر اور یگانۂ عصر علماء شامل ہیں۔

مولانا محمد یعقوبؒ اور ان کے تلامذہ کے فیض تعلیم کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت ہند و پاک، افغانستان اور وسط ایشیا میں جس قدر علماء موجود ہیں۔۔۔۔۔ ان کی بڑی تعداد

اسی خوانِ علم کی زلّہ رُبا ہے، اُن کے حلقۂ درس کی نسبت اشرف السوانح میں لکھا ہے کہ :-

" حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ جو علاوہ ہر فن میں ماہر ہونے کے بہت بڑے صاحبِ باطن اور شیخ کامل بھی تھے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مولانا ممدوح سے بڑے بڑے فیوض و برکات حاصل کئے ہیں اور زیادہ تر علوم عجیبہ و غریبہ انھیں سے حاصل فرمائے ہیں، اور مولاناؒ کے اکثر اقوال و احوال و حقائق و معارف نہایت لطف لے کر بیان فرمایا کرتے ہیں، اور اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ حلقۂ درس کیا ہوتا تھا حلقۂ توجہ ہوتا تھا، یہ حال تھا کہ تفسیر کا سبق ہو رہا ہے، آیات کا مطلب بیان فرما رہے ہیں، اور آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہیں[1] "

حضرت مولانا محمد یعقوبؒ نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے سلوک و معرفت کے مقامات طے کئے تھے، اکثر جذب و کیف کی حالت طاری رہتی تھی، دنیوی علائق کی جانب مطلق توجہ نہ تھی، انھوں نے جو خطوط اپنے ایک مرید منشی محمد قاسم نیانگری کے نام لکھے ہیں وہ سلوک و معرفت کا مرقّع اور حقائق تصوّف کا دستور العمل ہیں، سالک کے لئے وہ ایک جامع ہدایت نامہ ہیں، راقم سطور کے

---

[1] اشرف السوانح جلد اول ص ۳۳ شائع کردہ کتب خانہ اشرفیہ دہلی۔

فاضل دوست محمد ایوب صاحب قادری کی رائے ہے کہ مکتوباتِ یعقوبی چشتی سلسلے کے مشہور شیخ مخدوم جہانگیر اشرف سمنانی (وفات ۸۰۸ھ / ۱۴۰۵ء) کے مکتوبات کا مختصر اردو ایڈیشن معلوم ہوتے ہیں، ان خطوط کا مقصودِ حیات اتباعِ سنّت اور اطاعتِ خداوندی ہے۔[1]

باوجودیکہ مزاج میں جلال اور "جذب" کا غلبہ تھا اور اس کے رعب و اثر کا یہ عالم تھا کہ لوگ بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے مگر آپ ہر شخص سے نہایت اخلاق و تواضع کے ساتھ پیش آتے تھے مولانا کے کشف کے حیرت انگیز واقعات سننے میں آئے ہیں، ایک مرتبہ چھتہ کی مسجد میں یہ ذکر چھڑا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں ایسا زبردست تسلط حاصل کر لیا ہے کہ ان کا اُکھڑنا آسان نہیں رہا، مولاناؒ اس مجلس میں موجود تھے، چونک کر بولے "کیا کہا — رات کو اِن کی حکومت ہو گی اور دن کو اُن کی، ہندوستان بغیر جنگ کے صف کی طرح پلٹ جائے گا"۔

کون کہہ سکتا ہے کہ ۱۴ر ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کی شب میں ایسا ہی نہیں ہوا!

دوسرا واقعہ ارواحِ ثلاثہ میں ایک ایسے شخص کی روایت سے درج ہے جو خود اس وقت موجود تھا، اس کا بیان ہے کہ جس زمانے میں

---

[1] مولانا محمد احسن نانوتوی مطبوعہ جاوید پریس کراچی ص ۱۹۷

ملکہ وکٹوریہ کی تاج پوشی کا جلسہ ہوا، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ دہلی میں مقیم تھے، اور دن میں اکثر غائب رہتے تھے، راوی کہتا ہے کہ میں نے دریافت کیا کہ "آپ کہاں غائب رہتے ہیں؟"۔ فرمایا کہ "مجھے حکم ہوا ہے کہ نواحِ دہلی میں جس جس جگہ تمہارا قدم جائے گا وہ جگہ آباد کردی جائے گی، اس لئے میں شہر کے اطراف میں گشت کیا کرتا ہوں تاکہ ویران شدہ مقامات پھر سے آباد ہوجائیں"۔ راوی کا بیان ہے کہ جن جن مقامات پر مولانا پھرے تھے وہ جگہ نئی دہلی کے نام سے آباد ہونی شروع ہوگئی ہے۔

آپ نے دو حج کئے، پہلا حج ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی معیت میں کیا گیا، مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور حاجی عابد حسینؒ دیوبندی بھی ساتھ تھے، یہ سفر پنجاب اور سندھ کے راستے سے کیا گیا، بیاضِ یعقوبی میں خود انھوں نے اس سفر کی مفصل یادداشت لکھی ہے، دوسرے حج کے لئے ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں تشریف لے گئے اس مرتبہ بھی علماء کی ایک بڑی جماعت کی معیت رہی، مولانا نانوتوی، مولانا گنگوہی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولوی حکیم ضیاء الدین رام پوری، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی وغیرہ حضرات کے علاوہ اس مقدس قافلے میں تقریباً سو آدمی تھے [1]

---

[1] مکتوباتِ یعقوبی ص ۱۵۱

مولانا محمد یعقوبؒ شعر و شاعری سے ذوق رکھتے تھے، گمنام تخلص تھا، انھوں نے دہلی میں بزمانۂ طالب علمی غالب، مومن، ذوق صہبائی اور آزردہ جیسے یگانۂ روزگار شعراء کو دیکھا تھا، اور ان کی مجالسِ سخن کے ہنگاموں سے اُن کے کان آشنا تھے، اپنے ایک خط میں منشی محمد قاسم نیانگری کو مشورہ دیا ہے کہ وہ درد، سودا، اور ذوق کے کلام کو پڑھا کریں، اس میں درد اثر ہے، مولانا کا فارسی اور اردو کلام بیاض یعقوبی میں درج ہے۔ اشعار میں قدرتِ کلام کے ساتھ سوز و گداز اور درد و اثر پایا جاتا ہے۔

تصانیف میں تین رسالے ان کی یادگار ہیں، سوانح قاسمی اگرچہ بہت مختصر سوانح حیات ہے مگر زبان و بیان اور حالات و واقعات کے لحاظ سے بہت قابلِ قدر ہے۔

ان کا دوسرا مجموعہ مکتوباتِ یعقوبی ہے جو ۶۴ خطوط پر مشتمل ہے یہ خطوط استفسارات کے جوابات میں لکھے گئے ہیں، ان میں راہِ سلوک کی دشواریوں کا حل، مسائلِ شرعیہ کا ذکر اور طریقت و سلوک کا دستور العمل بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا مجموعہ بیاضِ یعقوبی ہے، یہ سفرِ حج کے حالات، کتبِ احادیث کی اسانید، منظومات، عملیات وغیرہ پر مشتمل ہے، اخیر میں طبی نسخے درج ہیں، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے دونوں مجموعوں پر حسبِ ضرورت حواشی تحریر فرمائے ہیں۔

وفات سے چند دن پہلے وطنِ مالوف نانوتہ تشریف لے گئے تھے، وہیں بمرض ہیضہ ۳ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء رہگرائے عالم جاودانی ہوئے [1]

مولانا سید احمد دہلوی

مولانا موصوف نہایت جلیل القدر علماء میں سے تھے، علم معقول و منقول میں زبردست دست گاہ حاصل تھی، خصوصاً فنِّ ریاضی وہیئت میں تو اُن کا آوازہ شہرت یورپ تک پہنچا ہوا تھا، حضرت مولانا محمد قاسمؒ فرمایا کرتے تھے کہ "مولوی سید احمد صاحب کو خداوند کریم نے فنونِ ریاضی میں وہ استعداد اور مناسبت عطا فرمائی ہے کہ ان فنون کے موجدوں کو بھی شاید اتنی ہی ہو"

قیامِ دارالعلوم کے تیسرے سال ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں مدرس دوم کی حیثیت سے بُلائے گئے، حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کی وفات پر مسندِ صدارت تفویض ہوئی، جس پر چھ سال تک فائز رہے، اس مدت میں ۲۸ طلباء نے ان سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۵ء میں دارالعلوم سے علیٰحدگی اختیار کر کے بھوپال تشریف لے گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔

---

[1] بیاض یعقوبی مطبوعہ تھانہ بھون ۱۹۲۹ء ص ۱۵۳

مولانا سید احمد دہلوی، حضرت نانوتویؒ سے بیعت تھے، حضرت تھانویؒ اپنی مثنوی زیر وبم کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"جناب مولانا (سید احمد) بالخصوص در فن ریاضیہ بید طولیٰ می داشتند و کمال مہارت ایں فنون مشہور و معروف"۔ [1]

جن شعروں پر مذکورہ بالا حاشیہ لکھا گیا ہے وہ یہ ہیں:-

دومیٔ آں سالکِ شرعِ نبی — مولویٔ سید احمد دہلوی
وصفِ ذہنِ او اگر سازد رقم — ختم نبود بشکند صدہا قلم
خاتمِ معقول و علمِ فلسفہ — ہم ریاضی و علوم مشکلہ
پارسا و متقی، کم گو، حلیم — ہم سخی و ہم جواد و ہم کریم

افسوس ہے کہ مولانا سید احمدؒ کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ

حضرت شیخ الہندؒ دار العلوم کے سب سے پہلے شاگرد ہیں، ان ہی کی نسبت کہا گیا ہے کہ جس نے سب سے پہلے استاد کے سامنے کتاب کھولی وہ محمود تھا، حضرت شیخ الہندؒ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء میں بریلی میں ہوئی، جہاں ان کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی سرکاری

---

[1] مثنوی زیر وبم بحوالہ القاسم دار العلوم نمبر ماہ محرم ۱۳۴۷ھ ص ۱۹، ۲۰

محکمۂ تعلیم سے وابستہ تھے، ابتدائی تعلیم اپنے مشہور عالم چچا مولانا مہتاب علی مرحوم سے حاصل کی، قدوری اور شرح تہذیب پڑھ رہے تھے کہ دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا، آپ اس میں داخل ہو گئے، نصابِ دارالعلوم کی تکمیل کے بعد حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں رہ کر علم حدیث کی تحصیل فرمائی، فنون کی بعض اعلیٰ کتابیں والد ماجد سے پڑھیں، ۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ء میں حضرت نانوتویؒ کے دستِ مبارک سے دستارِ فضیلت حاصل کی[1] زمانۂ تعلیم ہی میں آپ کا شمار حضرت نانوتویؒ کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا تھا، اور حضرت نانوتوی خاص طور سے شفقت فرماتے تھے، چنانچہ اُن کی اعلیٰ علمی اور ذہنی صلاحیتوں کے پیشِ نظر دارالعلوم کی مدرسی کے لئے اکابر کی نظرِ انتخاب آپ کے اوپر پڑی اور ۱۲۹۱ھ ۱۸۷۴ء میں مدرسِ چہارم کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا، جس سے بتدریج ترقی پاکر ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۰ء میں صدارت کے منصب پر فائز ہوئے۔

ظاہری علم و فضل کی طرح باطن بھی آراستہ تھا، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے خلافت حاصل تھی، دارالعلوم میں صدارتِ تدریس کا مشاہرہ اس وقت ۷۵ روپے تھا مگر آپ نے ۵۰ روپے سے زیادہ کبھی قبول نہیں فرمائے، بقیہ ۲۵ روپے دارالعلوم کے

---

[1] روداد دارالعلوم ۱۲۹۰ھ ص ۱۰

کے چندے میں شامل فرمادیتے تھے، آپ کی زبردست علمی شخصیت کے باعث طلباء کی تعداد ۲۰۰ سے بڑھ کر ۶۰۰ تک پہنچ گئی تھی، آپ کے زمانے میں ۸۶۰ طلباء نے حدیث نبوی سے فراغت حاصل کی، حضرت شیخ الہندؒ کے فیضِ تعلیم نے مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا منصور انصاری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، مولانا سید فخر الدین احمد، مولانا محمد اعزاز علی امروہی، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی مولانا احمد علی لاہوری، جیسے مشاہیر اور نامور علماء کی جماعت تیار کی۔

حضرت شیخ الہندؒ کے حلقۂ درس کی خصوصیات کی نسبت مولانا میاں اصغر حسینؒ نے لکھا ہے :-

"حلقۂ درس کو دیکھ کر سلفِ صالحین واکابر محدثین کے حلقۂ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا، قرآن وحدیث حضرت کی زبان پر تھا، اور ائمہ اربعہ کے مذاہب ازبر، صحابہ وتابعین، فقہاء مجتہدین کے اقوال محفوظ، تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں، نہ مُنھ میں کف آتا تھا، نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو جامع الغموض اور بھدّی بناتے تھے، نہایت سُبک اور سہل الفاظ با محاورہ اردو میں، اس روانی اور جوش سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ دریا اُمنڈ رہا ہے، یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے، ہزاروں دیکھنے والے موجود ہیں کہ

وہی منحنی اور منکسر المزاج ایک مُشت استخواں، ضعیف الجثّہ مردِ خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی، مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا مسندِ درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیرِ خدا ہے، جو قوت و شوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے، آواز میں کرختگی آمیز بلندی نہ تھی لیکن مدرسہ کے دروازے تک بے تکلف قابلِ فہم آواز آتی تھی، لہجے میں تصنّع اور بناوٹ کا نام نہ تھا، لیکن خدا تعالیٰ نے تقریر میں اثر دیا تھا، بات دل نشین ہو جاتی تھی اور سننے والا بھی یہ سمجھ کر اٹھتا تھا کہ وہ جو فرما رہے ہیں حق ہے۔

بہت سے ذی استعداد اور ذہین و فطین طالب علم جو مختلف اساتذہ کی خدمتوں میں استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے اپنے شکوک و شبہات کے کافی جواب پانے کے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویّہ کے معانی اور مضامین عالیہ سُن کر سرِ نیاز خم کر کے معترف ہوتے کہ یہ علم کسی نہیں ہے اور ایسا محقق عالم دنیا میں نہیں ہے۔

مسائل مختلف فیہا میں ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور مختصر طور سے دلائل بھی نقل کرتے لیکن جب امام ابو حنیفہ کا نمبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح چہرے پر بشاشت، تقریر میں روانی، لہجے میں جوش پیدا ہو جاتا تھا دلیل پر دلیل، شاہد پر شاہد، قرینہ پر قرینہ بیان کرتے چلے جاتے

تقریر رکتی ہی نہ تھی، اور اس خوبی سے مذہب امام اعظمؒ کو ترجیح دیتے تھے کہ سلیم الطبع اور منصف المزاج لوٹ جاتے تھے، دُور کی مختلف المضامین احادیث جن کی طرف کبھی خیال بھی نہ جاتا تھا پیش کر کے اس طرح مدّعا ثابت فرماتے کہ بات دل میں اترتی چلی جاتی اور سامعین کا دل گواہی دیتا اور آنکھوں سے نظر آجاتا تھا کہ یہی جانبِ حق ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں کہ میں نے حضرت شیخ الہندؒ سے حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی حجۃ الاسلام پڑھی، کتاب پڑھتے ہوئے کبھی کبھی یوں محسوس کرتا کہ جیسے علم اور ایمان میرے دل میں اوپر سے نازل ہو رہا ہے"۔ [1]

بایں ہمہ ائمہ اسلام کا ادب و احترام اور ان کے کمالات کا اعتراف حضرت کی تعلیم کا ایک جزو لاینفک ہو گیا تھا، خود بھی ایسی ہی تقریر فرماتے اور صراحت سے ذہن نشین کراتے کہ مذاہب مجتہدین حق ہیں اور وہ سب مُستَدَل بالکتاب والسنّہ، ان کی تنقیص، موجبِ بدبختی اور سوءِ ادب باعثِ خسران ہے۔

محدّثین میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ مجتہدین میں امام اعظمؒ کے ساتھ خاص تعلق تھا"۔ [2]

---

[1] شاہ ولی اللہؒ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۲۶۶

[2] حیاتِ شیخ الہندؒ مصنفہ مولانا میاں اصغر حسین ص ۲۳ - ۲۵

آخر عمر میں جب جنگ طرابلس و بلقان کی وجہ سے مسلمانوں میں ہیجان پھیلا ہوا تھا، حضرت شیخ الہندؒ نے ہندوستان سے برطانوی حکومت کے اقتدار کو ختم کرنے کے لئے ایک اسکیم تیار کی، یہ ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۳ء کا زمانہ تھا، انھوں نے مسلح انقلاب کے ذریعے سے برطانوی گورنمنٹ کا تختہ اُلٹ دینے کا نقشہ تیار کیا اور اس کے لئے انھوں نے نہایت منظم طور پر اپنا پروگرام مرتب کیا تھا، ان کے شاگردوں اور رفقاء کار کی ایک بڑی جماعت جو ہندو بیرون ہند کے اکثر ممالک میں پھیلی ہوئی تھی، اُن کے مجوّزہ پلان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نہایت سرگرمی اور جاں بازی کے ساتھ کوشاں تھی، شاگردوں میں مولانا عبیداللہ سندھی مولانا محمد میاں منصور انصاری اور دوسرے بہت سے تلامذہ اس میں شامل تھے، جنھوں نے حضرت شیخ الہندؒ کے سیاسی اور انقلابی پروگرام کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کا خیال تھا کہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے باہر کی حکومتوں سے بھی اس سلسلے میں مدد لینا ضروری ہے، اس بنا پر آپ نے مولانا عبیداللہ سندھی کو ایک خاص مشن پر کابل جانے کا حکم دیا اور مولانا منصور انصاری کو آزاد قبائل میں جہاد کی تلقین کے لئے بھیجا اور ترکوں سے مدد حاصل کرنے کے لئے خود حجاز کا سفر کیا، انگریز اس زمانے میں جرمنی سے جنگ میں مصروف تھے، یہ تفصیلات "ریشمی خطوط کی تحریک" میں اوپر گزر چکی ہیں۔

شیخ الہندؒ نے اپنی مجوّزہ اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے پیرانہ سالی کے باوجود ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۵ء میں حجاز کا سفر فرمایا، وہاں کے ترکی گورنر غالب پاشا اور انور پاشا سے جو اس وقت ترکی کے وزیر جنگ تھے ملاقات فرما کر بعض اہم امور طے کیے، آپ حجاز سے براہ بغداد بلوچستان ہوتے ہوئے سرحد کے آزاد قبائل میں پہنچنا چاہتے تھے کہ اچانک جنگِ عظیم کے دوران میں شریف حسین والیٔ مکہ نے انگریز حکام کے ایماء پر آپ کو گرفتار کر کے اُن کے حوالے کر دیا، حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیر گل، حکیم نصرت حسین اور مولوی وحید احمد کی گرفتاری بھی عمل میں آئی، آپ کو پہلے مصر اور پھر وہاں سے مالٹا لے جایا گیا، جو برطانوی قلمرو میں جنگی مجرموں کے لئے محفوظ ترین مقام سمجھا جاتا تھا "سفرنامہ اسیر مالٹا" میں اس کی پوری تفصیلات درج ہیں، مالٹا میں سوا تین سال تک مع رفقاء نظر بند رکھا گیا، جنگ کے ختم ہونے پر آپ کو ہندوستان آنے کی اجازت ملی اور ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء کو آپ نے ساحل بمبئی پر قدم رنجہ فرمایا، دیوبند پہنچ کر آپ سب سے پہلے دارالعلوم میں تشریف لائے بعد ازاں مکان تشریف لے گئے۔

ہندوستان پہنچتے ہی حضرت شیخ الہندؒ تحریک خلافت میں شریک ہو گئے، برطانوی حکومت سے آپ نے فتویٰ ترکِ موالات کا دیا، جس سے ملک میں زبردست ہیجان پیدا ہو گیا، حتیٰ کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تک کو لوگ بند کرنے پر آمادہ ہو گئے، حضرت شیخ الہندؒ

سخت علیل تھے، لیکن اسی حالت میں آپ علی گڑھ تشریف لے گئے اور جامعہ ملّیہ (جو بعد کو دہلی منتقل ہو گئی) کا افتتاح آپ کے ہاتھ سے کرایا گیا، اس موقع پر آپ نے جو اہم سیاسی خطبہ دیا تھا وہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

غرض کہ آپ علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے علاوہ سیاست و تدبّر میں بھی کامل دست گاہ رکھتے تھے، اگرچہ مالٹا سے واپسی کے بعد صحت بگڑ چکی تھی اور قویٰ پیرانہ سالی کے باعث نہایت ضعیف ہو گئے تھے مگر بایں ہمہ آپ نے نہایت شدّ و مد کے ساتھ سیاسی کاموں میں حصّہ لیا، طبیعت اس بارِ گراں کی متحمّل نہ ہو سکی، اسی دوران میں علی گڑھ کا سفر پیش آیا، واپسی کے بعد جب حالت زیادہ تشویش ناک ہو گئی تو بغرض علاج ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے یہاں دہلی لیجایا گیا، حکیم اجمل خاں بھی شریکِ علاج تھے، مگر وقتِ موعود آ چکا تھا ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کی صبح کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، جنازہ دیوبند لایا گیا اور اگلے روز حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی قبر مبارک کے قریب یہ گنجینہ فضل و کمالات دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہو گیا۔ ۱۹۲۱ء

شاگردوں میں بے شمار علماء و فضلاء کے علاوہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ، ادلّۂ کاملہ، ایضاح الادلّہ، احسن القریٰ، جہد المقل الابواب والتراجم اور مختلف فتاویٰ اور سیاسی خطبات تصنیفی یادگار ہیں۔

مندرجہ ذیل کتابوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے تفصیلی حالات درج ہیں :-

(۱) حیات شیخ الہندؒ مصنفہ مولانا میاں اصغر حسین دیوبندیؒ
(۲) نقشِ حیات مصنفہ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
(۳) اسیرِ مالٹا، مصنفہ مولانا مدنیؒ
(۴) تذکرہ شیخ الہندؒ، مصنفہ مولانا عزیز الرحمٰن بجنوری

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ

شاہ صاحبؒ کشمیر کے رہنے والے تھے، ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء کو سادات کے ایک معزز علمی خاندان میں آپ کی ولادت ہوئی، یہ خاندان اپنے علم و فضل کے لحاظ سے کشمیر بھر میں ممتاز خاندان سمجھا جاتا تھا، ساڑھے چار سال کی عمر میں اپنے والد بزرگوار مولانا سیّد معظم شاہؒ سے قرآن مجید شروع کیا، غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور بے مثل قوّتِ حافظہ ابتدائے عمر سے موجود تھی، چنانچہ ڈیڑھ سال کی قلیل مدّت میں کتاب اللہ کے ساتھ فارسی کی چند ابتدائی کتابیں ختم کر کے علومِ متداولہ کی تحصیل میں مشغول ہو گئے اور ابھی بمشکل ۱۴ سال کی عمر تھی کہ حصولِ علم کے جذبۂ بے پایاں نے ترکِ وطن پر آمادہ کر دیا، تقریباً تین سال ہزارہ کے مدارس میں رہ کر مختلف علوم و فنون میں دست گاہ حاصل کی، مگر دیوبند کی شہرت نے مزید تکمیل کے لئے بے چین بنا دیا، چنانچہ ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۱ء میں دیوبند تشریف لائے، حضرت شیخ الہندؒ مسندِ صدارت پر متمکن تھے

استاد نے شاگرد کو اور شاگرد نے استاد کو پہلی ہی ملاقات میں پہچان لیا، تفسیر و حدیث کی کتابیں شروع کیں اور چند ہی سال میں دارالعلوم میں شہرت و مقبولیت کے ساتھ ایک امتیازی شان حاصل کر لی، دارالعلوم سے فارغ ہو کر آپ حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سندِ حدیث کے علاوہ باطنی فیوض سے بھی مستفیض ہوئے

دارالعلوم سے فراغت کے بعد آپ نے مدرسہ امینیہ دہلی میں کچھ دنوں فرائض تدریس انجام دئے، ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۳ء میں کشمیر چلے گئے، وہاں اپنے علاقے میں فیضِ عام کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے، کچھ مدت تک حجاز میں قیام رہا اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کا موقع ملا، ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء میں آپ دیوبند تشریف لائے، حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو یہاں روک لیا، کئی سال تک بغیر مشاہرہ کے کتب حدیث کے درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۵ء کے اواخر میں جب شیخ الہندؒ نے سفر حجاز کا قصد کیا تو اپنی جانشینی کا فخر شاہ صاحبؒ کو بخشا، دارالعلوم کی مسندِ صدارت پر تقریباً ۱۲ سال تک جلوہ افروز رہے، ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء کے اوائل میں اہتمام دارالعلوم سے بعض اختلافات کے باعث آپ فرائض صدارت سے دست کش ہو کر جنوبی ہند کے مدرسہ ڈابھیل میں تشریف لے گئے، اور ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء تک وہاں درسِ حدیث کا مشغلہ جاری رہا۔

اگر حضرت شیخ الہندؒ نے دارالعلوم کا غلغلہ چار دانگِ عالم میں بلند کیا تو حضرت شاہ صاحب نے دارالعلوم کی مسندِ تدریس پر رونق افروز ہوکر عالمِ اسلام کو علم دین کی روشنی سے منور کر دیا، علمِ حدیث میں وہ عدیم النظیر محدث تھے، علوم فقہ میں فقیہہ اعظم، اتباعِ شریعت میں صلحائے سلف کا نمونہ تھے تو معرفتِ الٰہی میں جنیدِ وقت اور شبلیٔ عصر، ان کا وجود شریعت کے لئے بھی موجبِ تقویت تھا اور طریقت کے لئے بھی وجہِ نازش، حضرت گنگوہیؒ سے شرفِ خلافت حاصل کیا تھا،

اسلامی دنیا نے اس قدر وسیع العلم اور باعمل علماء بہت کم پیدا کئے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کا قد درمیانہ، رنگ سفید، خدوخال خوبصورت پیشانی چوڑی اور آنکھیں مقناطیسی کشش رکھتی تھیں۔

شاہ صاحب اگر ایک طرف اپنے معاصرین میں تبحر علمی کے لحاظ سے عدیم النظیر تھے تو دوسری جانب زہد و تقویٰ میں بھی ان کی ذات بے مثل تھی، وہ ایک باکمال مفسر، محدث اور فلسفی تھے، آدمی میں ایک کمال کا ہونا بھی کم نہیں ہوتا، مگر ان کی دستارِ کمال میں متعدد لعل آویزاں تھے، حقیقت یہ ہے کہ ان کے وجود سے علمی دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا تھا، تشنگانِ علوم کی جس کثیر تعداد نے اس بحرالعلوم سے سیرابی حاصل کی وہ آپ اپنی مثال ہے، مشرقِ وسطیٰ سے لے کر چین تک ان کے فیضانِ علم کا سیلاب

موجیں مارتا رہا اور ہند و بیرون ہند کے ہزاروں تشنگانِ علوم نے اس سے اپنی پیاس بجھائی، ہند و پاک، عرب، ایران، عراق، افغانستان چین، مصر، جنوبی افریقہ، انڈونیشیا اور ملائشیا میں بکثرت آپ کے تلامذہ پھیلے ہوئے ہیں۔ دارالعلوم میں آپ کے زمانۂ قیام میں ۸۰۹ طلباء نے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔

قدرت کی جانب سے حافظہ ایسا عدیم النظیر بخشا گیا تھا کہ ایک مرتبہ کی دیکھی ہوئی کتاب کے مضامین و مطالب تو درکنار عبارتیں تک مع صفحات و سطور کے یاد رہتیں اور دورانِ تقریر میں بے تکلف حوالے پر حوالے دیتے چلے جاتے تھے، اسی کے ساتھ مطالعے کا اس قدر شوق تھا کہ جملہ علوم کے خزانے اُن کے دامنِ جستجو کی وسعتوں کو مطمئن اور تشنگیٔ علم کو سیراب نہ کر سکتے تھے، کثرتِ مطالعہ اور قوتِ حافظہ کے باعث گویا ایک متحرک و متکلم کتب خانہ تھے، صحاحِ ستّہ کے علاوہ حدیث کی اکثر کتابیں تقریباً برزبان تھیں، تحقیق طلب مسائل جن کی جستجو اور تحقیق میں عمریں گذر جاتی ہیں، سائل کے استفسار پر چند لمحوں میں اس قدر جامعیت کے ساتھ جواب دے دیتے تھے کہ اس موضوع پر سائل کو نہ تو شبہ باقی رہتا تھا اور نہ کتاب دیکھنے کی ضرورت، پھر مزید لطف یہ کہ کتابوں کے ناموں کے ساتھ صفحات و سطور تک کا حوالہ بھی بتلا دیا جاتا تھا، وہ ہر ایک علم و فن پر اس طرح برجستگی کے ساتھ تقریر فرماتے تھے کہ گویا ان کو تمام علوم مستحضر ہیں، دورانِ تقریر

میں بے شمار کتابوں کے حوالے بلا تکلف دیتے چلے جاتے تھے، حتی کہ اگر کسی کتاب کے پانچ پانچ اور دس دس حواشی ہوتے تو ہر ایک کی عبارت بقیدِ صفحہ وسطر یاد ہوتی تھی، احادیث کا تمام ذخیرہ اور ان کی صحت وعدمِ صحت کے متعلق طویل وعریض بحثیں، رُوات کے مدارج ومراتب برنوکِ زبان تھے، مشہور ومعروف کتب خانوں کے اکثر مخطوطات نظر سے گزر چکے تھے، اور اس طرح حافظہ میں موجود تھے کہ گویا آج ہی ان کا مطالعہ کیا ہے۔

پھر مطالعہ محض علوم شرعیہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ جس فن کی بھی کتاب ہاتھ آتی اس کا شروع سے آخر تک ایک مرتبہ مطالعہ ضرور فرمالیتے تھے اور جب کبھی اس کے متعلق بحث چھڑ جاتی تو اس کتاب کے مندرجات کو اس طرح حوالوں کے ساتھ بیان فرمادیتے کہ سننے والا حیران وششدر رہ جاتا، ایک مرتبہ کسی شخص نے علم جفر کے مشکل ترین مسائل حل کرنے کے لئے پیش کئے، شاہ صاحب نے حسبِ معمول برجستہ جوابات کے ساتھ متعدد کتب کے حوالے دے کر بتلادیا کہ فلاں فلاں کتابوں کی جانب رجوع کیا جائے۔

شاہ صاحبؒ کا حافظہ غضب کا تھا، شیخ ابن ہمامؒ کی مشہور کتاب فتح القدیر جو آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے اس کا مطالعہ ۲۰ دن میں اس طرح کیا تھا کہ فتح القدیر کی کتاب الحج کی تلخیص بھی ساتھ ساتھ کرتے گئے تھے اور ابنِ ہمام نے صاحب ہدایہ پر جو

جو اعتراضات کئے ہیں ان کے جوابات بھی لکھتے گئے، دورانِ درس میں ایک مرتبہ فرمایا کہ اب سے ۲۶ سال پہلے میں نے فتح القدیر کا مطالعہ کیا تھا، بحمداللہ اب تک دوبارہ دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، اور آج بھی اس کا جو مضمون اور بحث پیش کروں گا اگر تم مراجعت کروگے تو تفاوت بہت کم پاؤگے"۔

یہ ایک واقعہ ہے، اس طرح کے واقعات ان کی زندگی میں بے شمار ہیں۔

علامہ اقبالؔ مرحوم کو شاہ صاحبؒ سے بڑا تعلق تھا، اور اکثر علمی مباحث میں ان سے رجوع کرتے تھے، اُن کا خیال تھا کہ اسلامی مسائل کی تدوین جدید کے لئے شاہ صاحب سے بہتر کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔

غرض کہ علوم تفسیر و حدیث اور فقہ کی جس قدر خدمات آپ نے انجام دیں وہ آپ اپنی مثال ہیں، متعدد معرکۃ الآراء مسائل پر کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں، درسِ حدیث کی تقریر کی جامعیت کا اندازہ "فیض الباری" سے کیا جاسکتا ہے، جو صحیح بخاری کی تقریر ہے اور چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے، درایت میں زبردست کمال حاصل تھا، دو مختلف و معارض اقوال میں اپنی قوتِ استنباط کے زور سے بلا تکلف ایک کو دوسرے پر ترجیح دے دیتے تھے۔

علومِ نقلیہ و عقلیہ کے علاوہ علمِ تصوف پر بھی ان کی نظر مبصرانہ تھی

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے شاہ صاحبؒ کی وفات پر "معارف میں" لکھا تھا :-

"اُن کی مثال اُس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے، وہ وسعتِ نظر، قوتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے، علومِ حدیث کے حافظ و نکتہ شناس، علومِ ادب میں بلند پایہ معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے، مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قال اللہ وقال الرسول کا نعرہ بلند رکھا۔"

مصر کے مشہورِ زمانہ عالم سید رشید رضا جب دیوبند تشریف لائے اور شاہ صاحبؒ سے ان کی ملاقات ہوئی تو بے ساختہ بار بار کہتے تھے :-

ما رأیت مثل ھذا الاستاذ الجلیل۔ — میں نے اس جلیل القدر استاد جیسا کوئی عالم نہیں دیکھا۔

بہرحال دارالعلوم کی یہ خوش قسمتی تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ کے بعد صدارتِ تدریس کا کام آپ کے سپرد ہوا، بقول مولانا سید مناظر احسن گیلانی آپ کے زمانے میں طلباء کی استعداد میں بڑا انقلاب ہوا اور اچھے اچھے مستعد طلباء آپ کے حلقۂ درس سے مستفید ہو کر اٹھے

ملکی سیاست میں شاہ صاحبؒ اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کے مسلک کے پیرو تھے، مسلمانانِ ہند میں صحیح اسلامی زندگی پیدا کرنا علماء کا اولیں فریضہ سمجھتے تھے، جمعیۃ علماء ہند کے آٹھویں سالانہ اجلاس منعقدہ پشاور کا بصیرت افروز خطبۂ صدارت اس کا روشن ثبوت ہے۔

علمی ذوق کا طبیعت پر اس قدر غلبہ تھا کہ عرصے تک نکاح اور متاہلانہ زندگی سے گھبراتے رہے، مگر بالآخر بزرگوں کے شدید اصرار سے متاہلانہ زندگی اختیار فرمالی تھی اور اس کے بعد تنخواہ لینے لگے تھے، ڈابھیل میں چند سال قیام فرمانے کے بعد آخر میں امراض کی شدّت سے مجبور ہوکر دیوبند جس کو آپ نے اپنا وطنِ اقامت بنالیا تھا چلے آئے تھے اور یہیں ۳ر صفر المظفر ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء کو ۶۱ سال کی عمر میں رحلت فرمائی، قبر مبارک عیدگاہ کے قریب ہے۔

علامہ اقبال مرحوم کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسلام سے جو شغف پیدا ہوگیا تھا اس میں شاہ صاحبؒ کے فیضانِ صحبت کو بھی بڑا دخل حاصل ہے، علامہ موصوف نے اسلامیات میں شاہ صاحب سے بہت کچھ استفادہ کیا تھا، چنانچہ علامہ اقبال مرحوم آپ کا بے حد احترام کرتے اور عقیدت و محبّت کے جذبات کے ساتھ شاہ صاحبؒ کی رائے کے آگے سرِ تسلیم خم کردیتے تھے۔

مختلف اسلامی مباحث پر عربی اور فارسی میں ایک درجن سے زائد

تصانیف جو نہایت معرکۃ الآرار مسائل پر مشتمل ہیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں اور ان سے کہیں زیادہ کتابیں طباعت کی منتظر ہیں۔

مولانا محمد یوسف بنّوری نے نفحۃ العنبر میں شاہ صاحبؒ کے تفصیلی حالات لکھے ہیں، یہ کتاب عربی میں ہے، دوسری کتاب حیاتِ انور ہے، یہ اردو میں ہے۔ حیاتِ انور مختلف حضرات کے مضامین کا گراں قدر مجموعہ ہے۔

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

حضرت مدنیؒ کا وطن موضع اسلام داد پور ٹانڈہ ضلع فیض آباد ہے، ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء کو ضلع اناؤ کے ایک قصبہ بانگرمئو میں جہاں آپ کے والد ماجد سید حبیب اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر تھے، پیدا ہوئے، ۱۹ پشت پیشتر آپ کا خاندان ہندوستان آیا تھا، اپنے علم و تقویٰ کے لحاظ سے سادات کا یہ خاندان ہمیشہ ایک خاص عظمت اور شاہی زمانہ میں ایک بڑی جاگیر کا مالک رہا ہے۔

ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول میں حاصل کرنے کے بعد بعمر ۱۲ سال ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۱ء میں آپ دیوبند تشریف لائے، میزان الصرف میں داخلہ لیا، یہاں حضرت شیخ الہندؒ نے خاص شفقت و عنایت سے آپ کی تعلیم و تربیت فرمائی، دار العلوم کے نصاب کی تکمیل اور سات سال یہاں کے علمی ماحول میں گزارنے کے بعد جب وطن مالوف

تشریف لے گئے تو والد ماجد شوقِ ہجرت میں مدینۃ الرسول کے لئے رختِ سفر باندھ چکے تھے، آپ بھی والدین کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔ روانگیٔ حجاز سے قبل آپ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہو چکے تھے مکہ مکرمہ میں پیر و مرشد کی ہدایت کے بموجب کچھ عرصے تک حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہٗ سے کسبِ فیض کیا بعد ازاں مدینہ منوّرہ میں والد ماجد کے ساتھ مقیم ہو گئے، ہر چند آپ نے ہندوستان سے ہجرت کا قصد نہیں فرمایا تھا تاہم والد صاحب کی حیات تک آغوشِ پدری کو چھوڑ کر ہندوستان واپس آنا پسند نہیں کیا۔

قیامِ مدینہ کے زمانے میں تقریباً ۱۰ سال تک مسجدِ نبوی میں درسِ حدیث کی خدمت تنگی اور عسرت کے باوجود توکلاً علی اللہ انجام دی، عموماً روزانہ ۱۲، ۱۲ گھنٹے تک مسلسل درس و تدریس کا مشغلہ جاری رہتا تھا، مختلف جماعتیں یکے بعد دیگرے حاضر ہو کر آپ کے فیضانِ علمی سے سیراب ہوتی تھیں، مسجدِ نبوی میں آپ کا درسِ حدیث وہاں کے تمام شیوخِ حدیث سے زیادہ پسندیدہ اور مقبول تھا اور اس کی شہرت نے مختلف اسلامی ممالک کے طالبانِ علم کی ایک بڑی تعداد کو آپ کے گرد جمع کر دیا تھا، حجاز کی مقدس سرزمین اور خاص مسجدِ نبوی میں ایک ہندوستانی عالم کی جانب اس قدر کشش اور قبولِ عام کا باعث آپ کے طریقِ درس کی اس خصوصیت کو سمجھنا چاہیے

جو آپ کو دارالعلوم کے اساتذہ سے ورثہ میں ملی تھی۔

مدینہ منوّرہ کے قیام کے زمانے میں آپ کئی مرتبہ ہندوستان تشریف لائے اور حضرت گنگوہیؒ سے خلعتِ خلافت حاصل کیا، سنہ ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء میں تقریباً ایک سال دیوبند میں قیام فرما کر تدریسی خدمات انجام دیں، سنہ ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۵ء میں جب حضرت شیخ الہندؒ حجاز تشریف لے گئے تو آپ کے یہاں قیام فرمایا اور آپ ہی کے ذریعے سے ترکی کے وزیر جنگ انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات فرما کر اپنی انقلابی اسکیم ان کے سامنے پیش کی تھی، جب عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی اور شریف حسین نے حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کیا تو آپ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے رفقاء میں شامل تھے، چنانچہ سوا تین سال تک آپ کو بھی مالٹا میں جنگی قیدی کی حیثیت سے رہنا پڑا سنہ ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء میں جب مالٹا سے رہائی ہوئی تو آپ حضرت شیخ الہندؒ کی معیت میں ہندوستان تشریف لائے، مالٹا سے واپسی کا زمانہ تحریکِ خلافت کے آغاز کا زمانہ تھا، آپ یہاں پہنچ کر حضرت شیخ الہندؒ کی قیادت میں سیاست میں شریک ہو گئے، اس زمانے میں آپ کی مجاہدانہ اور سرفروشانہ قربانیوں نے مسلمانوں کے دلوں کو آپ کی عظمت و محبت سے لبریز کر دیا تھا، حضرت شیخ الہندؒ کی وفات پر متفقہ طور سے آپ کو ان کا جانشین تسلیم کر لیا گیا، سیاسی کاموں میں شرکت و انہماک کے باعث آپ کو متعدد مرتبہ کئی کئی سال تک جیل میں بھی رہنا پڑا، اور ملک کی آزادی کے لئے قید و بند کی ہوش ربا

صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

سنہ ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء میں جب حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم سے مستعفی ہوئے تو آپ کے سوا جماعت دارالعلوم میں کوئی ایسی شخصیت موجود نہ تھی جو دارالعلوم کی اس مہتم بالشان جگہ کو اس کے شایانِ شان پُر کرسکے، اس لئے اکابر کی نظرِ انتخاب آپ ہی پر پڑی، آپ کے زمانۂ صدارت میں طلبا کی تعداد میں دوگنے سے بھی زیادہ اضافہ ہوا اور خاص دورۂ حدیث کی جماعت میں تو یہ اضافہ تین گنے سے بھی متجاوز ہے، سنہ ۱۳۴۶ھ سے سنہ ۱۳۷۷ھ تک ۳۲ سال کی مدت آپ کے زمانۂ صدارت میں ۴۴۸۳، طلباء نے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی، جب کہ حضرت مولانا مدنیؒ کے عہدِ صدارت سے قبل فضلائے کرام کی تعداد ۲۷۵۱ ہے۔

آپ کا درسِ حدیث مضامین کے تنوع اور جامعیت کے لحاظ سے دنیائے اسلام میں اپنی نوعیت کا واحد درس سمجھا جاتا تھا چنانچہ اس کی عظمت و شہرت اور کشش سال بسال طلبار کی تعداد میں اضافے کا موجب ہوتی رہی۔ حدیثِ نبوی میں آپ کے تلامذہ کا حلقہ اس قدر وسیع ہے کہ ممالک اسلامیہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں آپ کے شاگرد موجود نہ ہوں، جس طرح آج دنیائے اسلام میں دارالعلوم کو علوم نبویہ کی تعلیم میں طغرائے امتیاز حاصل ہے اسی طرح آپ کا علمی فیضان بھی آپ اپنی مثال ہے۔

حضرت مولانا مدنیؒ کے روزانہ کے مشاغل اور معمولات یہ تھے "آخر شب میں نماز فجر تک تہجد اور ذکر و وظائف وغیرہ، نماز فجر کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ تلاوتِ قرآن مجید اور مطالعۂ کتب، اس کے بعد مردانے میں مہمانوں کے ساتھ چائے اور ناشتہ، پھر تقریباً بارہ بجے تک صحیح بخاری اور ترمذی شریف کا درس، دوپہر کے کھانے اور نماز ظہر کے بعد ڈاک دیکھنا، اور خطوط کے جواب لکھنا اور مہمانوں سے بات چیت، نماز عصر کے بعد مغرب تک پھر صحیح بخاری کا درس ہوتا تھا، مغرب کی نوافل میں کم از کم ایک پارہ کی تلاوت کا روزانہ معمول تھا، اس سے فراغت کے بعد رات کا کھانا اور نمازِ عشاء کے بعد بھی اکثر صحیح بخاری کا درس ہوتا تھا جو بارہ بجے شب تک جاری رہتا تھا۔

دسترخوان نہایت وسیع تھا، عموماً کم از کم دس پندرہ مہمان آپ کے دسترخوان پر ضرور موجود رہتے تھے۔

محرم ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء میں حضرت مولانا مدنیؒ پر مدراس کے سفر میں دل کا دورہ پڑا، دیوبند تشریف لانے پر ڈاکٹروں نے تشخیص کیا کہ قلب کا پھیلاؤ بڑھ گیا ہے، مقامی اور بیرونی ڈاکٹروں کا علاج ہوتا رہا، مگر افاقہ نہ ہوا، پھر یونانی علاج شروع کیا گیا، اس سے مرض میں قدرے تخفیف محسوس ہوئی، ۱۰ر ۱۱ر جمادی الاولیٰ (۳ر ۴ر دسمبر) کو طبیعت کافی پُرسکون رہی، ۱۲ر جمادی الاولیٰ

(۵ر دسمبر) کی صبح کو طبیعت کافی بشاش ہوگئی، کئی دن کے بعد دوپہر کو غذا تناول فرمائی، اور پھر لیٹ گئے، ۳ر بجے کے قریب نماز ظہر کے لئے جب بیدار کرنا چاہا تو پتہ چلا کہ حضرت مدنیؒ واصل بحق ہو چکے ہیں، ۹ بجے شب میں جنازہ دار الحدیث میں لاکر رکھا گیا، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور ۱۲ر ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ (۵، ۶ر دسمبر ۱۹۵۷ء) کی درمیانی شب میں اس خزینۂ علم و معرفت کو سپرد خاک کر دیا گیا جس نے ۳۱ سال تک دار العلوم دیوبند میں حدیثِ نبوی کی شمع کو روشن رکھا تھا، اور جس کے خرمنِ فضل و کمال سے خوشہ چینی کرنے میں طالبانِ علمِ نبوت نے ہمیشہ فخر محسوس کیا۔

حضرت مولانا مدنیؒ کے تفصیلی حالات کے لئے خود ان کی خودنوشت سوانح نقشِ حیات، الجمعیۃ کا شیخ الاسلام نمبر، اور انفاسِ قدسیہ مصنفہ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری سے مراجعت کی جائے۔

مولانا سید فخر الدین احمد

وطن مالوف ہاپوڑ ہے، آپ کے آبا، و اجداد میں سید قطب اور سید عالم اپنے دوسرے دو بھائیوں کے ساتھ عہد شاہجہاں میں ہرات سے دہلی آئے، یہ حضرات اپنے زمانے کے ممتاز علماء میں سے تھے، شاہجہاں نے ان کے درس و تدریس کے لئے

ہاپوڑ میں ایک مدرسہ تعمیر کرادیا، سید عالم کا سلسلۂ نسب ۲۶ واسطوں سے حضرت امام حسینؓ پر منتہی ہوتا ہے۔

۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء میں آپ کی ولادت اجمیر میں ہوئی، جہاں آپ کے دادا سید عبدالکریم محکمۂ پولیس میں تھانیدار تھے، چار سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہوا، قرآن شریف والدہ ماجدہ سے پڑھا، فارسی کی تعلیم اپنے خاندان کے بزرگوں سے حاصل کی، عمر کے بارھویں سال اپنے خاندانی عالم مولانا خالد سے عربی صرف ونحو شروع کی، اسی دوران میں آپ کے والد ماجد کو اپنے آبائی مدرسہ کے احیاء کا خیال پیدا ہوا جو ۱۸۵۷ء کی دارو گیر کی نذر ہوگیا تھا، چند سال اس میں تعلیم پانے کے بعد آپ کو گلاوٹھی کے مدرسہ منبع العلوم میں بھیج دیا گیا، وہاں مولانا ماجد علی سے مختلف کتابیں پڑھیں، بعد ازاں اپنے استاذ مولانا ماجد علی کے ساتھ دہلی چلے گئے، دہلی کے مدارس میں معقولات کی کتابیں پڑھیں، ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء میں دارالعلوم میں آئے، حضرت شیخ الہندؒ نے امتحان داخلہ لیا، امتحان میں امتیازی نمبروں سے سرفراز ہوئے، حضرت شیخ الہندؒ کی ہدایت کے مطابق ایک سال کے بجائے دو سالوں میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی، دارالعلوم کے زمانۂ طالب علمی ہی میں طلباء کو معقولات کی کتابیں پڑھانے لگے تھے۔

۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم میں

مدرس مقرر ہو گئے، مگر پھر کچھ عرصے کے بعد اکابر دار العلوم نے شوال ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء میں آپ کو مدرسہ شاہی مراد آباد میں بھیج دیا، مراد آباد میں تقریباً ۴۸ سال قیام رہا، تقریباً نصف صدی کی اس طویل مدت میں بہت سے طلبائے حدیث نے آپ سے اکتساب فیض کیا ہے [1]

مولانا ممدوح چونکہ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کے خاص تلامذہ میں سے ہیں، اس لئے آپ کے درس حدیث میں دونوں جلیل القدر استادوں کے رنگ کی آمیزش پائی جاتی ہے، چنانچہ آپ کا درسِ بخاری نہایت مبسوط اور مفصل ہوتا ہے، جس میں حدیث کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہوتی ہے، فقہاء کے مذاہب کو بیان کرنے کے بعد احناف کے فقہی مسلک کی تائید و ترجیح کی وضاحت میں ایسے پُر زور دلائل پیش فرماتے ہیں جس کے بعد سامع کے ذہن میں کوئی ادنیٰ خلجان باقی نہیں رہتا، اثنائے درس میں صحیح بخاری کی مختلف شروح کے ساتھ ساتھ اپنے اساتذہ کے علوم و معارف بھی جا بجا پیش فرماتے رہتے ہیں، درسِ حدیث میں آپ کی تقریر مبسوط و مفصل ہونے کے علاوہ سہل اور دل نشین بھی ہوتی ہے، اس لئے کم استعداد کے طلباء کو استفادے

---

[1] ایضاح البخاری جلد اول ص ۷-۱۲

کا پورا پورا موقع مل جاتا ہے۔ اندازِ بیان نہایت پاکیزہ اور شستہ ہوتا ہے، جس میں آپ کے جمالِ ظاہری کی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں، اس بنا، پر آپ کے درسِ بخاری کو شہرت تام اور قبولِ عام حاصل ہے، چنانچہ سنہ ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء میں پونے تین سو کے قریب طلبا، آپ کے درسِ حدیث میں شریک تھے اور کم و بیش ہر سال یہی تعداد دورۂ حدیث کے طلبا، کی رہتی ہے۔

سنہ ۱۳۷۷ھ ۱۹۵۷ء میں حضرت مولانا مدنیؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے اراکین نے دارالعلوم دیوبند کے لئے آپ کا انتخاب کیا، اس سے پہلے بھی دو مرتبہ حضرت مولانا مدنیؒ کی گرفتاری اور رخصت کے زمانے میں آپ دارالعلوم میں صحیح بخاری کا درس دے چکے تھے۔

تعلیمی مشاغل کے علاوہ ملکی سیاسیات سے بھی آپ کو تعلق رہا ہے اور اس کے نتیجے میں قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑی ہیں، حضرت مولانا مدنیؒ کی جمعیۃ علمائے ہند کی صدارت کے زمانے میں دو مرتبہ نائب صدر رہے، اور اب مدت سے جمعیۃ علماء ہند کی مسندِ صدارت پر فائز ہیں۔

اربابِ اہتمام

حاجی سیّد محمد عابدؒ

حاجی صاحبؒ دیوبند کے نہایت متّقی پرہیزگار اور صاحب اثر بزرگ تھے تعویذات اور عملیات کے فن میں دُور دُور تک شہرت تھی، بناءِ دارالعلوم کے شریک کار تھے، دارالعلوم کا منصبِ اہتمام اولاً آپ ہی کے سپرد ہوا تھا، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مثنوی زیرِ بحث میں فرماتے ہیں ؎

عاملِ کامل، ولی، مردِ خدا — پائے او در پائے فخرِ انبیاء
ہم جمالی، ہم جلالی، شانِ او — کانِ حلم و مخزنِ خلقِ نکو
نقش و تعویذش مثالِ نقشِ قدر — فیضِ او بر خاص و عامی مثلِ مدر

حاجی صاحبؒ کا سالِ ولادت سنہ ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء ہے، قرآن شریف اور فارسی پڑھ کر علومِ دینیہ کی تعلیم کے لئے دہلی گئے، زمانۂ تعلیم میں تصوف کا شوق دامن گیر ہوا، اور متعدد بزرگوں سے خلعتِ خلافت حاصل کیا، میاں جی کریم بخش رامپوریؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ قدس اللہ سرہٗ سے بھی شرفِ خلافت حاصل تھا

مثنوی زیرِ بحث بحوالہ القاسم دارالعلوم بمنربابت ماہ محرم سنہ ۱۳۴۷ھ ص ۱۹

حاجی صاحبؒ کے پیر میاں جی کریم بخش رامپوری نے خواب دیکھا کہ آسمان پر ایک بہت بڑا ستارہ ہے، اس کے گرد اور بہت سے ستارے ہیں، بڑا ستارہ ان کی گود میں آگیا ہے، میاں جیؒ نے صبح کو مریدین سے فرمایا کہ مجھ سے کوئی سید بیعت ہوگا، متبع سنّت ہوگا، اس سے لوگوں کو بڑا فیض پہنچے گا، اور وہ بہت سے دینی کام انجام دے گا۔[1]

۶۰ برس تک چھتہ کی مسجد میں قیام رہا، مشہور ہے کہ ۳۰ سال تک آپ کی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی، نمازِ تہجّد کا ایسا التزام تھا کہ ۶۰ سال تک قضا کی نوبت نہیں آئی، رشد وہدایت اور تذکیر وتزکیۂ قلوب کے علاوہ آپ کو "فن عملیات" میں زبردست ملکہ حاصل تھا، لوگ دُور دُور سے تعویذات وعملیات کے لئے حاضر ہوتے اور دامنِ امید گوہرِ مراد سے بھر کر لوٹتے تھے، مختلف کاموں کی کثرت کے باوجود ضبطِ اوقات کا ایسا التزام تھا اور ہر کام ٹھیک اپنے وقت پر انجام پاتا تھا۔

آخر شب میں بیدار ہوتے، نماز تہجد اور اوراد وظائف سے فارغ ہوکر فجر کی نماز چھتے کی مسجد میں ادا فرماتے، نماز کے بعد تلاوت فرماکر حجرے سے باہر تشریف لاتے، بیعت کے خواہش مندوں

---

[1] تذکرۃ العابدین ص ۶۲ و ۶۳ مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی سنہ ۱۳۳۳ھ

کو بیعت کرنے، تعویذات کے طالبین کو تعویذ دیتے، دوپہر تک یہ سلسلہ جاری رہتا، بعد ظہر متوسلینِ طریقت حاضر ہوتے، اس وقت ذکر و شغل ہوتا، اور عصر تک جاری رہتا، بعد مغرب ختم خواجگان کا معمول تھا، عشاء کے بعد اول وقت سو جاتے تھے۔

تعویذات کے ضرورت مند بعض اوقات حد سے زیادہ پریشان کرتے، مگر اخلاق و تواضع کا یہ عالم تھا کہ کبھی ترش رُو ہوتے نہیں دیکھا گیا، اتباعِ سنت کا غایت اہتمام تھا۔

ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ مریدین میں حاجی محمد انور دیوبندی رحؒ نے نفس کشی کے طور پر کھانا پینا قطعاً ترک کر دیا ہے، آپ نے بتاکید ان کو لکھا کہ "یہ امر سنت کے خلاف ہے، بطریق مسنون کھانا پینا ضرور چاہیئے۔ خواہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔" [1]

انوار قاسمی میں سوانح مخطوطہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "حاجی صاحبؒ دیوبند میں ایک ذی وجاہت، صاحب اثر، عابد زاہد ہستی تھے، آپ کی بزرگی کا سکہ دیوبند کے ہر خورد و کلاں مرد و عورت، بچے اور بوڑھے کے دل پر تھا، ان کے روحانی فیض نے دیوبند اور اطراف و جوانب بلکہ دوسرے صوبوں کے لوگوں کے دلوں کو بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسخر کر رکھا تھا، عابد و زاہد ہونے کے ساتھ

---

[1] تذکرۃ العابدین ص ۶۷

بہت بڑے عامل بھی تھے، آپ کے تعویذوں کا روحانی فیض بیماروں پر تریاق کا کام کرتا تھا، آپ کی صورت کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا۔ پابندیٔ وضع، استقلالِ طبع، اولوالعزمی، خوش تدبیری آپ کی مشہور ہے، باوجودیکہ دنیا کو ترک کر دیا ہے، مگر کوئی آپ سے مشورہ لیتا ہے تو اس میں ایسی اچھی رائے ہوتی ہے جیسے بڑے کسی ہوشیار دنیا دار کی۔[1]

سوانح قاسمی میں سوانح مخطوطہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اہلِ دیوبند کو آپ سے کمال درجے عقیدت ہے، آپ کی ذات فیض آیات سے خلائق کو بہت طرح کا نفع حاصل ہے۔

غیر مذہب والے بھی آپ کے تعویذوں کے معتقد ہیں، گھر باہر، زمین، باغ جس قدر آپ کی ملک میں تھا سب کا سب راہِ خدا میں دے کر محض خدا پر تکیہ کیا ہوا ہے۔"[2]

اوقات و معمولات کے ضبط و نظم کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ فرمایا کرتے تھے کہ جاننے والا ہر وقت یہ بتا سکتا ہے کہ اس وقت حاجی صاحب فلاں کام میں مشغول ہوں گے، اگر کوئی جا کر دیکھے تو اسی کام میں ان کو مشغول

---

[1] انوار قاسمی جلد اول ص ۳۵۰ و ۳۵۱ مطبوعہ لاہور

[2] سوانح قاسمی جلد دوم ص ۲۳۹ و ۲۴۱ مطبوعہ نیشنل پریس دیوبند

ئے گا"[1]

اشرف السوانح میں حضرت تھانویؒ کا ایک ملفوظ نقل کیا گیا
ہے، لکھا ہے کہ میں حاجی صاحبؒ کو بزرگ تو سمجھتا تھا، مگر یہ خیال
تھا کہ وہ شیخ اور مربی بھی ہیں، لیکن اپنے ایک باطنی اشکال کے
دوران ان کے جواب شافی سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ کامل درجے
کے شیخ اور مربی تھے[2]

دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کی رکنیت کے علاوہ تین مرتبہ
اہتمام آپ کے سپرد ہوا، پہلی مرتبہ یوم تاسیس سے ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء تک
دوسری مرتبہ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء سے ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء تک اور تیسری مرتبہ سنہ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء
سے، مجموعی طور پر یہ مدت ۱۰ سال ہوتی ہے۔

جامع مسجد دیوبند کی تعمیر بھی آپ ہی کی جد وجہد اور سعی وکوشش
کا نتیجہ ہے، آخر میں کثرت مصروفیت کے باعث آپ اہتمام سے
مستعفی ہو گئے تھے، اُن کے اثر وجاہت سے دارالعلوم کو کافی
امداد حاصل ہوئے اور اس کا ہر قدم ترقی کی جانب گامزن رہا۔

پنجشنبہ، ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء کو ۸۱ سال کی عمر میں
وفات پائی "مدار المہام بہشتِ بریں" مادہ سنِ وفات ہے۔

---

[1] اشرف السوانح جلد اول ص ۱۴۹

[2] " " " ص ۱۵۰ ر ۲۴۸

تذکرۃ العابدین میں آپ کے تفصیلی حالات مذکور ہیں۔

مولانا رفیع الدینؒ

مولانا موصوف ۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے حضرت شاہ عبدالغنی دہلویؒ کے مشہور خلفاء میں تھے، گو علمی حیثیت بہت معمولی تھی، لیکن انتظامی امور کا زبردست ملکہ حاصل تھا اور اس بارے میں عجیب و غریب صفات کے مالک تھے، اُن کا شمار اپنے زمانے کے اولیائے کاملین میں تھا، دو مرتبہ دارالعلوم کے مہتمم مقرر ہوئے، پہلی مرتبہ ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء و ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں حاجی صاحبؒ کے سفرِ حج کے زمانے میں اہتمام کی خدمات انجام دیں، پھر تقریباً ۳ سال کے بعد ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء میں مستقل مہتمم قرار پائے اور ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۸ء کے اوائل تک اس منصب پر فائز رہے، آپ کے زمانے میں دارالعلوم نے بڑی ترقی کی، جس کو بڑی حد تک آپ کے حسنِ انتظام کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے، سُنا ہے کہ دیانت و امانت کے ساتھ انتظامی سلیقہ کا بہت کم اجتماع ہوتا ہے مگر ان میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ کل مدتِ اہتمام تقریباً ۱۹ سال ہے۔

دارالعلوم کی اکثر ابتدائی عمارتیں آپ ہی کے زمانۂ اہتمام میں تعمیر ہوئیں، ان کے تعمیری ذوق کا اندازہ اُس زمانے کی عمارتوں بالخصوص نودرے وغیرہ کی پختگی، استواری اور حسنِ تعمیر سے کیا جا سکتا ہے، یہ عمارت دارالعلوم کی عمارتوں میں ایک ممتاز شان اپنے اندر لئے ہوئے ہے، ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء میں جب نودرے کی عمارت کی

(جو موجودہ عمارتوں میں سب سے پہلی عمارت ہے) بنیاد کھدوائی گئی تو آپ نے خواب دیکھا" کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجوّزہ مقام پر تشریف رکھتے ہیں اور ان سے خطاب فرما رہے ہیں کہ" یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے" یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے احاطہ وعمارت کا نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ" ان نشانات پر تعمیر کی جائے" مولانا نے صبح کو اٹھ کر دیکھا تو نشانات موجود تھے، چنانچہ ان ہی نشانات پر بنیاد کھدوا کر تعمیر شروع کرائی گئی۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ (وفات ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء) کو مولانا رفیع الدینؒ سے خلافت حاصل تھی۔ ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء میں آپ بقصد ہجرت مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہیں دو سال کے بعد ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

حاجی سید فضل حق دیوبندیؒ

حاجی صاحب دیوبند کے خاندانِ سادات سے تھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے شرفِ بیعت حاصل تھا، یہ شروع سے دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے رکن تھے، حاجی محمد عابدؒ کے زمانۂ اہتمام میں سربراہِ کار کی حیثیت سے کئی سال تک دارالعلوم کی خدمات انجام دیں، ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں حاجی محمد عابدؒ صاحبؒ کے مستعفی ہو جانے پر مہتمم مقرر ہوئے، اور تقریباً ایک سال تک اس خدمت کو انجام دے کر مستعفی ہو گئے۔

حاجی فضل حق صاحب نے حضرت نانوتویؒ کی ایک سوانح حیات لکھی تھی جو ہنوز طبع نہیں ہوئی، سوانح قاسمی مؤلفہ مولانا مناظر احسن گیلانی میں سوانح مخطوطہ کے نام سے جا بجا اس کے اقتباسات دیئے گئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہایت جامع اور مکمل سوانح حیات ہوگی، تحریری صلاحیتوں کے ساتھ ان میں انتظامی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی، دارالعلوم کے تعلق سے قبل سہارنپور میں سرکاری محکمۂ تعلیم سے مدت تک وابستہ رہ چکے تھے۔

مولانا محمد منیر نانوتویؒ

مشہور عالم و مصنف مولانا محمد احسن نانوتویؒ اور مولانا محمد مظہرؒ کے چھوٹے بھائی تھے، سنہ ۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۱ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد حافظ لطف علی سے حاصل کی، پھر دہلی کالج میں داخل ہوگئے، وہاں مولانا مملوک علی نانوتویؒ، مفتی صدرالدین آزردہؒ اور شاہ عبدالغنی دہلویؒ سے علمی استفادہ کیا، مولانا محمد منیر جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایک سرگرم کارکن اور مجاہد تھے، شاملی کے معرکے میں دوسرے اکابر کے دوش بدوش شریک رہے اور خوب دادِ شجاعت دی، جنگِ شاملی کے بعد روپوش ہوگئے تھے معافیٔ عام کے بعد اپنے بڑے بھائی مولانا محمد احسن کے پاس بریلی پہنچے اور سنہ ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں بریلی کالج میں ملازم ہوگئے، پنشن ملنے تک

بریلی میں قیام رہا، قیام بریلی کے زمانے میں اپنے بھائی مولانا محمد احسن کے مطبع صدیقی بریلی کے مہتمم بھی رہے، مولانا محمد منیر نقشبندیہ سلسلے میں بیعت تھے، انھوں نے امام غزالیؒ کی کتاب منہاج العابدین کا اردو ترجمہ سراج السالکین کے نام سے کیا ہے جو مطبع صدیقی بریلی میں ۱۲۸۱ھ ۱۸۶۴ء میں طبع ہوا ہے، ان کی ایک دوسری تصنیف فوائد غریبہ ہے جو تصوف کے مسائل پر مشتمل ہے۔

ایک سال سے کچھ زائد مدّت تک مہتمم رہے، دار العلوم میں خارج اوقات میں طلباء کو عربی ادب کی کتابیں پڑھاتے تھے۔

دیانت و امانت میں مولانا محمد منیر کا بڑا پایہ تھا، ارواحِ ثلاثہ میں ان کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے کہ مولانا دار العلوم کی سالانہ روداد چھپوانے کے لئے ڈھائی سو روپے لے کر دہلی گئے، اتفاق سے وہاں روپے چوری ہو گئے، مولانا محمد منیر اس حادثے کی کسی کو اطلاع کئے بغیر اپنے وطن نانوتہ آئے، اپنی زمین فروخت کر کے روپیہ فراہم کیا اور اس سے روداد چھپوا کر لائے، مجلسِ شوریٰ کے ارکان کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے اس کے متعلق مسئلہ دریافت کیا، وہاں سے جواب آیا کہ مہتمم صاحب امین تھے اور روپیہ چونکہ بلا تعدّی کے ضائع ہوا اس لئے ان پر تاوان نہیں آسکتا، ارکانِ مجلس نے حضرت گنگوہیؒ کا فتویٰ دکھا کر مولانا محمد منیرؒ سے درخواست کی کہ اپنا روپیہ واپس لے لیں

مولانا نے فرمایا کہ فتویٰ کی بات نہیں ہے، اگر خود مولانا رشید احمد صاحب کو ایسا واقعہ پیش آتا تو کیا وہ بھی روپیہ لے لیتے، چنانچہ اصرار کے باوجود روپیہ لینے سے انکار کر دیا [۱]

مولانا حافظ محمد احمدؒ

حافظ صاحبؒ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے فرزند رشید تھے ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے، قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد والد ماجد نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گلاوٹھی (ضلع بلند شہر) بھیج دیا، گلاوٹھی میں حضرت نانوتویؒ کا قائم کیا ہوا مدرسہ منبع العلوم تھا، مولانا عبداللہ انبیٹھوی اس مدرسہ میں مدرس تھے، بعد ازاں مزید تعلیم کے لئے مراد آباد کے مدرسۂ شاہی میں بھیجے گئے، یہاں حضرت نانوتویؒ کے شاگرد رشید مولانا احمد حسن امروہی پڑھاتے تھے، ان سے مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھنے کے بعد دیوبند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے ترمذی شریف کے چند سبق پڑھے، دورۂ حدیث گنگوہ پہنچ کر حضرت گنگوہیؒ کے حلقۂ درس میں پورا کیا اور وہیں جلالین اور بیضاوی پڑھی، ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء میں بحیثیت مدرس دار العلوم میں تقرر ہوا اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھانے کی نوبت آئی ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء میں

---

[۱] ارواح ثلاثہ حکایت ۴۵۳ و مولانا محمد احسن نانوتوی ۱۵۷ — ۱۶۰

جب حضرت حاجی محمد عابدؒ اہتمام سے مستعفی ہوئے تو یکے بعد دیگرے دو مہتمم مقرر ہوئے مگر ایک ایک سال سے زیادہ اہتمام نہ کر سکے ہر سال کے تغیرات کی وجہ سے دار العلوم کے نظام میں اختلال پیدا ہونے لگا، تو ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں حضرت گنگوہیؒ نے اہتمام کے لئے حافظ صاحبؒ کا انتخاب فرمایا، حافظ صاحب نہایت منتظم اور صاحب اثر و وجاہت تھے، چنانچہ وہ بہت جلد دار العلوم کے انتظام پر قابو یافتہ ہو گئے، اور تقرر کے وقت آپ سے جو توقعات قائم کی گئی تھیں بدرجۂ اتم ان کے اہل ثابت ہوئے، حضرت شیخ الہندؒ جو صدر المدرسین تھے خود استاد ہونے کے باوجود حافظ صاحبؒ کے استاذ زادہ ہونے کی حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

حافظ صاحبؒ کے زمانۂ اہتمام میں دار العلوم نے بڑی ترقی کی، جب انھوں نے عنانِ ادارت اپنے ہاتھ میں لی تھی تو دار العلوم کی آمدنی کا اوسط ۵-۶ ہزار روپے سالانہ تھا، آپ کے عہد میں یہ اوسط ۹۰ ہزار تک ترقی کر گیا، اسی طرح طلبار کا اوسط دو ڈھائی سو سے ترقی کر کے تقریباً نو سو تک پہنچ گیا، اس وقت کتب خانے میں ۵ ہزار کتابیں تھیں، آپ کے زمانے میں کتابوں کی تعداد ۴۰ ہزار تک پہنچ گئی، ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء تک عمارات دار العلوم کی مالیت ۳۶ ہزار روپے تھی، آپ کے عہد میں یہ مالیت ۴ لاکھ تک پہنچ گئی تھی،

غرض کہ آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم نے معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں سے نہایت عظیم الشان ترقی کی جو اس سے پہلے اس کو حاصل نہ ہو سکی تھی، ہر چند دارالعلوم معنوی حیثیت سے "دارالعلوم" بن چکا تھا مگر اپنی عمارتوں اور ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے آپ ہی کے زمانۂ اہتمام میں مدرسے سے دارالعلوم بنا، شعبہ جات اور دفاتر کی تشکیل عمل میں آئی، حلقۂ اثر میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا، غرض کہ ہر حیثیت سے دارالعلوم کا قدم روز افزوں ترقی کی جانب گامزن رہا، چنانچہ آپ کا دورِ اہتمام دارالعلوم کی تاریخ میں اس کی ترقیوں کا نہایت تابناک اور زرّین دور سمجھا جاتا ہے۔

دارالحدیث کی عظیم الشان عمارت جو اپنی نوعیت کی ہندوستان بھر میں پہلی عمارت ہے آپ ہی کے عہد میں تیار ہوئی، جدید دارالاقامہ کا آغاز اور مسجد و کتب خانہ کی تعمیر بھی حافظ صاحبؒ کے زمانے کی یادگاریں ہیں، ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء کے اس عظیم الشان حلقۂ دستار بندی کی یاد اب تک لوگوں کے قلوب میں تازہ ہے، جس میں ایک ہزار سے زائد فضلاء کی دستار بندی ہوئی تھی۔

دارالعلوم کی ترقی کے سلسلے میں حافظ صاحبؒ نے ملک کے مختلف شہروں کے سفر کر کے دارالعلوم کے لئے بہت سے دوامی چندے مقرر کرائے، خصوصاً سابق ریاست بھوپال، بھاول پور اور حیدرآباد کے سفر، دارالعلوم کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے، حیدرآباد سے

دارالعلوم کی امداد سو روپے ماہانہ مقرر تھی، حافظ صاحبؒ حیدرآباد تشریف لے گئے اور اپنے اثرات سے ڈھائی سو مقرر کرائے، دوسرے سفر میں پانچ سو اور تیسرے میں ایک ہزار ماہانہ تک نوبت پہنچ گئی جو سقوطِ حیدرآباد تک جاری رہی۔

برطانوی گورنمنٹ کی جانب سے آپ کو "شمس العلماء" کا خطاب دیا گیا تھا، مگر آپ نے دارالعلوم کے حریت پسندانہ مسلک کی بنا پر حکومت کا خطاب یافتہ ہونا پسند نہیں کیا، چنانچہ خطاب واپس کر دیا، یہ بھی آپ ہی کے زمانے کی خصوصیت ہے کہ دو مرتبہ صوبہ متحدّہ کے گورنر دارالعلوم میں آئے، دارالحدیث کی مجوزہ جگہ پر شہر کے پانی کا گندہ نالہ بہتا تھا، اس کے سبب سے دارالحدیث کی تعمیر میں رکاوٹ پڑی ہوئی تھی، نیز گندے نالے کے قرب کے باعث دارالعلوم کی آب وہوا بھی خراب رہتی تھی، اکابر دارالعلوم کی پیہم کوششوں کے باوجود مقامی حکام نالے کے ہٹائے جانے پر آمادہ نہ تھے، حضرت حافظ صاحبؒ نے گورنر کو دعوت دے کر اس مشکل کا حل نکال لیا، چنانچہ صوبائی گورنمنٹ کے حکم سے سرکاری مصارف پر گندہ نالہ ہٹا دیا گیا، حافظ صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ دارالعلوم کی مشکل سے مشکل مہم کو بھی آسانی سے سلجھا دیتے تھے۔

طلباء کی چھوٹی، چھوٹی جزئیات پر جہاں ہر وقت نظر رہتی تھی

اور ان پر روک ٹوک اور ڈانٹ ڈپٹ رکھتے، وہیں ان پر بے حد شفیق اور مہربان بھی تھے، طلبا، کی معمولی معمولی ضرورتوں پر مربیانہ نظر رہتی تھی، بیمار طلبا، کے علاج پر خاص توجہ فرماتے تھے، طلبا اور مدرسین پر حافظ صاحبؒ کا رعب و داب ضرب المثل تھا، دسترخوان نہایت وسیع تھا، دارالعلوم کے مہمانوں کا بار بذاتِ خود نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ برداشت کرتے تھے۔

شروع سے درس و تدریس کا جو مشغلہ قائم ہوگیا تھا وہ زمانہ اہتمام میں کبھی کبھی بند نہیں ہوا، مشکوٰۃ المصابیح، جلالین شریف صحیح مسلم، ابن ماجہ، مختصر المعانی، رسالہ میرزاہد وغیرہ کتابیں نہایت شوق سے پڑھاتے تھے، تقریر نہایت صاف و مربوط اور سلجھی ہوئی ہوتی تھی، اپنے والد ماجد کے خاص علوم اور مضامین پر کافی عبور تھا۔

نظامِ دکن نے حافظ صاحبؒ کو ریاستِ حیدرآباد میں مفتیٔ اعظم کے عہدے پر مقرر فرمایا تھا، حکومتِ آصفیہ کے اس سب سے بڑے دینی منصب پر آپ ۱۳۴۱ھ سے ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء) تک فائز رہے، حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں آپ نے نظام حیدرآباد کو دارالعلوم میں آنے کی دعوت دی تھی جو منظور کرلی گئی تھی، پروگرام یہ تھا کہ نظام جب دہلی جائیں گے تو دارالعلوم کو بھی ضرور دیکھیں گے، ۱۳۴۷ھ (۱۹۲۸ء) میں نظام کے دہلی آنے کی توقع تھی، وعدے کی یاددہانی کے لئے آپ حیدرآباد

تشریف لے گئے، جس وقت آپ حیدرآباد کا قصد فرمارہے تھے تو طبیعت ناساز تھی، ضعفِ پیری اور مسلسل علالت نے بہت کمزور کردیا تھا مگر دارالعلوم کے مفاد کے لئے اپنی صحت کی پروا نہ کرتے ہوئے حیدرآباد روانہ ہوگئے، وہاں پہنچ کر طبیعت زیادہ خراب ہوگئی، پہلے تو انتظار رہا کہ طبیعت سنبھلے تو نظام سے ملاقات کی جائے مگر جب مرض دن بدن بڑھتا ہوا معلوم ہوا تو متوسلین اور رفقاء سفر کی رائے قرار پائی کہ دیوبند واپس لے جایا جائے، چنانچہ واپسی کے قصد سے آپ حیدرآباد سے روانہ ہوگئے مگر ابھی ٹرین حیدرآباد کی حدود میں ہی تھی کہ نظام آباد اسٹیشن پر حافظ صاحب جان، جانِ آفریں کے سپرد کرکے من مات فی السفر فھو شھید میں داخل ہوگئے، یہ ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے، وفات سے قبل زبان پر ذکر اللہ جاری تھا ۲۹ کے عدد پر عقدِ انامل تھا کہ اللہ کے لفظ کے ساتھ روح پرواز کرگئی۔

نظام آباد اسٹیشن پر نعش اتار کر جنازہ تیار کیا گیا، متعلقین اور نظامِ دکن کو تار کے ذریعے اطلاع دی گئی، نظام کا جواب آیا کہ حافظ صاحب کا جنازہ حیدرآباد لایا جائے، نظام آباد اور حیدرآباد میں متعدد مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی، اگلے دن ۴ جمادی الاولیٰ کو سرکاری مصارف پر ایک مخصوص قبرستان میں

جو "خطۂ صالحین" کے نام سے موسوم ہے ان کو سپردِ خاک کیا گیا
نظامِ دکن نے تعزیت کرتے ہوئے نہایت تاسف کے ساتھ
یہ پُراثر جملہ فرمایا :-

"افسوس وہ مجھے لینے آئے تھے مگر خود یہیں رہ گئے"۔

حافظ صاحبؒ نے اسلام اور مسلمانوں کی دارالعلوم کے ذریعے جو گراں قدر خدمات انجام دیں اُن کے پیشِ نظر اُن کی وفات کو دارالعلوم اور مسلمانوں کا زبردست نقصان تصور کیا گیا اور ہندوستان کے طول وعرض میں دیوبندی اور غیر دیوبندی جماعتوں میں بے شمار تعزیتی جلسے اور ایصالِ ثواب کے اجتماعات کیے گئے۔

حافظ صاحبؒ نے ۴۵ سال دارالعلوم کی خدمات انجام دیں، ابتدائی ۱۰ سال تعلیم وتدریس میں گزرے اور ۳۵ سال اہتمام کے فرائض انجام دیئے۔

مولانا حبیب الرحمٰنؒ

آپ حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ کے خلفِ رشید تھے، شروع سے آخر تک دارالعلوم میں علوم کی تکمیل کی، آپ ایک متبحر عالم اور عربی زبان کے زبردست ادیب تھے، ان کا تدبر اور انتظام دارالعلوم کی تاریخ میں ضرب المثل سمجھا جاتا ہے، دارالعلوم کی ترقی میں ان کی خدمات اور خداداد صفات کو بڑا دخل حاصل ہے۔

سنہ ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی مصروفیتوں

کے باعث نیز دارالعلوم کو ترقی دینے کے سلسلے میں ایک ایسے لائق اور منتظم شخص کی ضرورت پیش آئی جو انتظامی امور اور ترقی کی تجاویز میں حافظ صاحب کا ہاتھ بٹا سکے، اس کے لئے آپ سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا، چنانچہ انکار کے باوجود آپ کو مجبور کر کے نیابتِ اہتمام کا منصب سپرد کر دیا گیا، کہا جاتا ہے کہ دارالعلوم کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس کو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ جیسا کام کرنے والا بیدار مغز منتظم اور مخلص ہاتھ آگیا، اہتمام کے کاموں میں ان کو اس قدر شغف تھا کہ شب و روز کا بیشتر حصہ اسی میں صرف ہوتا تھا، انھوں نے دارالعلوم کے شعبہ انتظام و انصرام کو اتنا منظم اور مستحکم کر دیا تھا کہ جب حکومتِ آصفیہ کی جانب سے نواب صدر یار جنگ بہادر دارالعلوم کے حسابات کی تنقیح کے لئے دیوبند آئے تو ان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک ایک اور دو، دو آنے تک کے حسابات کے کاغذات اور رسیدیں باضابطہ طور پر فائل میں موجود تھیں، نواب صدر یار جنگ بہادر کا بیان ہے کہ کوئی کاغذ ایسا نہ تھا جو مانگا گیا ہو اور فوراً پیش نہ کر دیا گیا ہو، حافظ صاحب کے عہدِ اہتمام کی ترقی درحقیقت آپ ہی کی رفاقت کا نتیجہ سمجھی جاتی ہے آپ ہمیشہ ان کے دستِ راست، معتمد علیہ اور نائب رہے

۱۳۴۴ھ میں جب حافظ صاحبؒ اپنی پیرانہ سالی کے باعث ۱۹۲۵ء حیدرآباد کے مفتیٔ اعظم کے منصب سے سبک دوش ہوئے تو ان کی جگہ پر آپ کا تقرر عمل میں آیا، لیکن دارالعلوم میں داخلی اختلافات

رونما ہو جانے کے سبب سے آپ کو بہت جلد اس منصب سے دست کش ہو جانا پڑا، حضرت شاہ صاحبؒ، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور دوسرے چند اساتذہ اور طلباء کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ دار العلوم سے علیحدہ ہو گئے تھے، دار العلوم کے لئے یہ بڑا نازک موقع تھا مگر آپ کے عزم و استقلال، ہمت و جرأت اور دانش و تدبر نے دار العلوم کی کشتی کو ڈگمگانے سے بچا لیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن، جن کی شخصیت ہر حیثیت سے یگانۂ روزگار تسلیم کی جاتی تھی، عام خیال ہے کہ اگر آپ کو ملکی سیاست میں بھی اتنا ہی شغف ہوتا جیسا کہ دار العلوم کے ساتھ تھا تو آپ ہندوستان کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر ثابت ہوتے، حضرت شیخ الہندؒ کی وصیت تھی کہ ارکانِ جمعیۃ العلماء کو دو آدمیوں کو کبھی نہیں چھوڑنا چاہیئے، ان میں پہلا نام آپ ہی کا تھا، چنانچہ آپ جمعیۃ العلماء کے ہمیشہ بہترین مشیر ثابت ہوئے، سنہ ۱۳۴۰ھ ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ العلماء کا جو اجلاس گیا (صوبہ بہار) میں ہوا تھا اس میں آپ کو صدر منتخب کیا گیا، آپ کا خطبۂ صدارت نہ صرف عام طور پر پسند کیا گیا بلکہ اس کی سیاسی اہمیت کو ملک کے سیاسی حلقوں میں بھی پسندیدگی سے دیکھا گیا۔

مطالعے کی کثرت نے آپ کو نہایت وسیع المعلومات بنا دیا تھا، حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے:۔

"اگر مجھ پر کسی کے علم کا اثر پڑتا ہے تو وہ مولانا حبیب الرحمٰن ہیں"

عربی ادب اور تاریخ سے خاص ذوق تھا اور ان علوم میں ان کی وسیع النظری مشہورِ زمانہ تھی، مندرجہ ذیل تصانیف علمی یادگار ہیں:-

(۱) "قصیدہ لامیۃ المعجزات" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں تقریباً تین سو اشعار پر مشتمل ہے، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سو معجزے نہایت فصیح و بلیغ انداز میں پیش کئے گئے ہیں، مولانا محمد اعزاز علی صاحب امروہی (وفات ۱۳۷۴ھ / ۱۹۵۵ء) نے عربی اشعار کی سلیس اردو میں شرح فرما دی ہے۔

(۲) "اشاعتِ اسلام" دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا؟ اس سوال کے جواب میں تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ان تاریخی واقعات کو پیش کیا گیا ہے جو اپنی نفسیاتی کشش کے اعتبار سے اشاعتِ اسلام کا باعث ہوئے۔

(۳) "تعلیماتِ اسلام"۔ اس کتاب میں اسلام کے طرزِ حکومت کو بیان کیا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ مشورہ امیرِ جماعت کے لئے کس قدر ضروری ہے، اس ضمن میں آپ نے تبلایا ہے کہ امیر کی ذات پر اگر کلی اعتماد ہو تو اکثریت و اقلیت کی رائے شماری کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر امیر پر یہ اعتماد حاصل نہ ہو تو پھر کام چلانے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اکثریت کا اعتبار کیا جائے۔

(۴) "رحمۃ للعالمین"۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک نہایت گراں قدر تصنیف ہے، افسوس ہے کہ یہ ناتمام ہے، مگر جس قدر حصہ

لکھا جا چکا ہے وہ سیرتِ نبوی ﷺ کی تصانیف کی فہرست میں ایک عظیم الشان تصنیف کا اضافہ کرتا ہے، یہ کتاب ابھی تک طبع ہو کر منظرِ عام پر نہیں آسکی۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نہایت نحیف الجثہ تھے، خوراک حیرت انگیز طور پر کم تھی، مگر ضعف اور کمزوری کے باوجود بے پناہ ہمت کے مالک تھے، حضرت حافظ صاحبؒ کے انتقال کے ٹھیک چودہ ماہ کے بعد چار رجب ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء کی شب میں اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائی اور ہمیشہ کے لئے دارالعلوم کو اپنا مدّاح چھوڑ گئے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ!

مولانا قاری محمد طیّب صاحب

حضرت نانوتویؒ کے پوتے ہیں، ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے تاریخی نام مظفر الدین ہے، ۷ سال کی عمر میں دارالعلوم میں داخل کیا گیا دو سال کی قلیل ترین مدت میں قرآن مجید قرأت و تجوید کے ساتھ حفظ کیا، پانچ سال فارسی اور ریاضی کے درجات میں تعلیم حاصل کر کے عربی کا نصاب شروع کیا، جس سے ۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۸ء میں فراغت اور سندِ فضیلت حاصل کی، دورانِ تعلیم میں آپ کی آبائی نسبت کے سبب سے اساتذہ نے اعلیٰ پیمانے اور مخصوص طریق پر تعلیم و تربیت میں حصّہ لیا حدیث کی خصوصی سند آپ کو وقت کے مشاہیر علماء و اساتذہ سے حاصل ہوئی، علامۃ العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ علمِ حدیث میں آپ کے خاص استاذ ہیں، ۱۳۵۰ھ میں حضرت تھانویؒ سے خلافت

حاصل ہوئی۔

تکمیل کے بعد آپ نے دارالعلوم میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، ذاتی علم وفضل، ذہانت وذکاوت اور آبائی نسبت و وجاہت کے باعث بہت جلد طلبا میں آپ کے ساتھ گرویدگی پیدا ہوگئی، اوائل ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں نائب مہتمم کے منصب پر آپ کا تقرر کیا گیا، جس پر اوائل ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء تک آپ اپنے والد ماجد اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی زیر نگرانی ادارہ اہتمام کے انتظامی معاملات میں حصہ لیتے رہے، وسط ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے انتقال کے بعد آپ کو مہتمم بنا دیا گیا، سابقہ تجربہ اہلیتِ کار اور آبائی نسبت کے پیش نظر یہ ثابت ہو چکا تھا کہ آپ کی ذات میں اہتمام دارالعلوم کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے، چنانچہ مہتمم ہونے کے بعد آپ کو اپنے علم وفضل اور خاندانی وجاہت واثر کی بنا پر ملک میں بہت جلد مقبولیت اور عظمت حاصل ہوگئی، جس سے دارالعلوم کی عظمت وشہرت کو کافی فوائد حاصل ہوئے، چنانچہ دارالعلوم نے آپ کے زمانۂ اہتمام میں نمایاں ترقی حاصل کی ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء میں جب آپ نے انتظام دارالعلوم کی باگ ڈور ہاتھ میں لی تو اس کے انتظامی شعبے آٹھ تھے، جن کی تعداد اب ۲۴ تک پہنچ چکی ہے، اُس وقت دارالعلوم کی سالانہ آمدنی کا بجٹ ۵۰,۲۶۲ روپے سالانہ تھا، آپ کے زمانے میں ۱۳ لاکھ تک پہنچ گیا، ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء میں ملازمین دارالعلوم کے عملے میں ۴۵ افراد

تھے، اور اب ان کی تعداد پونے دو سو تک پہنچ چکی ہے، اُس وقت اساتذہ کی تعداد ۱۸ تھی اور اب ۳۴ ہے، طلباء کی تعداد ۸۴۰ تھی اور اب ڈیڑھ ہزار سے زائد ہے۔ اسی طرح عمارتوں میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے، دارالتفسیر، دارالافتاء، دارالقرآن، مطبخ جدید، فوقانی دارالحدیث، بالائی مسجد، باب الظاہر، جامعۂ طبیہ، جدید دو منزلہ دارُالاقامہ، مہمان خانہ، کتب خانہ کا جدید ہال وغیرہ جیسی عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر و تکمیل ممدوح ہی کے دورِ اہتمام کی یادگاریں ہیں، غرض کہ دارالعلوم کے ہر شعبے نے آپ کے دورِ اہتمام میں نمایاں ترقی کی ہے، دارالعلوم کی مجالسِ انتظامیہ و شوریٰ نے مختلف اوقات میں آپ کی غیر معمولی خدمات کے اعتراف اور اظہارِ قدردانی کے سلسلے میں متعدد مرتبہ تحاویز پاس کی ہیں

علمی سلسلے میں درس و تدریس کے علاوہ فنِ خطابت و تقریر میں آپ کو خداداد ملکہ اور قوتِ گویائی حاصل ہے اور زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کی تقریریں پبلک جلسوں میں شوق کے ساتھ سُنی جاتی ہیں، اہم سے اہم مسائل پر دو، دو، تین، تین گھنٹے مسلسل تقریر کرنے میں آپ کو کوئی رکاوٹ اور تکلّف نہیں ہوتا، حقائق اور اسرارِ شریعت کے بیان اور ایجازِ مضامین میں آپ کو خاص قدرت حاصل ہے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ آپ کے علمی اور حکیمانہ اسلوبِ بیان سے خاص طور پر محظوظ ہوتا ہے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دوسری یونیورسٹیوں میں آپ کی تقریریں خاص طور پر مقبول ہیں، اور بعض معرکۃ الآراء تقریریں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے

شائع ہو چکی ہیں ، ملک کا کوئی خطہ ایسا نہیں جس میں آپ کی تقریروں کی گونج نہ پہنچی ہو۔

جمیعۃ علماء کے سالانہ اجلاسوں میں آپ کے خطباتِ صدارت بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے ہیں، آپ کی علمی تقریروں سے ایک خاص حلقۂ اثر پیدا ہو گیا ہے، بیرونِ ہند میں بھی آپ کی خطابت کے اثرات وہاں کے علمی حلقوں میں پہنچ چکے ہیں، ۱۳۵۳ھ ۱۹۳۴ء میں سلسلۂ سفرِ حجاز آپ نے ہندوستان کے ایک مؤقر وفد کے صدر کی حیثیت سے سلطان ابن سعود کے دربار میں جو تقریر فرمائی اس نے سلطان کو بہت متاثر کیا، سلطان ابن سعود نے شاہی خلعت اور بیش قیمت کتب کے عطیے سے اعزاز بخشا۔

۱۳۵۸ھ ۱۹۳۹ء میں آپ کا سفرِ افغانستان علمی خدمات کی ایک مستقل تاریخ ہے، آپ نے دارالعلوم کے نمائندے کی حیثیت سے دارالعلوم اور حکومتِ افغانستان کے درمیان علمی و عرفانی روابط قائم کرنے کے لئے یہ سفر اختیار فرمایا تھا، افغانستان کے علمی حلقوں نے شایانِ شان آپ کا خیر مقدم کیا، حکومت نے اپنی میزبانی کے شرف سے نوازا، افغانستان کی علمی و ادبی ہر سرکاری اور غیر سرکاری انجمنوں اور سوسائیٹیوں نے مدعو کیا آپ کی عالمانہ تقریروں سے وہاں کے علمی اور ادبی حلقے بہت متاثر ہوئے، اسی طرح بیرونی ممالک میں برما، جنوبی افریقہ، زنجبار، کینیا، روڈیشیا، ری یونین مڈغاسکر، حبش (اتھوپیا) مصر، انگلینڈ، فرانس اور جرمنی

ممالک کا دورہ فرما چکے ہیں۔

دارالعلوم کے انتظامی امور کے علاوہ جن چیزوں سے آپ کو طبعی دلچسپی ہے وہ تعلیم و تدریس اور دعوت و تبلیغ ہیں ان کمالات کی وجہ سے ملک میں آپ کو امتیازی مقام حاصل ہے، تفریحی ذوق مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف ہے، آپ کا یہ مشغلہ دارالعلوم کے انتظامی معاملات اور اوقات درس و تدریس کے علاوہ ہمیشہ جاری رہتا ہے، بالخصوص دورانِ سفر کے فارغ اوقات اسی میں صرف ہوتے ہیں، زمانۂ قیام میں مغرب سے عشاء تک مردانے میں مجمع رہتا ہے، جس کا موضوع عموماً علمی مذاکرے ہوتے ہیں، شاعری سے بھی مناسبت ہے، متعدد نظمیں شائع ہو چکی ہیں، مجموعۂ کلام "عرفانِ عارف" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

خطابت و تقریر کی طرح تحریر و تصنیف پر بھی قدرت حاصل ہے آپ کی تصانیف کی تعداد بہت کافی ہے، چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:-

التشبّہ فی الاسلام، مشاہیرِ امّت، کلماتِ طیّبات
الطیب الثمرنی مسئلۃ القضا، والقدر، سائنس اور اسلام
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام، مسئلۂ زبان اور ہندوستان
دین و سیاست، اسبابِ عروج و زوال اقوام،
اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام، الاجتہاد والتقلید، اصول
دعوتِ اسلام، اسلامی مساوات، تفسیر سورۂ فیل، فطری حکومت۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ [1]

حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ کے فرزندِ رشید تھے، ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ء میں بمقام بجنور پیدا ہوئے، ۷ سال کی عمر میں درجۂ قرآن مجید میں داخل ہوئے، دارالعلوم کے اساتذہ سے ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء میں تکمیل کی، حضرت شیخ الہندؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور انھیں سے بیعت تھے، فراغت کے بعد دہلی کے مدرسہ فتح پوری میں صدر مدرس مقرر ہوئے، وہاں سے ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء میں ان کو دارالعلوم میں بلالیا گیا، یہاں عرصے تک درجۂ علیا کی مختلف کتابیں پڑھائیں، مولانا عثمانیؒ کے درسِ صحیح مسلم کو بڑی شہرت حاصل تھی، حضرت نانوتویؒ کے علوم پر ان کی خاص نظر تھی، ایک عرصے تک دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء میں دارالعلوم سے بعض اختلافات کے سبب سے حضرت مولانا محمد انور شاہؒ اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ وغیرہ حضرات کے ساتھ جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) تشریف لے گئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء میں جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے، ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء میں حضرت تھانویؒ اور

---

[1] مولانا عثمانیؒ کا دورِ صدارتِ اہتمام ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء سے شروع ہو کر ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء میں ختم ہو گیا، اس پورے زمانے میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب بدستور مہتمم رہے اور بحمد اللہ آج بھی ممدوح اس منصب پر فائز ہیں۔

بعض دوسرے اکابر کے ارشاد پر دار العلوم میں تشریف لائے اور ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۴ء تک بحیثیت صدر مہتمم دار العلوم کی خدمات انجام دیتے رہے، اس دوران میں جامعہ ڈابھیل سے بھی تعلق قائم رہا۔

علم وفضل، فہم وفراست، تدبر اور اصابت رائے کے لحاظ سے علامہ عثمانیؒ کا شمار ہندوستان کے چند مخصوص علماء میں ہوتا تھا، وہ زبان وقلم دونوں کے یکساں شہ سوار تھے، اردو کے بلند پایہ ادیب اور بڑی سحر انگیز خطابت کے مالک تھے، فصاحت وبلاغت، عام فہم ودلائل پُر اثر تشبیہات، وانداز بیان اور نکتہ آفرینی کے لحاظ سے ان کی تحریر وتقریر دونوں منفرد تھیں، وہ حالاتِ حاضرہ پر بڑی گہری نفسیاتی نظر رکھتے تھے اس لئے ان کی تحریر اور تقریر عوام وخواص دونوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، عظیم الشان جلسوں میں ان کی فصیح وبلیغ عالمانہ تقریروں کی یاد آج بھی اہل ذوق کے دلوں میں موجود ہے، حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی حیات کے آخری دنوں میں جامعہ ملیہ کی تاسیس کے وقت جو خطبہ دیا تھا اُس کے لکھنے اور جلسے میں پڑھنے کا شرف مولانا عثمانیؒ ہی کو حاصل ہوا تھا۔

علم الکلام، المعقول والمنقول، اعجاز القرآن، حجاب شرعی اور الشہاب الثاقب وغیرہ ان کی معرکۃ الآراء تصانیف ہیں، حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن مجید پر مولانا عثمانیؒ کے تفسیری حواشی کو بڑی شہرت حاصل ہے، علم حدیث میں ان کی گراں قدر تصنیف فتح الملہم

حنفی نقطۂ نظر سے صحیح مسلم کی پہلی شرح ہے، ان کا یہ ایک ایسا زندہ جاوید کارنامہ ہے جس نے اُن کے علم و فضل کو تمام عالمِ اسلام میں روشناس کرادیا ہے۔

سیاسیات میں مولانا عثمانیؒ اولاً جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ شریک تھے، اس سے قبل وہ خلافت کمیٹی کے ایک اہم رکن رہ چکے تھے، سنہ ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ء میں جنگ بلقان کے زمانے میں انھوں نے ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنے میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا، مولانا عثمانیؒ سالہا سال تک جمعیۃ علماء ہند کی مجلسِ عاملہ کے رکن رہے، جمعیۃ علماء ہند کے صفِ اول کے رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا، آخر میں ان کو متحدہ قومیت کے مسئلے پر جمعیۃ علماء ہند سے اختلاف پیش آیا، اور وہ مسلم لیگ میں شامل ہوگئے، اور سنہ ۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۶ء میں جمعیۃ علمائے اسلام کے صدر منتخب کئے گئے، تقسیم ہند سے قبل رمضان سنہ ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء میں مولانا عثمانی پاکستان تشریف لے گئے اور آخر تک کراچی میں قیام رہا، پاکستان دستور ساز اسمبلی کے رکن اور شرعی دستور ساز کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے، پاکستان میں انھوں نے بہت سی دینی اور ملّی خدمات انجام دیں، پاکستان کے اقتدارِ اعلیٰ پر اُن کی علمی اور سیاسی خدمات کا خاص اثر تھا، خصوصاً اُن کو عالمانہ اور مفکرانہ حیثیت سے خاص عظمت حاصل تھی، اور اُن کی دینی رہ نمائی کے ساتھ ساتھ سیاسی رہ نمائی بھی

مسلّم سمجھی جاتی تھی۔

پاکستان میں جامعۂ عباسیہ بھاول پور ایک قدیم دینی تعلیم گاہ ہے، اس کا انتظامی اور تعلیمی نظام بہت خراب ہوگیا تھا، ریاست بھاول پور کی وزارتِ تعلیم نے مولانا عثمانیؒ سے درخواست کی وہ بھاول پور تشریف لاکر جامعہ عباسیہ کی اصلاح و ترقی کے لئے اپنے مشورے سے ریاست کو نوازیں، چنانچہ آپ بھاول پور تشریف لے گئے، وزارتِ تعلیم سے ابھی گفتگو شروع ہی ہوئی تھی کہ اچانک ۱۳۶۹ھ / ۱۹۴۹ء کو چند گھنٹے کی مختصر علالت کے بعد داعیٔ اجل کو لبّیک کہا، جنازہ بھاول پور سے کراچی لے جایا گیا، اور قیام گاہ واقع محمد علی روڈ کے قریب آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔

مولانا انوار الحسن صاحب شیر کوٹی ثم پاکستانی نے "تجلّیاتِ عثمانی" کے نام سے مولانا عثمانیؒ کی ایک مبسوط سوانح حیات لکھی ہے۔

ماخذ

جن کتابوں سے تاریخ دیوبند ماخوذ ہے

۱۔ آثار رحمت ، از امداد صابری ، مطبوعہ یونین پریس دہلی

۲۔ ارشاد شرح قصیدہ بانت سُعاد ، مصنفہ کعب بن زہیر ۔ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی سنہ ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴ء

۳۔ ارشاد الساری شرح صحیح بخاری ، علامہ قسطلانی ، مطبوعہ استنبول سنہ ۱۲۶۷ھ

۴۔ ارواح ثلاثہ ، مجموعہ حکایات امیر شاہ خاں ، مطبوعہ آزاد پریس دیوبند سنہ ۱۳۷۰ھ

۵۔ اساتذ العلماء ، مصنفہ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی ، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ

۶۔ اشرف السوانح ، مؤلفہ خواجہ عزیز الحسن ، مطبوعہ جمال پریس دہلی سنہ ۱۳۵۴ھ

۷۔ اقتباس الانوار ، مصنفہ محمد اکرم ، مطبوعہ مطبع اسلامیہ لاہور

۸۔ اکمل التواریخ ، مؤلفہ مولوی محمد یعقوب ضیاء القادری ، مطبوعہ بدایوں سنہ ۱۹۱۵ء

۹۔ امپیریل گزیٹر آف انڈیا ، مطبوعہ گورنمنٹ پریس سنہ ۱۹۰۸ء

۱۰۔ انوار القلوب ، مصنفہ شاہزادہ مرزا محمد منعم بن شاہ عالم ثانی ۔
مخطوطہ کتب خانہ سید محبوب رضوی ، مکتوبہ سنہ ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء

۱۱۔ الہدیۃ السنیۃ فی ذکر مدرسۃ العربیہ ، مصنفہ مولانا ذوالفقار علی
مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی سنہ ۱۳۰۷ھ

۱۲۔ آئین اکبری ، مصنفہ شیخ ابوالفضل مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۸۹۳ء

۱۳۔ آئین اکبری ترجمہ اردو ، مطبوعہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سنہ ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء

۱۴۔ الیانع الجنی فی اسانید شیخ عبدالغنی ، مطبع صدیقی سنہ ۱۲۸۷ھ